

# حیاتِ امداد

حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکہ رحمۃ اللہ علیہ کے تاریخی علمی، ادبی، روحانی اور مجاہدانہ حالات کا دلچسپ اور معلومات افزا مرقع اور ان کی تصنیفات اور وفارسی انشا نگاری اور فنِ سخن پر فکا رانہ تبصرے اور فنی طور پر حافظ محمد ضامن صاحب شہید اور مولانا شیخ محمد محدث تھانوی کا تذکرہ نیز دارالعلوم دیوبند کی ہمگیر خدمات پر مفصل مقدمہ پیش خدمت ہے۔



تحریر  
مولانا محمد انوار الحسن صاحب اشیر کوٹی رحمۃ اللہ علیہ  
پروفیسر اسلامیہ کالج لائل پور

مکتبہ دارالعلوم کراچی



باہتمام : شرافت علی

طبع : صفر المظفر ۱۴۴۲ھ مطابق اکتوبر ۲۰۲۰ء

ملنے کے پتے

✽ ادارۃ المعارف، احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی

✽ مکتبہ معارف القرآن، احاطہ دارالعلوم کراچی

✽ ادارہ اسلامیات، ۱۹۰ انارکلی لاہور

✽ ادارہ اسلامیات، اردو بازار کراچی

✽ دارالاشاعت، اردو بازار کراچی

✽ بیت المعارف، بنوری ٹاؤن

مکتبہ دارالعلوم کراچی

(احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی)

فون نمبر : 021-35042280

استقبالیہ : 021-35049774-6

ای میل :

mdukhi@gmail.com

## فہرست مضامین حیاتِ امداد

صفحہ	عنوان
۱۳	مدعائے ضروری الاظہار
۱۹	حرف آغاز دارالعلوم دیوبند اور تعارف کتاب
۲۰	دارالعلوم دیوبند علامہ رشید رضا کی نظر میں
۲۲	دارالعلوم شیخ الاسلام فلپائن کی نظر میں
۲۳	شاہ افغانستان اور دارالعلوم
۲۴	مولانا ابوالکلام آزاد - وزیر تعلیم ہند کی نظر میں
۲۵	پروفیسر گریونٹ اور دارالعلوم
۲۵	امریکی وفد کی نظر میں
۲۵	ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر ہند کی رائے
۲۷	دارالعلوم اکبر الہ آبادی کی نگاہ میں
۲۷	تجزیہ خیالات
۲۹	بانی دارالعلوم
۳۰	درخشندہ چہرے
۳۰	حاجی امداد اللہ صاحب
۳۰	مولانا محمد قاسم صاحب
۳۱	مولانا رشید احمد صاحب

## معاون

- ۳۱ ..... شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب
- ۳۱ ..... مولانا اشرف علی صاحب
- ۳۲ ..... مولانا سید انور شاہ صاحب
- ۳۲ ..... مولانا حسین احمد صاحب
- ۳۲ ..... مولانا عبید اللہ صاحب
- ۳۳ ..... مولانا شبیر احمد صاحب
- ۳۳ ..... دارالعلوم نے نیا دیا
- ۳۵ ..... علم
- ۳۶ ..... تصنیفات
- ۳۹ ..... ندوۃ المصنفین
- ۳۹ ..... عمل
- ۴۰ ..... احسان، اخلاص اور تقویٰ
- ۴۲ ..... تکمیل شریعت
- ۴۳ ..... سیاسیات ملکی اور آزادی ہند میں علمائے دیوبند کا حصہ
- ۴۴ ..... ریشمی رومال کی تحریک اور مولانا محمود حسن صاحب
- ۴۴ ..... مسلم لیگ اور کانگریس
- ۴۶ ..... نظریہ پاکستان اور علمائے دیوبند
- ۴۸ ..... حضرت تھانوی اور پاکستان کی پیشینگوئی
- ۴۹ ..... آغاز تبلیغ بقدا عظم
- ۴۹ ..... پہلی تبلیغی ملاقات
- ۵۰ ..... دوسری تبلیغی ملاقات
- ۵۰ ..... تیسری تبلیغی ملاقات



- ۵۱ ..... قائد اعظم کا حضرت تھانوی پر اعتماد
- ۵۱ ..... خط و کتابت
- ۵۲ ..... حکیم الامت کا ایک خط بنام قائد اعظم
- ۵۲ ..... جواب قائد اعظم
- ۵۳ ..... قائد اعظم کی حکیم الامت سے عقیدت
- ۵۳ ..... شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی اور مسلم لیگ
- ۵۴ ..... شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب اور کانگریس
- ۵۵ ..... مفکر اسلام مولانا عبید اللہ سندھی
- ۵۶ ..... علمائے دیوبند کا اعتقاد دیوبند
- ۵۸ ..... حضرت مہر علی شاہ صاحب کے مفتی مولانا غلام محمد صاحب کی رائے
- ۵۹ ..... دیوبند میں چار نوری وجود میاں شیر محمد صاحب شریقیوری
- ۵۹ ..... علمائے دیوبند کا رنگ اعتدال
- ۶۰ ..... گلابی وہابیت
- ۶۱ ..... علمائے دیوبند کے عقائد
- ۶۲ ..... کثرت درود عین ثواب ہے
- ۶۲ ..... ختم نبوت اور مولانا محمد قاسم صاحب
- ۶۳ ..... مولانا محمد قاسم صاحب کی نظر میں ختم نبوت کا مخالف کافر ہے
- ۶۳ ..... اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا کلام جملہ عیوب سے پاک ہے
- ۶۳ ..... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف بڑے بھائی کی طرح فضیلت دینا کفر ہے
- ۶۴ ..... میاں دشریف اور علمائے دیوبند
- ۶۴ ..... علم غیب اور علمائے دیوبند
- ۶۵ ..... رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت ایمان ہے

صفحہ	عنوان
۶۶	یا رسول اللہ اور یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہنا جائز ہے
۶۶	اللہ تعالیٰ کے سوا اور کئی سے امداد مانگنا
۶۷	اسلام ایک ٹھوس اور متعین مذہب ہے
۶۷	تکفیر سے تابعدار علمائے دیوبند کی احتیاط اور اسلامی فرقوں سے رواداری
۷۰	علمائے دیوبند کے متعلق مولانا ابوالحسنات مکتب بریلی کی رائے
۷۱	مولانا محمد قاسم صاحب پیرسید میر علی شاہ کی نظر میں
۷۲	مولانا اشرف علی صاحب مجدد تھے
۷۲	علمائے دیوبند اور ادبی خدمات
۷۲	عربی زبان کی خدمات
۷۳	فارسی زبان کی خدمات
۷۳	اردو زبان اور علمائے دیوبند
۷۴	دور اول۔ دور دوم
۷۵	دور سوم
۷۸	دور چہارم و پنجم
۸۰	وجہ تصنیف مشاہیر دیوبند
۸۱	آغاز تصنیف
۸۳	حیات امداد
۸۴	نذر عقیدت
۸۶	حمد
۸۷	نعت
۸۸	حاجی صاحب کا نام، لقب اور تاریخی اسم
۸۹	پیدائش، وطن اور نسب نامہ

۹۰	..... بھائی بہن۔ والدہ کی وفات
۹۰	..... تعلیم
۹۱	..... مولانا محمد قاسم صاحبؒ حاجی صاحب کی زبان تھے
۹۲	..... حاجی صاحب کے ظاہری علمی مقامات کی مثالیں
۹۳	..... علم الیقین۔ عین الیقین اور حق الیقین
۹۳	..... دو حدیثوں کی مطابقت
۹۳	..... فیضان کی قسمیں۔ حالی۔ قوی۔ فعلی
۹۵	..... خدا کا دنیا میں دیکھنا
۹۶	..... مولانا نصیر الدین سے بیعت
۹۶	..... میانجی نور محمد جھنجھانوی سے بیعت
۹۷	..... حاجی صاحب کا روحانی مقام
۹۷	..... اتباع شریعت و کرامت
۹۹	..... شاملی ضلع مظفر نگر میں جنگ آزادی اور حاجی صاحب اور ان کے رفقاء کا جہاد
۱۰۶	..... ذکر خیر حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ
۱۰۸	..... حافظ صاحب کا سراپا
۱۰۸	..... عادات و اخلاق
۱۰۹	..... تعلیم و تربیت
۱۰۹	..... حالات بیعت
۱۱۰	..... حصول سلوک میں حافظ صاحب کا مقام
۱۱۱	..... مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ کا حافظ صاحب سے کسب روحانیت
۱۱۲	..... اتباع شریعت اور زہد و تقویٰ
۱۱۳	..... شہادت اور کشف شہادت



## عنوان

صفحہ

۱۱۴	شہادت سے پہلے
۱۱۴	شہادت کا دولہا
۱۱۵	مولانا رشید احمد صاحب کے زانو پر
۱۱۵	سن پیدائش اور عمر بوقت شہادت
۱۱۶	تاریخ شہادت
۱۱۸	جہاد سے پہلے
۱۱۹	جہاد کے بعد مسجد پیر محمد تھانہ بھون اور حافظ صاحب کے گھر کی حالت
۱۱۹	حافظ صاحب کی جدائی میں حکیم ضیاء الدین کی بیقراری
۱۲۱	مسجد پیر والی تھانہ بھون کا منظر حکیم محمد عمر چر تھانوی کے الفاظ میں
۱۲۳	مفتی الہی بخش صاحب
۱۲۶	پھر حاجی امداد اللہ صاحب کی طرف
۱۲۶	حاجی صاحب کا پہلا حج
۱۲۷	جنگ آزادی کے بعد
۱۲۸	مکہ معظمہ میں غربت کی زندگی
۱۲۹	سلطان بابو کا واقعہ
۱۳۰	حاجی صاحب کے ساتھ بھی قدرت کا خصوصی معاملہ
۱۳۰	ہجرت سے پہلے مالی حالت
۱۳۰	مکہ معظمہ میں قیام
۱۳۱	شہرت و ولایت
۱۳۱	نکاح اول، دوسرا نکاح اور تیسرا
۱۳۲	اخلاق و عادات اور حاجی صاحب کا سراپا
۱۳۳	معاصرین، خلفاء اور مریدین



۱۳۴	..... حاجی صاحب کا کتب خانہ
۱۳۵	..... حاجی صاحب کا ورثہ مکہ معظمہ میں
۱۳۶	..... حاجی صاحب کا ترکہ اور تبرکات
۱۳۶	..... وفات

## باب دوم

۱۳۹	..... علمیات اور حاجی صاحبؒ کی تصنیفات
۱۴۰	..... مثنوی مولانا رومیؒ
۱۴۱	..... مثنوی کی تالیف کا سبب
۱۴۲	..... حاجی صاحب کا مثنوی پر حاشیہ
۱۴۴	..... حاجی صاحب کا درس مثنوی
۱۴۵	..... مثنوی کا کشفی درس
۱۴۷	..... تفصیلات حاشیہ پر مزید تحقیقی نظر
۱۵۱	..... حاجی صاحبؒ کا خط مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے نام
۱۵۲	..... تحشیہ مثنوی اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ
۱۵۴	..... مثنوی کی تکمیل اور مفتی الہی بخش کا دھنوی کا کارنامہ
۱۶۰	..... مولانا احمد حسن کانپوری اور طباعت مثنوی
۱۶۳	..... مثنوی کی طباعت کے منتظمین
۱۶۵	..... اصل حاشیہ پر تحقیقی نظر
۱۷۶	..... حاجی صاحب کے بعض حواشی اور مطالب مثنوی
۱۸۰	..... دفتر، مفت مثنوی از مولانا شیخ محمدؒ
۱۸۱	..... ذکر جمیل مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ
۱۸۱	..... تاریخ پیدائش اور نام و نسب، والد کا نام اور وطن

نمبر	عنوان
۱۸۲	تعلیم
۱۸۲	قیام وطن تھانہ بھون اور گھر کی مالی حالت
۱۸۲	منزل فقر و سلوک
۱۸۳	سفر حج اور واپسی
۱۸۴	نکاح۔ اولاد۔ میرٹھ اور نوٹک کا قیام
۱۸۵	اخلاق و عادات
۱۸۶	خلفاء اور مریدین
۱۸۷	تصنیفات
۱۸۸	وفات
۱۹۰	مولانا شیخ محمد کی مثنوی پر ایک سرسری نظر
۱۹۲	افتتاح مثنوی
۱۹۶	پھر حاجی صاحب کی تصنیفات کی طرف
۱۹۶	۲..... غذائے روح
۱۹۷	۳..... جہاد اکبر
۱۹۹	۴..... مثنوی تحفۃ العشاق
۲۰۵	۵..... درد نامہ غمناک
۲۰۶	۶..... ارشاد مرشد
۲۰۷	۷..... ضیاء القلوب
۲۰۸	۸..... وحدۃ الوجود
۲۰۹	۹..... فیصلہ ہفت مسئلہ
۲۱۳	۱۰..... گلزارِ معرفت
۲۱۴	۱۱..... مرقوماتِ امدادیہ



۲۱۴	..... مکتوبات امدادیہ
۲۱۵	..... حاجی صاحب کی شاعری اور اردو فارسی شتر و نظم
۲۱۵	..... تخلص، سلسلہ تلمذ
۲۱۶	..... شاعری کے لئے داخلی یا خارجی جذبہ کی ضرورت
۲۱۶	..... شعرو سخن سے دلچسپی
۲۱۸	..... حاجی صاحب کے کلام کا ذخیرہ
۲۱۸	..... تفصیل کلام
۲۲۰	..... اردو اشعار کا کل مجموعہ
۲۲۰	..... فارسی کلام
۲۲۱	..... کل اردو اور فارسی اشعار
۲۲۱	..... اصناف کلام
۲۲۲	..... درد نامہ، غمناک پر ایک نظر
۲۲۶	..... جہاد اکبر پر تبصرہ
۲۲۸	..... غذائے روح ایک نظر میں
۲۳۰	..... فارسی شعروں کا اردو اشعار میں ترجمہ
۲۳۱	..... مثنوی تحفۃ العشاق پر ایک نظر
۲۳۱	..... فراق ضامن شہید
۲۳۳	..... حضرت تحفہ کا سراپا
۲۳۵	..... رباعی
۲۳۶	..... مثلث و خمس و تضمین
۲۳۷	..... نعت و حمد و مناجات
۲۳۷	..... تاریخی مادے



صفحہ

نمبر

۲۳۸	..... غزل
۲۳۹	..... متقابل اور متضاد الخیالی
۲۴۰	..... حمدیہ غزل
۲۴۰	..... ایک اور اردو غزل
۲۴۲	..... اردو نثر
۲۴۲	..... خط نویسی
۲۴۳	..... مراتب قبح کا طریقہ
۲۴۵	..... فارسی ادب
۲۴۷	..... فارسی خط بنام مولانا قاسم صاحب و مولانا محمد یعقوب صاحب
۲۵۸	..... وحدت الوجود کی حقیقت
۲۶۲	..... وحدت الوجود کی فارسی زبان
۲۶۲	..... طریقہ حصول زیارت سرکار مدینہ علیہ الصلوٰۃ والسلام
۲۶۳	..... طریق تلاوت قرآن کریم
۲۶۹	..... نماز کا دوسرا طریقہ
۲۷۰	..... فارسی زبان پر تنقید
۲۷۱	..... فارسی شاعری
۲۷۸	..... خاتمہ





وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد والہ و أصحابہ اجمعین

## مدعائے ضروری الاظہار

آئندہ اوراق میں حرف آغاز کے ماتحت دارالعلوم دیوبند اور پیش نظر کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے اور انہی صفحات سے دراصل ہماری اس کتاب کا آغاز ہو رہا ہے، اس لئے ان سطور کی حرف آغاز سے پہلے ضرورت نہ تھی لیکن صورت حال کچھ ایسی آپڑی ہے کہ حرف آغاز سے پہلے بھی ”مدعائے ضروری الاظہار“ کے عنوان کے ماتحت ہمیں کچھ عرض کرنا پڑ گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے دراصل ”مشاہیر دیوبند“ کے نام سے پہلی جلد لکھی تھی جس میں چھ حضرات یعنی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمن صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین کا تذکرہ لکھا تھا اور سب کو مشاہیر دیوبند جلد اول کے نام کے ساتھ یک جا طبع کرانا تھا۔ یعنی ہر دور کے اکابر کے حالات کی ایک ایک علیحدہ جلد لکھ کر شائع کرنے کا خیال تھا۔ اسی خیال کے پیش نظر مذکورہ بالا چھ حضرات کے حالات جو دور اول سے تعلق رکھتے ہیں ہم نے لکھ لئے تھے۔ کتاب کی طباعت کا ذمہ ایک صاحب نے جن کو حاجی محمد شفیع کہتے ہیں اور وہ لاہور میں غالباً صرافے کا کام کرتے ہیں لے لیا تھا

اور یہی طے شدہ بات تھی کہ وہ اس کی طباعت کے تمام اخراجات برداشت کریں گے لیکن جب کتاب کی طباعت کے متعلق ان سے کہا گیا تو پھر نہ معلوم کن حالات سے متاثر ہو کر انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا، اسی لئے پیش نظر کتاب حیاتِ امداد کے حرفِ آغاز کے آخر میں حاجی محمد شفیع کا شکریہ ہم ادا کر چکے تھے اور وہ آپ کے سامنے سے گذرے گا بھی، اب ان کی بجائے ہم حضرت علامہ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی طباعت کی طرف توجہ فرمائی، لیکن مناسب یہ سمجھا گیا کہ اتنی ضخیم کتاب کو یکجا چھپوانے کی بجائے مذکورہ بالا حضرات کے حالات سے متعلق ہر ایک بزرگ کے سوانح علمی و عملی کو علیحدہ علیحدہ ایک ایک حصے میں طبع کرایا جائے، ایسا کرنے سے ایک تو قارئین کو پڑھنے میں سہولت ہوگی اور خریداروں کو بھی خریدنے میں آسانی ہوگی اور طباعت بھی دشوار نہ ہوگی، اس لئے اب اس کتاب کی نوعیت یہ ہوگی کہ ”سلسلہ مشاہیر دیوبند“ کے ماتحت ہر ایک بزرگ کے نام سے اس حصے کو موسوم کر دیا گیا ہے جن کے حالات اس میں درج ہیں۔ چونکہ سب سے اوّل میں حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں اس لئے پیش نظر کتاب کا نام ”حیاتِ امداد“ رکھ دیا گیا ہے۔ اب آئندہ آنے والوں کے حالات پر طبع ہونے والی کتابوں کا حصوں کے نمبر ایک، دو، تین سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ جلدوں ہی کا سلسلہ ہوگا، بلکہ ہر شخصیت کے سوانح مستقل طور پر علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوتے رہیں گے۔ جن کا ایک دوسرے سے مضامین کا کوئی تعلق نہ ہوگا لہذا اس کتاب کے حرفِ آغاز میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ”مدعائے ضروری الاطہار“ کو آخری بات سمجھئے۔ حیاتِ امداد کے اوّل میں جو حرفِ آغاز کے ماتحت دارالعلوم دیوبند کا تعارف ہے تو وہ بھی دراصل مجموعہ کتاب کا مقدمہ تھا لیکن اب وہ صرف حیاتِ امداد کا مقدمہ بن کر رہ گیا ہے مگر آپ اس کو دور اوّل کے تمام حضرات سے متعلق سمجھئے۔

بہر حال حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی اور عملی روحانی اور فقہی، ادبی نثری اور شعری حالات پر مشتمل یہ کتاب ”حیاتِ امداد“ کے نام سے پیش خدمت ہے۔ ان کے بعد ہماری پہلی ترتیب کے مطابق حضرت حاجی صاحب کے بعد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گٹنوی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح زندگی کو پیش کرنا تھا لیکن اب یہ ترتیب بھی پیش نظر نہ ہوگی، بلکہ اس کتاب کے بعد ہم ”یادگارِ قاسم“ کے نام سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند پر کتاب شائع کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

**یادگارِ قاسم**

اپنی نوعیت کی یہ کتاب ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کی جائے گی جس کا فیصلہ قارئین ہی کر سکیں گے۔ اور جس طرح ہم نے ”حیاتِ امداد“ میں حضرت حاجی صاحب کے ضمن میں حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شیخ محمد محدث رحمۃ اللہ علیہ کا مفصل ذکر کیا ہے اسی طرح یادگارِ قاسم میں حضرت مولانا محمد مظہر صاحب مولانا محمد احسن صاحب مولانا محمد منیر صاحب، حضرت مولانا مملوک علی صاحب، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب، حضرت شاہ عبدالغنی صاحب، حضرت مولانا احمد علی صاحب اور حاجی عابد حسین صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین کے حالات بھی درج کئے ہیں۔ یادگارِ قاسم کی کتابت ہو رہی ہے۔ اور ہماری کوشش ہے کہ اس کو بھی جلد طبع کرا کر ہدیہ قارئین کیا جائے گا۔ خدا کرے کہ اس کے مطالعے کا وقت بھی جلد آجائے۔

**تصحیح ”حیاتِ امداد“**

حیاتِ امداد کے مطالعہ کرنے سے پہلے ازراہِ کرم ان اغلاط کو کتاب میں صحیح فرمالیجئے جن کی فہرست ہم نے ابتدا میں دیدی ہے صرف فہرست اغلاط اور صحت نامے کے پڑھنے پر اکتفا نہ کیجئے، بلکہ کتاب کے صفحات میں جہاں جہاں غلطیاں رہ گئی ہیں ان کو قلم سے درست کر لیجئے تاکہ پڑھتے وقت بد مزگی نہ ہو۔

میں حیران ہوں کہ اس قدر اغلاط کہاں سے نکل آئیں، حالانکہ میں نے کاپیاں بڑے غور سے پڑھ کر غلطیوں کی اصلاح کے نشانات لگانے میں بڑی جانفشانی کی تھی۔ اب کاتب صاحب کی ستم نظریں پر صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ پھر کتاب ایسی جلدی میں چھپی کہ پروف پڑھنے کا بھی مجھے موقع نہیں ملا اور نہ پلیٹوں پر ہی غلطیاں ٹھیک کر دی جاتی۔ بات یہ تھی کہ کتاب کراچی میں چھپ رہی تھی اور میں لائل پور میں بیٹھا تھا۔ محترم علامہ محمد یوسف صاحب کی شخصیت سخت مصروف رہی اس لئے موصوف پروف بھیجنے کا اہتمام نہ کر سکے۔ بالآخر کتاب کے ساتھ صحت نامہ لگانا پڑا۔ امید ہے کہ آپ ہماری ان گزارشات پر توجہ فرما کر پیش نظر کتاب کا مطالعہ فرمائیں گے۔ اور ہماری تاریخی، علمی، ادبی اور لسانی غلطیوں سے ہمیں آگاہ فرما کر ممنون فرمائیں گے تاکہ آئندہ کسی ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو سکے۔

شکریہ

مصطفیٰ



## حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں

پیچ و خم کھاتی ہوئی راہوں کو چمکاتا رہا مہر عالم تاب رنگ و نور برساتا رہا  
 قرن اول کے صحابہ کی ادائے خاص میں داستانِ سید الزہراء دُہراتا رہا  
 عہدِ استبداد کی تیغِ ستم کا بانگین اس کی شمشیر نگہ کے ڈر سے تھراتا رہا  
 بوذر و سُلیمان کے اوصاف کا مظہر تھا وہ  
 اس صدی میں غیرتِ اسلام کا پیکر تھا وہ  
 (شورشِ کشمیری)





نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

## حرفِ آغاز

### دارالعلوم دیوبند اور تعارفِ کتاب

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد جن رحمت بھرے ہاتھوں نے رکھی، ان کی روحانی عظمت کا خود یہ شاہکار واضح نشان ہے۔ ان کے خلوص نے بارگاہِ بے نیاز میں جو رنگ قبول پایا اسی کے نتیجے میں آج یہ اسلامی یونیورسٹی نہ صرف ہندو پاکستان میں مشہور ہے، بلکہ اس کے فیض کے چشمے تمام دنیائے اسلام میں بہ نکلے۔ یوں تو آپ کو مصر میں جامع ازہر جیسا مرکز علم دیکھنے میں آسکتا ہے جس کو اسلامی سلطنت کی سرپرستی ہمیشہ سے حاصل رہی ہے لیکن روحانیت اور علمیت کا بہترین امتزاج جو آپ کو سرزمینِ دیوبند کے اس دارالعلوم میں ملے گا وہ دنیا کے کسی علمی ادارے میں ڈھونڈنے سے بھی آپ نہ پاسکیں گے۔ جب ہم اس گہوارہٴ علم و فن کے متعلق یہ الفاظ لکھ رہے ہیں تو ہم آپ کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم یہ لکھ کر کوئی شاعری نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جو ہمارے قلم سے تراش کر رہی ہے۔ اپنے اس بیان کی تائید میں ہم ان ہزاروں دارالعلوم کی زیارت کرنے والوں میں سے چند عظیم المرتبہ شخصیتوں کے جذبات و خیالات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو انہوں نے اس مرکزِ علوم و فنون کے متعلق ظاہر فرمائے ہیں۔

## دارالعلوم دیوبند علما مد رشید رضا مصری کی نظر میں

علما مد رشید رضا مصر کے مشہور فاضل جن کو مفتی محمد عبدہ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے جب ندوۃ العنماء لکھنؤ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے تو موصوف اسلامیہ کالج لاہور، مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور دیکھتے ہوئے ندوۃ العنماء لکھنؤ پہنچے۔ بعد ازاں علیگزہ کالج اور پھر ۱۵/۱۱/۱۹۱۲ء کو صبح سات بجے حکیم اجمل خاں صاحب اور مولانا سید عبدالحق صاحب بغدادی اسٹنٹ پروفیسر عربی علیگزہ کالج کے شوق دلانے پر مولوی رشید احمد صاحب انصاری اور پروفیسر صاحب بغدادی کے ہمراہ دارالعلوم دیوبند پہنچے۔ آپ کا علمائے دیوبند نے زبردست استقبال کیا، آپ کو عربی میں ایڈریس پیش کیا گیا، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے دارالعلوم اور اُس کے مسلک اور فقہ حنفی پر عربی میں زبردست تقریر کی۔ بعد ازاں علما مد رشید رضا نے عربی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

لولم أرہا لرجعت من الہند حزینا۔

اگر میں دارالعلوم دیوبند کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے غمگین واپس لوٹتا۔

(رسالہ القاسم دیوبند جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ مطابق مئی ۱۹۱۲ء ص ۴)

علامہ رضا بارہ گھنٹے دیوبند رہے اور شام کو سیدھے بمبئی روانہ ہو گئے۔ مصر پہنچنے کے بعد انہوں نے ماہ شعبان ۱۳۳۰ھ کے اپنے المنار رسالے میں ہندوستان کے سفر کی جو مختصری روئید لکھی ہے اس میں مسلمانان ہند کی علمی حالت پر روشنی ڈالنے کے بعد لکھتے ہیں:

عننی رأیت فی مدرسة (دیوبند) التی تلقب بازہر الہند  
نہضة دینیة علمیة جدیدة أرجو أن یکون لہا نفع عظیم۔

(منار شعبان ۱۳۳۰ھ)

اس کے علاوہ یہ کہ میں نے مدرسہ دیوبند میں جس کو از ہر ہند کا خطاب دیا جاتا ہے ایک جدید علمی تحریک دیکھی جس سے نفع عظیم کی مجھے امید ہے۔

اسی مضمون میں آگے چل کر موصوف تحریر فرماتے ہیں:

ماقرت عینی فی الہند کما قرت برویۃ مدرسۃ دیوبند  
ولاسرۃ بشیٰ، ہناک کسرور ہا بما لا ح لہا من الغیرۃ  
والاخلاص فی علماء ہذہ المدرسۃ۔ (منار شعبان ۱۳۳۰ھ)  
ہندوستان ہجر میں میری آنکھ کو ایسی ٹھنڈک کہیں نصیب نہیں ہوئی جیسی  
دارالعلوم دیوبند میں حاصل ہوئی تھی اور نہ اتنی خوشی کہیں حاصل ہوئی جتنی وہاں  
ہوئی۔ اور یہ صرف اس غیرت و اخلاص کی وجہ سے تھی جو میں نے اس مدرسے  
کے علماء میں دیکھی۔

ان خیالات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک مصری علامہ ہندوستان کے تمام علمی  
اداروں سے زیادہ دارالعلوم دیوبند کو فوقیت دیتے نظر آتے ہیں، بلکہ صاف یہ فرما رہے ہیں  
کہ اگر میں دیوبند نہ دیکھتا تو مجھے ہندوستان سے افسوس کے ساتھ لوٹنا پڑتا، گویا دارالعلوم  
دیوبند نے ہندوستان کی لاج رکھ لی، حالانکہ بعض اہل ہندو دنیا داروں نے یا بالفاظ دیگر  
انگریزی تعلیم یافتہ طبقے نے دارالعلوم کے علماء کو تشدد کہا لیکن علامہ رشید اسی عبارت میں  
لکھتے ہیں:

وکان کثیر من إخوانی المسلمین فی بلاد الہند المختلفۃ  
یذکرون لی ہذہ المدرسۃ ویصف رجال الدنیا منهم  
علماء ہا بالجمود والتعصب ویظہرون رغبتہم فی  
اصلاح تعمیم نفعہا وقد رأیتہم وللہ الحمد فوق جمیع  
ما سمعت عنہم من ثناء وانتقاد۔ (منار شعبان ۱۳۳۰ھ)

میرے سامنے مختلف شہروں میں بہت سے مسلمان بھائیوں نے اس مدرسے کا  
بھلائی کے ساتھ ذکر کیا اور بہت سے دنیا دار لوگوں نے علمائے مدرسے کے متعلق  
جامد و متعصب ہونے کا خیال ظاہر کر کے اپنی رغبت اس کی اصلاح اور تعلیم نفع

کی طرف ظاہر کی لیکن خدا شکر ہے کہ میں نے ان علماء کو مدح کرنے والوں کی مدح اور نکتہ چینوں کی نکتہ چینوں سے بہت بلند پایا۔

علاؤ مدہ کی مذکورہ عبارت سے واضح ہے کہ عنائے دیوبند پر دین میں سخت گیر اور جمود فکر کا الزام غلط ہے۔ اور انہوں نے دارالعلوم اور اس کے علماء کو اس الزام سے بلند پایا جو دنیا داروں یعنی انگریزی تعلیم یافتہ طبقے نے لگایا تھا۔

### دارالعلوم شیخ الاسلام فلیپائن سید محمد وجیہ کی نظر میں

شیخ الاسلام سید محمد وجیہ مرحوم ملک شام کے تاریخی شہر نابلس کے رہنے والے تھے۔ فلیپائن کے حاکم اور وہاں کے مسلمان باشندوں کی درخواست پر جو وفد کی صورت میں قسطنطنیہ پہنچے تھے اور انہوں نے ملک امریکہ کے اس شہر کے دس لاکھ باشندوں کی رہنمائی کے لئے کسی عالم کی تجویز کی درخواست کی تھی، قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام نے سید محمد وجیہ صاحب کو فلیپائن کا شیخ الاسلام مقرر کر دیا تھا، موصوف شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی نسل سے تھے اور خلافت ترکیہ کی طرف سے ایڈریانوپل کے عہدہ قضا پر بھی رہ چکے تھے آپ جب اپنے وطن سے رخصت ہو کر فلیپائن کے لئے روانہ ہوئے تو پہلے زیارت حرمین سے فارغ ہو کر ہندوستان تشریف فرما ہوئے۔ ہندوستان کے مشہور شہروں اور یہاں کی درسگاہوں کا معائنہ کرتے ہوئے دہلی علیگڑھ اور وہاں سے ۱۶ دسمبر ۱۹۱۳ء کو گیارہ بجے صبح دیوبند پہنچے، دیوبند میں داخل ہوئے تو فرمایا:

اَرَىٰ نُورًا

میں یہاں نور دیکھتا ہوں۔

اور پھر طلباء، علماء اور مدر سے کو دیکھ کر فرمایا:

وَجَدْتُ ضَلَاتِي الْمُنشُودَةَ (القاسمی الحجازی ص ۲)

میں نے اپنی گم شدہ چیز کو جس کی میں تلاش میں تھا پایا۔



بعد پہنچے تو دارالعلوم دیوبند کو دیکھ کر جو تاثر انہوں نے لیا اس کا ترجمہ اردو میں حسب ذیل ہے:

”میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ یہ دارالعلوم، افغانستان میں اور خاص طور سے وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت معروف و مشہور ہے۔ افغانستان کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور یہاں کے اساتذہ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں، اور علم و روحانیت کے یقین میں جو فضیلت اور مرتبت انہیں حاصل ہے اس کے ہمیشہ قائل و مداح رہے ہیں۔ بہت سے افغان علماء اس دارالعلوم سے فیضیاب ہوئے۔ اور انہوں نے اپنے وطن عزیز واپس جا کر وہاں علم کی روشنی پھیلانی اور ملک کی خدمات انجام دیں۔ (آئینہ دارالعلوم)

مولانا ابوالکلام آزاد، وزیر تعلیم ہند کی نظر میں

مولانا ابوالکلام مرحوم اپنے عہد وزارت تعلیم میں دارالعلوم آئے تو انہوں نے فرمایا: ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کے اس عظیم ترین ادارے میں نہ صرف یہ کہ اس ملک کے تمام حصوں سے بلکہ بعید ترین علاقوں مثلاً انڈونیشیا، ملایا، افغانستان اوسط ایشیا اور چین سے طلباء کھینچے چلے آتے ہیں اتنے وسیع رقبے کے طلبہ اور علماء میں اس کی مقبولیت اس کی عظمت و شہرت کی دلیل ہے، اس بنا پر یہ ادارہ صحیح معنی میں تعلیمات اسلامی کی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی ہے۔ (آئینہ دارالعلوم)

نرکی کے نیاز برکیز نے دارالعلوم دیوبند کو دیکھ کر فرمایا:

”لابریری اور اس کے بیش قیمت قیمتی کتب کے ذخیرے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ میں نے یہاں اتنا خصوص پایا کہ اپنی ممنونیت کے اظہار کے لئے پوری طرح الفاظ نہیں پاتا۔“ (آئینہ دارالعلوم)

آپ نے مدرسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

ہنی رأیت فی هذه المدرسة أنواراً فوق نور فی درر تاج  
المنوك وإنها بنيت عنی انتقوی والتعلیم فیها تعیم أهل  
السنة والجماعة۔ انخ

میں نے اس مدرسے میں ایسے انوار پائے ہیں جو بادشاہوں کے تاج میں  
موتیوں سے بھی زیادہ روشن ہیں اس مدرسے کی بنیاد تقویٰ پر ہے اور اس میں  
اہل سنت والجماعت کے طریقے پر تعلیم دی جاتی ہے۔

علاً مشیر احمد عثمانی جن دنوں دارالعلوم کے صدر مہتمم یاد اؤس چانسلر تھے، مصر سے جامعہ  
ازہر کے علماء کا ایک وفد دارالعلوم دیوبند آیا۔ وفد کے لیڈر اور رئیس ابراہیم جہالی نے اپنی  
رائے میں ظاہر کیا:

فقد سعدنا بزيارة جامعة دارالعلوم الديوبندية وطفنا عنی  
درسها فی مختلف الطبقات واجتمعنا بمديرها فضيلة  
الاستاذ الشيخ شبیر احمد العثماني وحضرات أسانذة  
الأكرمين فشهدنا ما ملأ قلوبنا سروراً ولمحنا للعلم فی  
وجوههم نوراً۔ الخ (آئینہ دارالعلوم دیوبند)

ہمیں جامع دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی ہم نے مختلف  
درجات میں پھر کر درس و تدریس کا معائنہ کیا اور اس مدرسے کے مدیر جناب  
شیخ شبیر احمد عثمانی اور حضرات اساتذہ کرام سے ملاقات کی۔ ہم نے ایسا منظر  
دیکھا جس نے ہمارے قلوب کو مسرت سے پر کر دیا اور ان کے چہروں پر عزم کا  
نور دیکھا۔

شاہ افغانستان اور دارالعلوم

شاہ افغانستان جناب ظاہر شاہ جب ہندوستان کے سرکاری دورے پر آزادی ہند کے

## پروفیسر گریونٹ اور دارالعلوم

پروفیسر گریونٹ آکسفورڈ یونیورسٹی لندن نے دارالعلوم کو دیکھ کر کہا:

یہ میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ مجھے دیوبند دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ قدیم اسلامی کچراب بھی یہاں پوری آب و تاب سے درخشاں ہے۔ ایک مورخ کے لئے اس سے زیادہ روشن مواقع کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ (آئینہ دیوبند)

## امریکی وفد کی نظر میں

آزادی ہند کے بعد امریکی وفد ہندوستان آیا جو مفتی رحمن، عمر حسن احمد، امیر رشید سعید احمد، امیر حسین، محمد احمد حضرات پر مشتمل تھا انہوں نے دارالعلوم کا معائنہ کر کے لکھا:

ہماری امریکی جماعت کو ایک دن یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) قیام کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ ہم نے مشہور علما اور ان کے شاگردوں سے ملاقاتیں کیں درحقیقت اسلام ہی کا جذبہ، روح کو نور بخشا ہے اور یہ نور یہاں (دیوبند میں) صوفشاں ہے۔ (آئینہ دیوبند)

## دارالعلوم ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند کی نظر میں

مذکورہ بالا اقوال تو دارالعلوم کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کے سوا غیر ممالک کے حضرات کے تھے لیکن خود ہندوستان کے غیر مسلم صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کیا کہا وہ بھی سنئے:

آپ کے دارالعلوم نے صرف اس ملک کے بسنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ آپ نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ غیر ملک کے طلبہ بھی آپ کے یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پا کر جو پچھانبوں نے یہاں سیکھا ہے اپنے ممالک میں اس کی اشاعت فرماتے ہیں۔ یہ بات اس ملک کے سب ہی باشندوں کے لئے قابل فخر ہے..... اگر خدا کو اس نیا کورکن منظور

ہے تو دنیا کو بالآخر اسی لائن پر آتا ہے۔ میں دارالعلوم میں آکر بہت زیادہ مسرور ہوا اور یہاں سے کچھ لے کر جابا ہوں۔ (آئینہ)

اب آپ ہی غور فرمائیے کہ رئیس جمہور یہ ہند دارالعلوم کے متعلق کیا کہہ گئے۔ یہ کچھ تو چند حضرات کے تاثرات نثر میں تھے لیکن نظم میں بھی دارالعلوم کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے جن میں سے صرف دو تین شاعروں کے اشعار پر ہم اختصار کے باعث بس کریں گے۔ مولانا ظفر علی مرحوم پنجاب کے مشہور لیڈر اور اخبار نویس لکھتے ہیں:

### دیوبند

شاد باش و شاد زی اے سرزمین دیوبند      ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند  
ملت بیضا کی عزت کو لگائے چار چاند      حکمت بطحا کی قیمت کو کیا تو نے دوچند  
اسم تیرا با مٹھی، ضرب تیری بے پناہ      دیو استبداد کی گردن ہے اور تیری کند  
تیری رجعت پر ہزار اقدام سوجاں سے غار      قرن اول کی خبر لائی تری الٹی زقند  
تو علم بردار حق ہے، حق نگہباں ہے ترا      خیل باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند  
ناز کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو      کر لیا اُن عالمان دین قیم نے پسند  
جان کر دیں گے جو ناموس پیہر پر فدا      حق کے رستے پر کٹا دیں گے جو اپنا بند بند  
کفرنا چا جن کے آگے بارہا نگنی کا ناچ      جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے پسند  
اس میں قاسم ہوں کہ انور رشہ کہ محمود الحسن      سب کے دل تھوڑے مند اور سب کی فطرت لاہند

گرمی بنگامہ تیری ہے حسین احمد سے آج

جن سے پرچم ہے روایت سلف کا سر بند

مولانا ظفر علی کے دل کی گہرائی سے نکلے ہوئے ان اشعار میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے علما کی ان تمام خصوصیات یعنی ہند میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے، ملت بیضا کی عزت کو چار چاند لگانے، حکمت بطحا کی قیمت کے دوچند کرنے قرن اول یعنی صحابہ کے دور کا سامنہ

پیش کرنے، حق کے نگہبان ہونے اور باطل کو مٹانے، علمائے دیوبند کے سامنے کفر کے عاجز ہونے اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں سے کفر کے پامال ہونے کا اتنی خوبصورتی اور عمدگی سے نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اس سے زیادہ مختصر الفاظ میں ان خصوصیات کا بیان کرنا سہل نہیں۔

## دارالعلوم اکبر الہ آبادی کی نگاہ میں

ہاں مولانا ظفر علی سے بھی بہتر اور مختصر صرف پانچ الفاظ میں اکبر الہ آبادی نے ندوہ اور علیگڑھ کا مقابلہ کرتے ہوئے دارالعلوم کی تعریف حسب ذیل شعر میں اس طرح کی ہے۔

ہے دل روشن مثال دیوبند اور ندوہ ہے زبان ہوشمند  
شاعر کے علیگڑھ سے متعلق اشعار یہاں ہم نے لکھنا پسند نہیں کئے کہ اس میں اک گونہ  
اس کی تنقیص پائی جاتی ہے۔ بہر حال اکبر الہ آبادی مرحوم نے دیوبند کو دل روشن سے تشبیہ  
دے کر اپنی قلمی اور ذہنی قوتوں کو دارالعلوم کے تعارف میں معراج پر پہنچا دیا ہے۔ ”دل  
روشن“ کی یہ ترکیب اضافی درحقیقت ہزاروں دفتروں کی فصیح و بلیغ نثروں سے زیادہ معنی  
آفریں اور سینکڑوں قصائد کے مجموعوں سے زیادہ دلنشین ہے۔

## تجزیہ خیالات

ہم دارالعلوم دیوبند کے فضائل و مناقب میں مذکورہ بالا صرف چند مقتدر اور مستند اہل علم  
و فضل کے خیالات پیش کر سکے ہیں کیوں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کتاب کا یہ مقدمہ کہیں خود  
کتاب نہ بن جائے، اس لئے انہی چند ہر زور اور ہر عظمت بیانات پر اکتفا کرتے ہوئے ہم  
یہ کہنا چاہتے ہیں کہ علامہ رشید رضا مصری، شیخ الاسلام فلپائن شیخ محمد وجیہ، جلالتہ الملک شاہ محمد  
ظاہر (افغانستان)، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد، پروفیسر ابراہیم الجبالی مصری،  
وفد ولایات متحدہ امریکہ، مولانا ظفر علی خاں اور اکبر الہ آبادی نہ تو دارالعلوم کے تعلیم یافتہ  
ہیں اور نہ اس کے زیر اقتدار، مگر اس کے باوجود دارالعلوم دیکھ کر اس سے اس قدر متاثر اور  
اس کے اس قدر معتمد نظر آتے ہیں جس سے فیضہ کرنا پڑتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند ایک

نا قابلِ تردید مقبولیت اور ناقابلِ تردید شہرت کی مالک ایک اسلامی یونیورسٹی ہے، جس کے مقابلے میں دنیا اس نوعیت کی درس گاہ پیش کرنے سے قاصر ہے جہاں دنیا کے گوشے گوشے سے تحصیلِ علوم کے لئے ہر سال طلبہ کھینچے چلے آتے ہیں اور علومِ ظاہری کے ساتھ باطنی دولت اور روحانی عظمت سے بھی بہرہ ور ہو کر جاتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر اب ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ دارالعلوم جس مقام پر رہا اور اب ہے وہ کسی کی تعریف و توصیف سے بلند ہے بقول حافظ شیرازی۔

ز عشقِ ناتمام ماجمالِ یارِ مستغنیست

بابِ درنگ و خال و خط چہ حاجتِ روئے زیارا

بلکہ

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

گردِ لیلے خواہی از وے رُومتاب

جس طرح آفتاب خود اپنی چمک اور دمک سے اپنے وجود پر آپ دلیل ہے اسی طرح سرزمین دارالعلوم دیوبند بھی ایک ایسا آسمان ہے جس پر سینکڑوں نہیں، بلکہ ہزاروں آفتاب و ماہتاب اور ستارے طلوع ہوئے جو آج تک نہیں، بلکہ قیامت تک اپنی چمک اور دمک سے دنیا کو روشن کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، ہاں اگر آفتاب کی روشنی سے چمکاؤ کی نظریں چکا چوند ہو جائیں تو اس میں آفتاب کا کیا نقصان اور قصور ہے۔

گرنہ بیند بروزِ شہرہ چشم

چشمہ آفتاب را چہ گناہ

دارالعلوم پر ہم تفصیلاً کلام زیرِ نظر کتاب میں حضرت مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں کر چکے ہیں وہاں آئندہ اوراق میں آپ کی نظر سے گزرے گا، لہذا ہم اپنے تمہیدی مقصد کی طرف آتے ہیں اور کہنا یہ چاہتے ہیں کہ:



دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ایسے رحمت بھرے ہاتھوں نے ڈالی جس کو قدرت نے رنگ قبول بخش کر بقائے دوام کا تاج اس کے سر پر رکھا اور جس طرح یہ سدا بہار پھول عہد فرنگ میں کھلا تھا اسی طرح عہد برہمن میں بھی تر و تازہ اور شاداب ہے۔

### بانی دارالعلوم

وہ رحمت بھرے ہاتھ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ کے ہاتھ تھے جنہوں نے اس کی بنیاد ڈالی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر کی قدس اللہ سرہ اور دیگر اولیائے کرام کی دعاؤں کا نتیجہ تھا اور حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی سرپرستی کا پھل تھا جو بانی مرحوم کے بعد عمل میں آئی۔ نیز مولانا رفیع الدین صاحب جیسے ولی کامل مہتمم اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے مفتی اولین شیخ الحدیث اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالنا جیسے سب سے پہلے طالب علم رحمہم اللہ علیہم کی برکتوں کا ثمرہ تھا۔

یوں تو دارالعلوم دیوبند نے ہزاروں عالم پیدا کئے لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر وہ صرف ایک ہی یگانہ روزگار، امام عصر، علامہ سید محمد انور شاہ صاحب جیسا عظیم الشان عالم پیدا کر کے مستقبل کے لئے بند ہو جاتا تو پھر بھی لاکھوں ستاروں سے زیادہ منور شمس انور کافی تھا۔ لیکن آگے دیکھئے کہ دارالعلوم نے مفتی عزیر الرحمن جیسے فقیہ النفس، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب جیسے مجدد، علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی جیسے مفسر و متکلم، مولانا حبیب الرحمن صاحب جیسے ادیب و مفکر، حضرت مولانا حسین احمد صاحب جیسے عالم محدث، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب جیسے ثانی شامی، مولانا عبید اللہ صاحب جیسے دیدہ و مبصر، مولانا اعجاز علی صاحب جیسے ادیب اور حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب جیسے مقدس اور مولانا مرتضیٰ جیسے مناظر، مولانا رسول خاں صاحب جیسے منطقی اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی جیسے فلسفی پیدا کئے۔ کوئی بتائے کہ آسمان دارالعلوم کے علاوہ کوئی اور ایسا آسمان ہے جس پر



ان جیسے آفتاب و ماہتاب چمکے ہوں، اور سرزمین دارالعلوم سے بڑھ کر اور کوئی سرزمین ایسی ہے جہاں ایسے سدا بہار پھول کھلے ہوں۔ اس مقام پر پہنچ کر اگر ہم شورش کاشمیری کے وہ اشعار پیش کریں تو مناسب ہوگا جو انہوں نے مذکورہ بالا حضرات میں سے بعض کے متعلق اپنے میگزین چٹان مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۲ء کے صفحات ۱۴ اور ۱۵ میں نام بنام شائع کئے ہیں اور جن کا یہاں درج کرنا نہایت برکل ہوگا۔ شورش صاحب لکھتے ہیں:

## درخشنده چہرے

حاجی امداد اللہ صاحب

بیچ و خم کھاتی ہوئی راہوں کو چمکاتا رہا مہر عالمتاب رنگ و نور برساتا رہا  
قرن اول کے صحابہ کی ادائے خاص میں داستان سید الابرار دھراتا رہا  
عہد استبداد کی تیغ ستم کا بانگین اس کی شمشیرنگہ کے ڈر سے تھراتا رہا  
بوزر و سلمان کے اوصاف کا مظہر تھا وہ  
اس صدی میں غیرت اسلام کا پیکر تھا وہ

مولانا محمد قاسم صاحب (بانی دارالعلوم دیوبند)

شافع کون و مکاں کی راہ پر لاتا رہا گمراہانِ شرک کو توحید سکھلاتا رہا  
پرچم اسلام ابرو درفشان کے روپ میں بتکدوں کی چار دیواری پہ لہراتا رہا  
ہمربانِ دل گرفتہ کو باعلان جہاد تیغ جوہر دار کا آئینہ دکھلاتا رہا  
اس کے سینے میں خدا کا آخری پیغام تھا  
وہ خدا کی سرزمین میں حُجّت اسلام تھا

### مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

اس زمین پر عصر حاضر کا فقیہ بے مثال      عظمت اسلام کی تصویر دکھلاتا رہا  
 اُمتِ مرحوم کو دیتا رہا درسِ حدیث      سنتِ خیر الوریٰ کے زمزے گاتا رہا  
 ضربتِ توحید سے اشراک کی بنیاد وینچ      جس طرف نکلا، جہاں پہنچ وہیں ڈھاتا رہا  
 نام اس کا حشر تک تاریخ میں پائندہ ہے  
 اس مقدس بزم میں تابندہ درخشندہ ہے

### شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

گردشِ دوراں کی سنگینی سے ٹکراتا رہا      مالٹا میں نعمتِ صبر و رضا گاتا رہا  
 فقر و استغنا کی تصویر کہن کا ہمہہ      اس کی جد و جہد کا عنوان کہلاتا رہا  
 حادثوں کی جاں گسل موجلے ہو کر بے نیاز      نقشہٴ قربانی و ایثار ، دکھلاتا رہا  
 واقعہ یہ ہے کہ شمعِ عشق کا پروانہ تھا  
 خواجہ کون و مکان کے نام کا دیوانہ تھا

### مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

جسکی صحبت سے ہوئے اہل طریقت مستفید      جس کی ہیبت سے بتوں کا دبدبہ جاتا رہا  
 باندھ کر اپنے خدا سے رشتہٴ عبد الست      دعوتِ ارشاد کے میدان گرماتا رہا  
 اس خدا آگاہ پر شورشِ خدا کی رحمتیں      جو دِل پیرو جواں پر لطف فرماتا رہا  
 اس طرح شیرازہٴ صرصر پریشان کردیا  
 اس نے ہر شاخِ گلستان کو گل افشاں کردیا

### مولانا سید محمد انور شاہ صاحب

غاشیہ بردار دربار رسول اللہ کا ماضی مرحوم کے اعجاز دکھاتا رہا  
 آدمی کے روپ میں قدرت کا روشن معجزہ غم کی میت سے رزم و بزم پر چھاتا رہا  
 سادگی میں عہد اولیٰ کے صحابہ کی مثال سیرت پیغمبر کو نین سمجھاتا رہا  
 یہ جہاں قافی ہے کوئی چیز لافانی نہیں  
 پھر بھی اس دنیا میں انور شاہ کا ثانی نہیں

### مولانا حسین احمد مدنی صاحب

شہر استبداد کے دیوار و در ڈھاتا رہا گم شدہ اسلاف کی تصویر دکھاتا رہا  
 بیچ تھا اس کے لئے اندیشہ دار و رسن پائے استحقار سے دنیا کو ٹھکراتا رہا  
 خواجہ کو نین کے روضے کی جالی تھام کر نور کے ترکے دعا کو ہاتھ پھیلاتا رہا  
 ان کمالات و محاسن میں جواب اس کا نہیں  
 اس قبیلے میں کوئی بھی ہمرکاب اس کا نہیں

### مولانا عبید اللہ سندھی صاحب

عمر بھر اپنے تخیل کی سزا پاتا رہا دار پر بھی نغمہ مہر دونا گاتا رہا  
 اپنے دامن کی ہوا سے لشکر احرار میں جہد و ایثار و غا کی آگ بھڑکاتا رہا  
 ہر کہ و مہ سے حدیث عاشقی کہتا ہوا آئے دن کے حادثوں پر ناز فرماتا رہا  
 کیا ہمیں اس نے کہا یہ بات ہی مانی نہیں  
 ہم نے اس کی صورت افکار پیچنی نہیں

شورش صاحب نے جیسا کہ راولپنڈی میں مولانا غلام اللہ صاحب کے سامنے میرے  
 سوال کے جواب میں فرمایا کہ علامہ شبیر احمد عثمانی کے متعلق اشعار رہ گئے لہذا اس کا کفارہ

اگلے پرچے میں ادا کروں گا۔ انہوں نے تو نہیں کیا لیکن علامہ کے متعلق راقم الحروف کے حسب ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

### مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب

وہ زمانے کا غزالی نور برساتا رہا      کوثر و تنیم کی موجوں کو شرماتا رہا  
ترجمان فقہ و تفسیر وحدیث مصطفیٰ      خود کلام اس پر ہمیشہ ناز فرماتا رہا  
ثانی قاسم تھا اور ظل ولی اللہ تھا      حکمت و اسرار کے عقدوں کو سلجھاتا رہا  
جامع معقول اور منقول اس کی ذات تھی  
دین و دانش سے منور اس کی ہر اک بات تھی

یہ ہیں آسمان دارالعلوم کے ماہ پارے اور درخشندہ چہرے جن کا شورش صاحب نے حقیقت سے بالکل قریب ہو کر نقشہ کھینچا ہے۔

جن حضرات کے اسمائے گرامی ہم نے مذکورہ صفحات میں پیش کئے ہیں وہ دورِ اوّل، دوم اور سوم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن دورِ چہارم پر سرسری نظر ڈالی جائے تو ان میں مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مولانا محمد طیب صاحب نبیرہ قاسم العلوم، مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی، مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی مرحوم، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم، مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی، مولانا یعقوب الرحمن صاحب عثمانی مرحوم، مفتی عتیق الرحمن صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم۔ اے، یہ سب حضرات دارالعلوم کے فضلا اور علماء ہیں، جن کی تصنیفات ان کی فضیلت پر بہترین گواہ ہیں اور خدا جانے کس قدر عظیم المرتبہ ہستیاں ہیں جو اس وقت قوت حافظہ میں محفوظ نہیں اور نہ یہاں تمام حضرات کا استقصا مقصود ہے، بلکہ صرف سرسری تعارف مطلوب ہے۔ ان حضرات میں یوں تو ہر شخص علم کا پیکر ہے لیکن مولانا محمد طیب صاحب کی ذات گرامی سے بہتیم ہونے کی حیثیت سے دارالعلوم کو ان کے دورِ اہتمام میں جو تعمیری اور مالی ترقی ہوئی ہے وہ اب تک کے تمام ریکارڈ توڑ چکی ہے اور بلاشبہ وہ اپنے جدِ محترم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔

آج ملک میں ان کی ہر طرف دھوم ہے اور ان کی شخصیت مقبول بارگاہ ایزدی اور ہر دعویٰ مسلمانان ہند و پاکستان ہے۔

## دارالعلوم نے کیا دیا

دارالعلوم کی بنیاد ۱۸۵۷ء کے دس سال بعد اُس پر آشوب دور میں رکھی گئی جبکہ مسلمانوں کی سلطنت اور مذہب پر تابوتِ حملے ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے۔ آٹھ سو سالہ حکومت و اقتدار کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑائی جا چکی تھیں اور ہندوستان میں ان کی عظمتوں کے چراغ گل ہو چکے تھے۔ شاہجہانی قلعے پر انگریزوں کا پھریرا لہرا رہا تھا اور اس پر عیسائی مشنریاں اور آریائی دسیسہ کاریاں اسلام کے چراغوں کو بجھانے کے لئے پھونکیں مار رہی تھیں۔

ایسے حالات میں ضرورت تھی کہ قدرت کا غیبی ہاتھ اسلام اور مسلمانوں کی حوادث کے بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کو پار لگائے، چنانچہ قدرت نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو اس مقصد کے لئے کھڑا کیا اور انہوں نے مسلمانان دیوبند کو ایک ایسے مدرسے کی بنیادیں اٹھانے کا مشورہ دیا جو ایسے علماء تیار کرے، جو اپنے علم و عمل اور مجاہدانہ روحانیت و اخلاص سے مسلمانان ہند کی رہبری کریں اور ان کے ایمان کو تھام لیں۔ ان کی عظمت و ارفۃ کو واپس لائیں اور دین کی ایسی شمعیں روشن کریں جن سے مسلمانوں کے تاریک دلوں میں روشنی پیدا ہو جائے اور ان کو انکا راستہ نظر آجائے، چنانچہ یہ مدرسہ قائم ہو گیا اور مدرسے سے ترقی کر کے آج یہ اسلامی یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا۔

دارالعلوم نے مسلمانوں کو کیا دیا اور اس کی شہرت کو چار چاند کیسے لگے اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو علم، عمل، اخلاص، ادب اور سیاست سے مالا مال کیا اور ہر پہلو اور ہر ہر کر وٹ پر ان کے لئے رہنمائی اور رہبری کا سامان فراہم کیا۔ اب اہل انصاف خود فیصلہ فرمائیں کہ جس دارالعلوم نے ہر ہر قدم پر مسلمانوں کی رہنمائی کی اور ان کو

علم و عمل، اخلاص اور ادب و سیاست سے آراستہ کیا اس سے بڑھ کر دارالعلوم دیوبند کا اور کیا شاہکار ہو سکتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

شریعت را سه جزء است: علم و عمل و اخلاص تا این سه جزء متحقق نشوند شریعت متحقق نشود۔ جوں شریعت متحقق نہد رضائے حق سبحانه و تعالیٰ حاصل گشت کہ فوق جمیع سعادت دنیویہ و اُخرویہ است وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ اَکْبَرُ (مکتوبات مجدد مطبوعہ امرت سر حصہ اول دفتر اول ص ۹۸)۔

شریعت کے تین جز ہیں، علم، عمل اور اخلاص جب تک یہ تین جزء موجود نہ ہوں شریعت کا وجود نہیں ہوتا۔ اور جب (ان تینوں کے وجود سے) شریعت وجود میں آگئی تو خدائے پاک و بلند کی رضا حاصل ہو گئی جو تمام دنیوی اور دینی نیک بختیوں سے بھی زیادہ ہے اور اللہ کی خوشنودی سب سے زیادہ ہے۔

دارالعلوم نے بقول حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ علم و عمل اور اخلاص سے مزین علماء پیدا کر کے دنیائے اسلام میں شریعت کو قائم کیا اور شریعت قائم کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا سامان پیدا کیا، جو دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے۔ اور اسی لئے اکبر الہ آبادی نے دیوبند کو دل روشن کہہ کر پکارا ہے۔

علم

دارالعلوم نے علم کیونکر دیا اس کے متعلق نہایت تفصیل سے ہم ابتدائی سطور میں واضح کر چکے ہیں کہ اس گہوارہ علم سے بہترین اہل علم و ہنر پیدا ہوئے اور علم کے زیور سے آراستہ ہو کر دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پہنچے، اور جہاں جہاں پہنچے انہوں نے اپنے علم کے چراغ سے اور سینکڑوں چراغ روشن کئے اور ہزاروں ارباب علم پیدا کئے اور یوں سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ دارالعلوم کی بہت سی شاخیں مثلاً مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ عربیہ قاسمیہ مراد آباد، امروہہ، میرٹھ، گلاٹھی، رڑکی، مظفر نگر، دہلی، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، افغانستان، ڈابھیل،



کراچی، اشرف آباد سندھ، جامعہ اشرفیہ لاہور، غرض یہ کہ جہاں جہاں فضلاء دیوبند پہنچے وہاں وہاں انہوں نے مدارس دینیہ قائم کر ڈالے۔

اس طرح انہوں نے علوم و فنون کے ہر جگہ دریا بہائے پھر جامع مسجدوں میں خطابت کے ذریعہ علم و تبلیغ کے چشمے جاری کئے، پنڈالوں اور جلسوں میں اپنے وعظوں سے لوگوں میں علوم دینیہ پھیلانے، سرکاری اور دولتی یونیورسٹیوں، کالجوں، سکولوں میں ہر جگہ آپ الحمد للہ دارالعلوم کے فاضل پائیں گے، جو اپنی اپنی جگہ علم و تبلیغ کی شمعیں روشن کئے رہے اور کئے ہوئے ہیں اور جہاں مغربی اثرات نے مسلمان طلبہ کے دلوں پر اپنے سکے جمائے ہوئے ہیں وہاں یہ حضرات دینی دفاع میں مصروف عمل ہیں۔

### تصنیفات

دارالعلوم کے فضلاء نے اب تک تصنیفات و تالیفات کا ایک زبردست ذخیرہ پیدا کیا ہے۔ علم شریعت، روحانیت و طریقت، زبان اور سیاست میں بہت سی کتابیں لکھیں اور اس طرح دینائے اسلام کی زبردست خدمات انجام دیں اور علوم دینیہ پھیلانے میں کوشش کی۔

۱..... حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی آب حیات، تقریر دلپذیر، حجت الاسلام، ہدیہ شیعہ وغیرہ۔

۲..... حضرت مولانا گنگوہیؒ کی فتاویٰ رشیدیہ، کوکب دری، زبدۃ المناسک، سبیل الرشاد، تصفیۃ القلوب، امداد السلوک وغیرہ۔

۳..... شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کا ترجمہ قرآن مجید، اردو زبان کا بڑا شاہ کار ہے اور سورۃ بقرہ اور سورۃ نساء کے تفسیری فوائد بہترین تفسیری فیضان ہے۔

۴..... حضرت مولانا سید محمد انور شاہؒ صاحب کی لاجواب کتاب فیض الباری شرح بخاری، النسخ الشذی شرح ترمذی، اکفار الملحدین، عقیدۃ الاسلام، مشکلات القرآن، نیل الفرقدین، خاتم النبیین وغیرہا۔



۵..... حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی تصنیفات تقریباً ایک ہزار میں۔ ان میں سے صرف تفسیر بیان القرآن اور قرآن کریم کا نہایت سادہ اور بامحاورہ ترجمہ اور فوائد تفسریہ، بہشتی زیور، البوارد والنوادر، اصلاح الرسوم، نشر الطیب، الافاضات الیومیہ۔

۶..... حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی نقش حیات، مکتوبات وغیرہ (معلومات کا بہترین دفتر) ارشادات، اسیر مالنا وغیرہ۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کی فتح الملہم شرح مسلم دنیائے اسلام اور حقیقت کا بہترین عربی شاہکار، قرآن کریم کے بے نظیر پرمغز اور ادیبانہ مقبول عوام و خواص تفسیر، العقل والنقل، اعجاز القرآن، الاسلام، الشہاب الروح فی القرآن اور شرح بخاری اردو وغیرہ مطبوعہ وغیرہ۔

۸..... فخر الاسلام مولانا حبیب الرحمن عثمانی کی شہرہ آفاق کتاب ”دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا“ اور تعلیمات اسلامیہ سے حصص۔ القصیدۃ اللامیہ وغیرہ۔

۹..... فقیہ النفس مفتی عزیر الرحمن صاحب کے فتاویٰ، ضخیم اور مبسوط جلدوں میں۔

۱۰..... مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب کی مناظرے کی کتابیں۔

۱۱..... حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب کی تصنیفات میں مفید الوارثین، حیات شیخ الہند، فتاویٰ محمدی کامل، الجواب التین، مولوی معنوی، حیات خضر وغیرہ۔

۱۲..... مولانا فخر الدین صاحب موجودہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی ایضاح البخاری ترجمہ و شرح بخاری بزبان اردو۔

۱۳..... مولانا اعجاز علی صاحب کے دیوان حماسہ، دیوان مثنوی، نور الایضاح، کنز الدقائق کے حواشی اور فتح العرب وغیرہ۔

۱۴..... مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کی مشکوٰۃ کی بے نظیر شرح عربی زبان میں، سیرۃ المصطفیٰ سے جلد، علم الکلام، عقائد اسلام وغیرہ۔



۱۵..... مولانا محمد طیب صاحب کی اسلام کا اخلاقی نظام، انسانیت کا امتیاز، اجتہاد اور تقلید، حدیث رسول کا قرآنی معیار، شہید کربلا اور یزید، سوانح ابوذر غفاری، عقائد الاسلام قاسمی۔

۱۶..... مولانا مناظر احسن گیلانی کی تدوین حدیث، سوانح قاسمی، مقالات احسانی، سوانح ابوذر غفاری، النبی الخاتم، اسلامی معاشیات، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔

۱۷..... مفتی محمد شفیع صاحب کی فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، شہید کربلا، ختم نبوت ہر حصہ، الحیلۃ الناجزۃ وغیرہ۔

۱۸..... مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی کی قصص القرآن، اقتصادیات فی الاسلام، مکاتیب سید المرسلین۔

۱۹..... مولانا محمد میاں دیوبندی کی علمائے ہند کا شاندار ماضی، علمائے حق وغیرہا۔

۲۰..... مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدینہ کی ترجمان السنہ اور زاد الفقیر۔

۲۱..... مولانا منظور احمد نعمانی کی معارف الحدیث اور دیگر مناظرے کی بے حد مفید کتابیں۔

۲۲..... پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی فاضل دیوبند۔ ایم۔ اے صدر شعبہ اسلامیات علیگزہ یونیورسٹی کی ”اسلام میں غلامی کی حقیقت“ غلامان اسلام، وحی الہی، صدیق اکبر وغیرہا۔

۲۳..... مولانا حامد الانصاری غازی کی ”اسلام کا نظام حکومت“

۲۴..... مولانا زین العابدین کی خلافت راشدہ، تاریخ امت وغیرہا۔

ہم نے مذکورہ بالا علماء و فضلاء دیوبند کی بعض بعض کتابوں کا محض تعارف کے طور پر سرسری حوالہ پیش کیا ہے تاکہ قاری کو قدرے اندازہ ہو جائے، ورنہ کتنے ہی اور علماء و فضلاء ہوں گے اور ہیں جن کا ہم اپنے اس خاکے میں ذکر کرنا بھول گئے یا اختصار کے باعث نہ کر سکے۔

## ندوة المصنفین

اشاعتِ علوم و فنون میں فضلاءِ دیوبند کا تصنیفی ادارہ ندوة المصنفین دہلی جس کے موسس مفتی عتیق الرحمن صاحب فاضل دیوبند ہیں اپنی نوعیت کا پاک و ہند میں بے نظیر ادارہ ہے اس کے مصنفین تقریباً سب ہی دیوبند کے فاضل ہیں اور جواب تک بہت سی نہایت مہتم بالشان کتابیں شائع کر چکا ہے۔ یوں سمجھئے کہ مجموعی طور فضلاءِ دیوبند نے ہر مضمون اور ہر فن پر کتابیں لکھ کر امت مسلمہ پر زبردست احسان کیا ہے۔

## ۲..... عمل

ہم نے ابھی گذشتہ سطور میں آپ کے سامنے یہ اجمالی خاکہ پیش کیا ہے کہ دارالعلوم نے دنیائے اسلام کو علم دیا اور اس کی مختصر سی روئداد پیش کی ہے۔

دوسری اہم مقصود بالذات چیز جو دارالعلوم نے دنیائے اسلام کو بخشی وہ عمل ہے یعنی دارالعلوم اور اس کے سرپرست، اس کے مدرسین، اس کے فضلاء دنیا کے گوشے گوشے میں علم کے ساتھ اپنا عمل لے کر پہنچے اور انہوں نے لوگوں کو اسلام کی دعوت کے ساتھ عمل کی دعوت دی اور بہت سے علماء نے رشد و ہدایت کے مسد پر بیٹھ کر ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو اسلام کے احکام نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر عمل کرنے کا جذبہ بخشا اور ان کو روحانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچایا۔ اس سلسلے میں آپ خصوصی طور پر ہمارے اس بیان کو حقیقت کی نظروں سے پڑھئے کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے اپنے مرکز تھانہ بھون اور مکہ معظمہ سے ہزاروں علماء اور خواص و عوام کو مخلص مومن بنادیا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب، حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب، حضرت مولانا اشرف علی صاحب، حضرت مولانا حسین احمد صاحب، حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب وہ مقدس حضرات ہیں جنہوں نے ظاہری علوم کے ساتھ باطنی اور

روحانی علوم کے مدارس کھول رکھے تھے اور جنہوں نے لاکھوں بندگانِ خدا کو عمل کی راہ پر گامزن کیا اور روحانیت کا درس دے کر صحیح معنی میں ان کو بندہٗ عمل بنادیا۔ گنگوہی، تھانوی اور راپوری خانقاہیں ان فرشتہ نما انسانوں کی یادگاریں ہیں جن کے قدموں میں فرشتے اپنے پر بچھاتے تھے اور جن کی فہرستیں آپ آئندہ اوراق میں دیکھیں گے۔ بہر حال فضلاء دیوبند میں آپ عمل اور ان کے ذریعے عوام و خواص میں عمل کی قوت کا ایک جذبہ خاص آپ محسوس کریں گے جو دوسری جگہ مشکل سے آپ کو ملے گا۔ ان بزرگوں نے وہ کیا جو نبوت کا منشا یعنی تزکیہٴ نفوس اور تطہیرِ قلوب تھا۔

### احسان، اخلاص اور تقویٰ

ایک تیسری چیز علم و عمل کے علاوہ جو دارالعلوم اور اس کے اکابر نے دنیائے اسلام کو بخشی وہ اخلاص تھا، چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر اب تک دارالعلوم میں ہر چھوٹے اور بڑے کا یہ جذبہ رہا ہے کہ تبلیغِ دین کو انہوں نے خالص اللہ کے لئے اپنا صحیح نظر بنائے رکھا۔ ان کے ہر دینی عمل میں خلوص اور للہیت رہی ہے۔ انہوں نے کبھی نمائش اور نمود کے لئے دین کی خدمات انجام نہیں دیں۔ وہ کم علم اور دنیا دار پیروں اور مولویوں کی طرح جُبہ و دستار سے مزین ہو کر عوام کو محسور کرنے سے مجتنب اور متفر رہے ہیں۔ انکساری اور تواضع، عاجزی اور فروتنی ان کی امتیازی شان رہی ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو کبھی مسجودِ خلاق نہیں بنایا، کبھی عوام سے سجدے نہیں کرائے نہ دست بوسی اور قدم بوسی کی عوام سے اُمید رکھی۔ نہ محراب و منبر پر خیف الحُرکاتی ان کا شیوہ رہا۔ تقاریر میں اشعار بھی پڑھے تو تحت اللفظ

یہی اخلاص کا ثمرہ تھا کہ بانی دارالعلوم نے وصیت میں فرمایا کہ دارالعلوم کے لئے غربا اور عوام کی اعانت پر نظر رکھی جائے اور توکل کو پورے طور پر عمل میں لایا جائے چنانچہ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ دارالعلوم کے خزانے میں ایک پیسہ بھی نہ ہوتا لیکن فوراً ہی قدرت کوئی انتظام



کر دیتی تھی۔ اس کے مالی کام میں کبھی بھی رخنہ نہیں پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے دو حصے ہو گئے، ڈر تھا کہ اس نازک دور میں دارالعلوم کو مالی نقصان نہ پہنچ جائے لیکن بحمد اللہ اب پہلے سے زیادہ آمدنی ہے اور سالانہ بجٹ سات آٹھ لاکھ روپیہ ہے، مگر سب کام تو کل پر چل رہا ہے۔ یہ اخلاص ہی کا ہی نتیجہ تھا اور ہے کہ اکابر دیوبند نے ہزاروں روپیہ ماہوار کی تنخواہوں کو ٹھکرا کر چالیس، پچاس اور ساٹھ روپیہ ماہوار پر دارالعلوم میں اپنی زندگیاں ختم کر دیں۔ طلبہ کو پرائیویٹ پڑھانے پر کوئی معاوضہ لینا سخت عیب سمجھا جاتا ہے۔

بہر حال دارالعلوم نے اپنے فرزندوں میں اللہ کے لئے کام کرنے کا جذبہ بخشا اور خلق اللہ کی خدمات انجام دیں، وہ اپنی نظروں میں مالک الملک ذوالجلال والا کرام کے سوا کسی کو جگہ نہ دیتے تھے اور جیسا کہ علامہ رشید رضا نے کہا کہ دارالعلوم کے علماء بہت زیادہ خود دار ہیں، بس اسی کا نام خلوص اور تقویٰ ہے۔ رسالۃ مصطلحات صوفیائے کرام میں اخلاص کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

آکھ از غیر صوفی مبرا باند و در سخن قطع نظر از خلوص  
کنند۔

(اخلاص) یہ ہے کہ غیر حق سے (صوفی) مبرا ہو جائے اور مخلوق سے ہر معاملے میں (اللہ کے سوا) بے پروائی برتے۔

یہی حقیقت تھی کہ دیوبند کے اکابر اور وہاں کے تعلیم یافتہ فضلا کبھی حکومت فرنگ کے سامنے نہیں جھکے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ جمعیت الانصار اور ریشمی رومال کی تحریک کے باعث لنڈن کی پارلیمنٹ میں دارالعلوم کو بند کر دینے کا فیصلہ کر دیا گیا، لیکن دارالعلوم نے اس کو چیلنج کیا اور بالآخر اس کو فتح نصیب ہوئی اور الحمد للہ کہ فرنگی کا راج کل ہند و پاک سے چلا گیا مگر دارالعلوم اپنی جگہ آج بھی اسی آب و تاب اور شان و شوکت سے قائم ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ قائم رہے گا۔



دارالعلوم کے اکابر میں اگر خلوص کی بجائے حرص و طمع ہوتی تو وہ حکومت فرنگ کی گرانٹ قبول کر لیتے، لیکن انہوں نے سلطنتِ برطانیہ سے امداد کی خواہش تو کجا خود حکومت کی امداد دینے کی خواہش اور درخواست کو بھی ٹھکرا دیا اور ابھی تک برہمنی راج میں بھی وہ اپنے سر پر وقار کو بلند کئے ہوئے ہیں اور بزبانِ حال اقبال کے اس شعر پر عمل پیرا ہیں۔

من کی دنیا میں نہ دیکھا میں نے افرونگی کا راج  
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن  
بلکہ اقبال کے دوسرے شعر پر دارالعلوم کی مصلحت آمیز نظر رہی۔  
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات  
تو جھکا گر غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

لہذا دارالعلوم نے اپنے اخلاص کی خاطر اپنے من، تن، سر اور آنکھ کو غیروں کے سامنے کبھی نہیں جھکایا، بس اسی اخلاص اور تقویٰ پر دارالعلوم کا رہنما ہے اور یہی اخلاص اس نے اپنے فضلاء اور متقدمین کو بخشا ہے۔

## تکمیلِ شریعت

گویا دارالعلوم نے علم، عمل اور اخلاص یعنی تقویٰ دے کر جو کہ مقامِ احسان ہے حضرت مجددِ صاحبِ الف ثانی کے قول کے مطابق اپنے طلبہ، علماء اور معتقدین کی شریعت کو مکمل کر دیا اور جس کی شریعت مکمل ہو گئی اس سے خدا راضی ہو گیا وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَکْبَرُ۔

در اصل عمل کے بغیر علم اور اخلاص کے بغیر عمل بے کار ہے۔ مانا کہ نماز کی فرضیت پر ایک شخص ایمان رکھتا ہے لیکن نماز پڑھے بغیر ایمان میں روشنی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر ایمان کے بعد نماز پر عمل کیا تو اس کا افادی پہلو سامنے آ گیا۔ لیکن اگر نماز میں اخلاص پیدا نہ ہو تو عمل کی روح نکل کر عمل کو مردہ بنا دیتی ہے۔ غرض کہ ہر عبادت کے یہی تین پہلو ہیں اور

اسی کو حدیث جبریل میں احسان کہا گیا ہے۔ جبریل علیہ السلام نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ”وما الإحسان یا رسول اللہ“ یا رسول اللہ احسان کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ:

أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (مشکوٰۃ)

تو اس طرح اللہ کی عبادت کرے گویا کہ تو خدا کو دیکھ رہا ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر یہ کہ خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔

جب مؤمن کو عبادت میں یہ کیفیت حاصل ہو جائے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہو تو پھر اس کے عمل میں غایت درجے کا خلوص اور خشوع و خضوع پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ مقام حاصل نہ ہو سکے تو پھر دوسری صورت یہ ہو کہ وہ دل میں یہ یقین کرے کہ خدائے کریم اس کو دیکھ رہا ہے۔ بس جب یہ صورت پیدا ہو جائے تو عمل میں یقیناً خلوص ہوگا اور اسی کا نام احسان ہے، جس کو ہم اخلاص اور تقویٰ سے تعبیر کر رہے ہیں، اور ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دارالعلوم کی بنیاد اخلاص اور تقویٰ پر رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ مقبول ہوا اور یہی خلوص وراثت میں وہاں کے فضلا کو ملا۔

### سیاسیات ملکی اور آزادی ہند میں علمائے دیوبند کا حصہ

اگرچہ علمائے دیوبند کی جماعت ہر میدان میں فعال جماعت رہی ہے لیکن مذہب کے ساتھ سیاسیات جو مذہب کا جز ہے ان کا خصوصی میدان عمل رہا ہے۔ چنانچہ اس خصوص میں انہوں نے اپنے علمی خاندان شاہ ولی اللہ کی روایات کو برابر زندہ رکھا۔ جنگ بلقان و طرابلس میں لسانی اور مالی امداد کی، شیخ الہند اور وہاں کے تمام اساتذہ اور طلبہ ملک میں نکلے، دارالعلوم کو کچھ عرصہ کے لئے بند کیا اور درمے، قلمے اور قدیمے مدد کی۔ ۱۹۱۸ء کے بعد تحریک خلافت میں زبردست حصہ لیا اور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک برابر ملکی اور دنیا کی سیاست میں برابر کے شریک رہے اور مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت مولانا رشید احمد

صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب نے جہاد بالسیف میں زبردست حصہ لیا تا آنکہ ان کے کئی رفقاء نے جام شہادت پیا، مولانا رشید احمد صاحب نے چھ ماہ جیل کی کڑیاں جھیلیں، مولانا محمد قاسم صاحب کو خود گولی لگی لیکن جان بچ گئی۔ اور جہاد کے براتیوں میں ایک خاص مجاہد دودھا حافظ محمد ضامن حسن صاحب شہید ہوئے۔

### ریشمی رومال کی تحریک اور مولانا محمود حسن

اسی دارالعلوم کے شیخ مولانا محمود حسن صاحب نے فرنگی راج کا تختہ الٹنے کے لئے ترکوں کے خلیفہ اور ایران و افغانستان کے بادشاہوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، اور ان ممالک اسلامیہ کے سربراہوں اور قبائلی علاقے کے پٹھانوں میں جہاد کی تحریک کی اور متحد طور پر انگریزوں پر حملہ آور ہونے، ہندوستان کو آزاد کرانے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کی تحریک چلائی۔ انہوں نے مولانا عبید اللہ سندھی کو قبائلی علاقے میں اور پھر افغانستان بھیجا اور خود حجاز روانہ ہوئے، وہاں غالب پاشا، انور پاشا سے ملاقاتیں کیں اور تمام تحریک سے آگاہ کیا، لیکن عرب میں ترکوں کے خلاف بغاوت ہوئی۔ شریف مکہ نے غداری کی اور انگریزوں کے ساتھ مل گیا، جس کے باعث ترکوں کا اقتدار جاتا رہا اور حجاز میں انگریزوں کی طاقت دخیل ہوئی، ادھر شیخ الہند کی تحریک کا پتہ گورنمنٹ برطانیہ کو چل گیا۔ چنانچہ آپ کو شریف مکہ کے ذریعہ گرفتار کیا گیا اور پھر پانچ چھ سال جزیرہ مالٹا میں قید رکھا گیا۔ جب آپ کی رہائی ہوئی تو ہندوستان آ کر آپ نے تحریک خلافت میں حصہ لیا اور چند ماہ کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔ مولانا عبید اللہ صاحب جلاوطن قرار دیئے گئے اور پھر مدتوں کے بعد کانگریس حکومت کی سفارش پر ہندوستان آئے اور جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

### مسلم لیگ اور کانگریس

متحدہ ہندوستان کی آزادی کے آخری نازک دور میں بھی دارالعلوم دیوبند کی دو مقتدر ہستیاں میدان سیاست میں اتری ہوئی تھیں، اور وہ دونوں اگرچہ سیاست میں ایک دوسرے



سے موافق نہ تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک کے سر ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت کا سہرا بندھا اور دوسرے کے گلے میں پاکستان کی قیادت کا ہار ڈالا گیا۔ ان میں سے ایک شیخ الاسلام ہند حضرت مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث (پرنسپل) دارالعلوم دیوبند تھے اور دوسرے شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم یا وائس چانسلر دارالعلوم دیوبند تھے۔ دونوں ایک ہی مادر علمی کے فرزند اور ایک ہی مکتبہ فکر کے سر بلند عالم تھے۔ دونوں ایک ہی شیخ یعنی مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا کے شاگرد تھے، مگر ایک نے اپنے غور و فکر اور علمی اجتہاد سے کانگریس کا ساتھ دیا اور دوسرے نے مسلم لیگ کے ساتھ رہنا اپنے اجتہاد کا ثمرہ سمجھا۔

یہ حقیقت سمجھنا واضح ہے کہ کسی سیاسی یا علمی مسئلہ میں اختلاف اگر نیک نیتی سے ہو تو کسی کی بھی توہین کرنا خود غلط ہے۔ ہاں اپنے اپنے دلائل کی روشنی میں ہر شخص اپنے آپ کو صحیح راہ پر سمجھے یہ درست ہے۔ کئی مسائل میں صحابہ کا اختلاف، ائمہ ہدایت کا اختلاف، خود استادوں اور شاگردوں کا اختلاف اپنی اپنی جگہ درست سمجھا گیا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے دو جلیل القدر تلامذہ یعنی امام محمد اور امام ابو یوسف نے بہت سے مسائل میں اپنے استاذ سے اختلاف کیا ہے۔ بس اسی طرح کا اختلاف ان دونوں حضرات میں تھا اور اس اختلاف سے ایک دوسرے کے متبعین کے یہ شایان شان نہیں کہ وہ ایک دوسرے کو برائی سے یاد کریں۔

ہمارا اصول یہ ہے کہ دونوں حضرات ہمارے اپنے تھے اور قدرت نے دونوں کو خاص خطوں کی قیادت کے لئے چن لیا۔ ایک کو پاکستان کے لئے اور دوسرے کو ہندوستان کے لئے۔ اگر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نظریہ پاکستان کے حامی نہ ہوتے تو پاکستان میں علمائے دیوبند کو منہ دکھانے کو جگہ نہ ہوتی اور اسی طرح اگر مولانا حسین احمد صاحب متحدہ ہندوستان کے نظریے کے مؤید نہ ہوتے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی اس نازک دور میں حمایت نہ کر سکتے جبکہ ان کو تختہ مشق بنایا جا رہا تھا۔ یہ حقیقت مانی پڑے گی کہ جب بھارت میں

مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا اس وقت صرف دو ہی شخصیتیں ایسی تھیں جو گولیوں کی بوچھاڑ میں مسلمانوں کے دفاع میں سینہ سپر ہو کر بھاگی بھاگی پھرتی تھیں اور وہ تھے مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا حفظ الرحمن صاحب فاضل دیوبند۔ اسی طرح جو کانگریسی خیال کے مسلمان پاکستان پہنچے تو علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے ان کی ہر نوع اعانت فرمائی اور یہ خیال میں بھی نہ لائے کہ ان صاحبان کا سیاسی نظریہ کانگریس نوازی کا تھا۔

بہر حال دونوں ملکوں کی سیاسی قیادت ان فرزند ان دارالعلوم کے مبارک ہاتھوں میں تھی متحدہ ہندوستان کی اور کوئی شخصیت ان حضرات سے اونچی نہ تھی جو ان سے آگے بڑھتی۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ہندوستان کے آزاد ہونے اور پاکستان کے بننے تک اور اس کے بعد بھی علمائے دیوبند ہی سیاستِ ملکیہ پر چھائے رہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ پر ممبر ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر رسوخ رکھتے تھے تا آنکہ انہوں نے پاکستان کے لئے اسلامی قانون پاس کرایا اور ادھر ہندوستان کی پارلیمنٹ اور دستور ساز اسمبلی میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی بحیثیت رکن دندنا تے رہے اور آخر کو یہ سب حضرات دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خدائے کریم ان کی قبروں پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے اور ہمیں ان کے متعلق کسی قسم کی بدگمانی سے بچائے۔

### نظریہ پاکستان اور علمائے دیوبند

اگرچہ کتاب کا یہ مقدمہ طوالت کی طرف جا رہا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ مدعائے ضروری الاظہار سامنے آ کر قلم کو بعض ضروری حقیقتوں کو واضح کرنے کے لئے مجبور کرنا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ علمائے دیوبند نے کانگریس کا ساتھ دے کر نظریہ پاکستان کی مخالفت کی ہے اور اس کی تائید مولانا حسین احمد صاحب کی کانگریس میں شرکت اور مسلم لیگ کی مخالفت کو پورے زور سے پیش کرتے ہیں، بات یہ ہے کہ دنیا میں عام طور پر کسی چیز کے منفی پہلو کو



دیکھا جاتا ہے۔ مثبت پہلو سے شاذ و نادر ہی کوئی بحث کرتا ہے۔ حالانکہ دوسرا پہلو یہ بھی تو تھا کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب سرپرست دارالعلوم دیوبند اور مولانا شبیر احمد صاحب صدر مہتمم دارالعلوم اور مفتی محمد شفیع صاحب مدرس دارالعلوم یہ سب حضرات مسلم لیگ کے زبردست حامی تھے اور علامہ عثمانی نے تو نظریہ پاکستان کی اس قدر حمایت کی کہ اگر وہ لیگ کی طرف نہ آتے تو مسلمانان ہندوستان کو شرعی حیثیت سے مطمئن کرنا دشوار ہو جاتا اور قائد اعظم اور پاکستان کے لئے سخت دشواریاں پیش آتیں، بلکہ کچھ عجب نہ تھا اگر قائد اعظم ہتھیار بھی ڈال دیتے۔ کیوں کہ دوسرے محاذ میں کانگریس، جمعیت العلماء، احرار، خاکسار اور جماعت اسلامی سب ہی نظریہ پاکستان کے مخالف تھے۔ یہاں یہ بات عام طور پر فراموش کر دی جاتی ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تو تھے لیکن جمعیت العلماء ہند کے صدر ہونے کی حیثیت سے وہ کانگریس میں شامل تھے نہ کہ دارالعلوم کی طرف سے نمائندگی فرما رہے تھے۔ بلکہ انہوں نے طلبہ دارالعلوم دیوبند کو نہ صرف کانگریس کی سیاسیات، میں بلکہ مطلقاً سیاست میں حصہ لینے سے بار بار روکا ہے۔ ہاں تو دارالعلوم کے متعدد مقتدر اصحاب قطعی طور پر نظریہ پاکستان کے نہ صرف موید تھے بلکہ وہ دو قدم قائد اعظم سے بھی آگے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قائد اعظم کو دینی جذبات پر ابھار کر ان کو دین کی راہ پر لایا جائے اور ان کی سیاست میں اسلامی شعور اور شریعت کا رنگ بھر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہم مولانا شبیر علی صاحب یعنی حضرت تھانوی کے بھتیجے اور آپ کے خادم خاص کے وہ بیانات پیش کرنا چاہتے ہیں جو حضرت تھانوی کی قائد اعظم کو تبلیغ دین اور پاکستان کے بنیادی احساس سے متعلق ہیں۔ مولانا شبیر علی فرماتے ہیں:

”واقعہ مئی ۱۹۳۸ء کا ہے کہ ایک روز دوپہر کا کھانا کھا کر میں اپنے دفتر میں کام

کر رہا تھا جو حضرت حکیم الامت کی سہ درری کے سامنے تھا۔ حضرت حکیم الامت

(مولانا اشرف علی صاحب تھانوی) دوپہر کا کھانا تناول فرما کر قیلو لے (دوپہر

کے آرام) کے لئے خانقاہ میں تشریف لائے۔ اپنی سہ دری میں پہنچ کر مجھے آواز دی، میں فوراً حاضر ہوا اور سامنے بیٹھ گیا۔ حضرت سر جھکائے ہوئے کچھ متفکر تشریف فرما تھے۔ اس زمانے تک پاکستان کا مشہور ریزولیوشن<sup>(۱)</sup> لاہور پاس نہیں ہوا تھا، مگر کانگریس اور ہندوؤں کی ذہنیت بہت کچھ بے نقاب ہو چکی تھی اور عوام و خواص کی زبان پر یہ آگیا تھا کہ ہندو کے ساتھ مسلمان کا نباہ ناممکن ہے، اس لئے غنیمت سلطنت قائم کرنا ضروری ہے۔ غرض حضرت نے دو تین منٹ کے بعد سر اٹھایا اور جوار شاد فرمایا اس کے الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور بھمہ اللہ حافظے میں محفوظ ہیں۔ آپ نے فرمایا:

### حضرت تھانوی اور پاکستان کی پیشینگوئی

”میاں شبیر علی! ہوا کا زرخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جائیں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج سب فاسق، فاجر کہتے ہیں، مولویوں کو تو ملنے سے رہی۔ لہذا ہم کو یہ کوشش کرنا چاہئے کہ یہی لوگ دیندار بن جائیں۔ اور بھائی آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جائے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں۔ یورپ والوں سے معاملات، ساری دنیا سے جوڑ توڑ ہمارے بس کا کام نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیاداروں ہی کا کام ہے، مولویوں کو یہ کرسیاں اور تخت زیب نہیں دیتے۔ اگر تمہاری کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانت دار بن گئے اور پھر سلطنت انہی کے ہاتھ میں رہی تو چشم مارو شن دل ماشاء کہ ہم سلطنت کے طالب ہی نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو وہ دیندار اور دیانتدار لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور بس تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔“

(۱): بورڈ مشہور ریزولیوشن جنی تجویز پاکستان ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ کانفرنس میں پاس ہوا تھا۔ انور

یہ سن کر مولوی شبیر علی صاحب نے عرض کیا کہ ”پھر تبلیغ نیچے کے طبقے یعنی عوام سے شروع ہو یا اوپر کے طبقے یعنی خواص سے۔ اس پر ارشاد فرمایا:

”اوپر کے طبقے سے، کیوں کہ وقت کم ہے اور احساسِ عنی دین مسوکنیم۔

اگر خواص دیندار اور دیانتدار بن گئے تو انشاء اللہ عوام کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔ (روئید تبلیغ ص ۲۰۱) (مکملہ تعمیرِ پاکستان اور غنائے ربانی ص: ۶۹-۷۰)

## آغازِ تبلیغ

حضرت حکیم الامت کی اس تبلیغی جدوجہد کا آغاز ہوا اور آپ نے مسٹر محمد علی جناح کو تبلیغ کے لئے وفد مرتب کیا جس کا امیر علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم کو بنایا۔ مولانا شبیر علی، مولانا عبدالکریم گم تھلوی اور ایک اور صاحب کو منتخب کیا، لیکن علامہ شبیر احمد عثمانی والدہ کی سخت علالت کے باعث تشریف نہ لے جاسکے۔ حکیم الامت نے فرمایا تھا کہ:

”مولانا شبیر احمد ریل کے جس درجے (سیکنڈ فاسٹ) میں سفر کرنا چاہیں ان کے لئے اسی درجے کا ٹکٹ لیا جائے.....

”جناح صاحب سے جو باتیں کرنی ہیں وہ میں نے مولانا شبیر احمد کو خط میں لکھ دی ہیں۔ وہ امیر الوفد بھی ہیں اور گفتگو کا سلیقہ بھی ان کو بہتر آتا ہے.....

(روئید ص ۳)

وفد کی تیاری اور آمد کی اطلاع مولانا شوکت علی اور نواب محمد اسماعیل صاحبان کو بھی دی گئی مگر علامہ عثمانی اپنی والدہ کی سخت علالت کے باعث نہ جاسکے۔ تاہم ان کے لئے یہ شرف کافی ہے کہ اس قسم کی ہر نمائندگی میں خواہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی طرف سے ہو یا مولانا تھانوی کی طرف سے علامہ عثمانی پر سب کی نظر انتخاب پڑتی تھی۔

## پہلی تبلیغی ملاقات

بہر حال وفد گیا ۲۴ دسمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کی قیادت میں پنے پنچا

جہاں لیگ کا اجلاس اسی دن ہونے والا تھا۔ وفد کی قائد اعظم سے پہلی ملاقات ہوئی جس میں ان کو نماز کی تبلیغ کی گئی اور قائد اعظم نے فرمایا:

”میں گنہگار ہوں، خطاوار ہوں، آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں، میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کر دوں گا۔“

## دوسری تبلیغی ملاقات

قائد اعظم کا خیال تھا کہ سیاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ انہوں نے بعض تقریروں میں کہا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے پھر تبلیغی وفد بھیجا اور فرمایا:

”جناب صاحب کی تقریروں میں دیکھا گیا ہے کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ سمجھتے ہیں اس کی بابت ان کو سمجھانا ہے۔ (روند تبلیغ ص ۶)

چنانچہ مولانا شبیر علی صاحب مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا ظفر احمد عثمانی ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو دہلی گئے، ملاقات ہوئی، اور سیاست و مذہب پر گفتگو ہوئی۔ بحث کے بعد قائد اعظم نے فرمایا:

”دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو۔ میری سمجھ میں اب خوب آ گیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں، بلکہ مذہب کے تابع ہے۔“ (روند تبلیغ: ص ۷)

## تیسری تبلیغی ملاقات

تیسری مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے پھر مولانا شبیر علی صاحب کو دہلی بھیجا اس وقت اتفاق سے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ بھی آگئے تھے لیکن قائد اعظم مولانا شبیر علی سے فرمانے لگے:

”حضرت تھانوی نے آپ کو ایک مرتبہ بھی کسی سیاسی امر میں گفتگو کے لئے نہیں بھیجا۔ مجھے آپ کے ذریعہ خاص مذہبی معلومات حاصل ہوئی ہیں جو اور

جگہ نصیب نہیں ہوتیں۔ اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہو تو بیٹھ جائے مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں بڑے شوق سے سنوں گا۔“ (رونداد تبلیغ ص ۸-۹)

### قائد اعظم کا حضرت تھانوی پر اعتماد

ان ملاقاتوں میں قائد اعظم سے اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ ایک روز مولانا شبیر علی صاحب نے فرمایا کہ جناح صاحب ہم انگریزی سیاست سے ناواقف ہیں اس لئے ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں..... اور جتنے ہم سیاست سے ناواقف ہیں شاید اس سے کچھ زیادہ یا اتنے ہی آپ مذہب سے ناواقف ہیں تو جس طرح ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں، مذہبی معاملات میں آپ کو بھی ہماری تقلید کرنی چاہئے۔ اس پر قائد اعظم (یہ سن کر) بہت ہنسے اور فرمایا کہ یہ صحیح ہے۔ پھر فرمایا کہ آپ ہر لیڈر کا کہنا مانتے ہیں؟ میں نے کہا نہیں، ایسی تقلید میں اعتماد شرط ہے، فرمایا:

”بس اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کا بے چون و چرا کہنا مانوں تو میں تیار ہوں۔ آج تک تو میں آپ سے سمجھنے کے لئے بحث بھی کیا کرتا تھا لیکن آج کے بعد میں خاموش بیٹھ کر سنا کروں گا، اور مذہبی معاملات میں جو ہدایات آپ دیں گے ان کو تسلیم کروں گا، کیوں کہ مجھے حضرت تھانوی پر پورا پورا اعتماد ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کا پایہ بہت بلند ہے اور ان کی رائے درست ہوتی ہے۔“ (رونداد ص ۹-۱۰)

### خط و کتابت

حضرت حکیم الامت نے نہ صرف تبلیغی وفد بھیجے، بلکہ قائد اعظم اور دیگر مسلم لیگی لیڈروں کی مذہبی اصلاح خط و کتاب کے ذریعے بھی کرنے کی کوشش کی۔ ”اعلام نافع“ میں فرماتے ہیں:

”میں خود اس (مسلم لیگ) کی اصلاح کا برابر سلسلہ جاری رکھتا ہوں۔ چنانچہ

عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی بھیجے جاتے ہیں  
..... اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوصاً علماء بھی مل کر ان پر زور دیتے  
اور ان کو نماز، روزہ، وضع اسلامی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے تو  
اب تک مسلم لیگ حقیقی معنوں میں مسلم لیگ ہو جاتی۔

(اقتادات اشرفیہ و مسائل سیاسیہ ص: ۸۶)

حکیم الامت کا ایک خط بنام قائد اعظم

حکیم الامت نے اپنے ایک ملفوظ میں فرمایا:

”جس زمانے میں کانگریس، مسلم لیگ سے مفاہمت کی گفتگو کر رہی تھی، میں  
نے ایک خط مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کو اس مضمون کا لکھا تھا کہ  
مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امور دینیہ کی حفاظت نہایت اہم اور بہت  
ضروری ہے۔ اس لئے شرعیات میں آپ اپنی رائے کا بالکل دخل نہ دیں، بلکہ  
علمائے محققین سے پوچھ کر عمل فرمائیں۔“ (اقتادات اشرفیہ و مسائل سیاسیہ ص: ۹۶)

جوابِ قائد اعظم

مولانا اشرف علی صاحب کے خط کے جواب میں قائد اعظم نے لکھا:

”آپ کا والا نامہ ملا۔ بڑی مسرت ہوئی۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میں آپ  
کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ آئندہ بھی آپ مجھے ہدایت  
فرماتے رہیں۔“

یہ خط و کتابت حضرت تھانوی کی طرف سے اردو میں ہوئی تھی لیکن اردو کا ترجمہ خواجہ  
عزیز الحسن مجذوب حضرت کے اخص اور غایت درجہ مقرب خلیفہ کرتے تھے اور اردو نیز  
انگریزی دونوں تحریریں قائم اعظم کے پاس جاتیں۔ قائد اعظم انگریزی میں خط بھیجتے۔ اس  
خط و کتابت کا ریکارڈ مولانا شبیر علی صاحب اور ادھر قائد اعظم کے پاس موجود تھا۔



## قائد اعظم کی حکیم الامت سے عقیدت

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کی ان تبلیغی سرگرمیوں سے قائد اعظم نے زبردست تاثر لیا اور ان کی عقیدت کا جو رنگ قائد کے دل پر چڑھا اس کا اندازہ بمبئی کے ان تاجروں کے بیان سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے ”بمبئی جمعیۃ العلماۓ اسلام“ کی کانفرنس کے موقع پر علامہ شبیر احمد عثمانی مولانا محمد طاہر مرحوم اور مولانا ظفر احمد عثمانی کے سامنے دیا۔ انہوں نے کہا کہ قائد اعظم نے حضرت تھانویؒ کا ذکر کرتے ہوئے علمائے کانگریس کے مقابلہ میں فرمایا:

”مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے جس کا علم و تقدس و تقویٰ اگر ایک

پلڑے میں رکھا جائے اور تمام علماء کا علم و تقدس و تقویٰ دوسرے پلڑے میں

رکھا جائے تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں.....

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص ۹۶)

غرض یہ کہ علمائے دیوبند میں سب سے پہلے مولانا اشرف علی ہیں جو مسلم لیگ کے زبردست مؤید تھے آپ ۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم کے بعد تحریک خلافت ہند و مسلم اتحاد کے زمانے میں واحد شخص ہیں جو اس اتحاد کو بے معنی سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ مسلمانوں کے لئے اس میں بھلائی ہے کہ وہ اپنے لئے علیحدہ حکومت حاصل کریں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر عالم اور ہر لیڈر ہندو مسلم اتحاد کا زبردست مؤید تھا، اس معنی میں مولانا اشرف علی صاحب پہلے شخص ہیں جو نظریہ پاکستان کے حامی تھے۔

## شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور مسلم لیگ

حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب کے بعد سب سے زیادہ مؤثر اور فعال شخصیت علامہ شبیر احمد عثمانی سابق دانش چانسلر دارالعلوم دیوبند کی تھی، جنہوں نے مسلم لیگ میں شرکت کرنے کے لئے پورے ہندوستان میں زبردست حمایت کی اور مسلم لیگ کے پروگراموں میں آسان کیا۔

پہنچا دیا۔ اگر ایک طرف قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح نے لیگ میں شرکت کو سیاسی طور پر مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دیا تو علامہ عثمانی نے مذہب اور سیاست دونوں کی روشنی میں متحدہ ہند کے مسلمانوں کی رہبری کی جس کے نتیجے میں ہندوستان کے مشرق سے لے کر مغرب تک مسلمانوں میں لیگ اور پاکستان کی تائید میں ایک لہر دوڑ گئی۔ ان کے سب سے پہلے پیغامِ کلکتہ نے ”کل ہند جمعیتہ علمائے اسلام“ کی کانفرنس میں وہ صور پھونکا کہ مسلمانوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی، ان کو کل ہند جمعیتہ العلمائے اسلام کا صدر بنایا گیا۔ پھر انہوں نے مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ میں خطبہ صدارت دیا جس میں لیگ کو کامیاب بنانے کی زبردست اپیل کی گئی جس کا نہایت خوشگوار اثر ہوا۔ بعد ازاں علامہ نے بمبئی کی کانفرنس میں اور پھر لاہور جمعیتہ العلمائے اسلام کی کانفرنس میں زبردست خطبے دیئے۔ ملک کا دورہ کیا، تقریریں کیں، صوبہ سرحد میں ریفرنڈم (استصواب رائے) کے لئے دورہ کیا اور بے پناہ کامیابی حاصل کی، جس کا سہرا علامہ عثمانی کے سر رہا۔ بالآخر پاکستان وجود میں آ گیا اور آپ کا مشن شروع ہی سے لیگ میں شرکت سے اسلامی حکومت کا قیام اور اسلامی شریعت کا نفاذ تھا۔ چنانچہ آپ نے پاکستان میں دستور ساز اسمبلی کے ایک رکن رکیں کی حیثیت سے قرارداد مقاصد کے نام سے ریزولوشن پاس کرایا۔

غرض یہ ہے کہ ملکی سیاسیات میں فضلاء دیوبند کے ہی ہاتھوں میں اقتدار کی باگ

رہی۔

### شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور کانگریس

دوسری جانب ہندوستان کی ملکی سیاست میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے تمام عمر آزادی ہند کی خاطر اپنی جانی اور مالی قربانیاں پیش کیں اور کانگریس میں شریک ہو کر ملکی آزادی کے لئے سیاسی جدوجہد میں سردھڑ کی بازی لگادی، جیلوں کی کڑی سختیاں جھیلیں اور فرنگی تشددان کے پائے استتلال کو ذرا بھی لغزش میں نہ لاسکا۔ وہ افرنگی حکومت کو ہمیشہ

پائے استحقار سے ٹھکراتے رہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ پہلے ہندو اور مسلمان دونوں مل کر ہندوستان کو آزاد کرائیں اور پھر مسلمان ممالک کو ہندوستان کو زیر نگین لانے کی دعوت دیں۔ ان کے کارناموں میں زبردست کارنامہ وہ ہے جو ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اس وقت انجام دیا جب بھارت میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا اور چاروں طرف ہندو اور سکھوں کے سفاک ہاتھوں نے مسلمانوں کے قتل سے ہاتھ رنگین کر کے سرزمین ہند کو لالہ زار بنا دیا تھا، اس وقت دیوبند کے فضلاء میں مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی گولیوں کی بوچھاڑ میں جان ہتھیلی پر رکھ کر مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و ناموس کی خاطر دہلی، سہارنپور، مراد آباد میرٹھ کے گلی کوچوں میں پھر رہے تھے۔ انہی میں دیوبند کی ایک اور تعلیم یافتہ ہستی مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی بھی تھے جنہوں نے ملکی سیاسیات میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اب بھی سب جگہ دونوں ملکوں میں دارالعلوم کے فرزند ملکی سیاسیات میں بالادستی رکھتے ہیں۔

### مفکر اسلام مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے نام نامی سے کون واقف نہیں، وہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور شیخ الہند کے نامور شاگرد تھے۔ انہوں نے ”ریشمی رومال کی تحریک“ میں شیخ الہند کے حکم سے کابل کا سفر کیا، وہاں وہ حکومت افغانستان سے اپنے استاد کی تحریک کے نشیب و فراز اور قبائلی علاقے میں حکومت برطانیہ کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ جیسا کہ ہم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے بیان میں لکھ چکے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کو اس تمام تحریک کا پتہ چل گیا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو ہندوستان سے جلاوطن ہونے کا حکم ملا، چنانچہ اپنے استاد کے حکم اور ملک کی آزادی کے لئے انہوں نے بقیہ عمر کا حصہ جلاوطنی میں گزارا، بالآخر کانگریس اور مسلمانان ہندوستان کی زبردست کوششوں سے پھر ہندوستان تشریف لائے اور تھوڑے عرصے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

ہم نے علمائے دیوبند میں سے صرف چند اکابر کا ملکی سیاست کے بارے میں ذکر کیا ہے ورنہ ہزاروں فضلاء دیوبند سیاست ملکی میں حصہ لیتے رہے ہیں اور ان کی زبردست خدمات ملک کے لئے وقف رہی ہیں۔

## علمائے دیوبند کا اعتقادی پہلو

علمائے دیوبند اپنے مذہبی عقائد کے اعتبار سے وہی مسلک رکھتے ہیں جو شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان کا مسلک تھا، اور وہ اہلسنت والجماعت کے طریقے پر تھے۔ اس مسلک کو صحابہ کی جماعت اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کے باعث اہلسنت والجماعت کہا جاتا ہے۔ بد قسمتی سے بعض علمائے ہند نے ان کے بعض اقوال کو لے کر ان کے خلاف وہ زہر اگلا کہ اس کی سمیت ابھی تک بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، حالانکہ بات کچھ بھی نہیں۔ اگر تعصب اور تنگ نظری کی عینک کو اتار کر دیکھا جائے تو ان جملوں کے صحیح معنی اور حقیقی مفہوم کو لیا جائے تو یہ بات آگے نہیں بڑھتی۔

علمائے دیوبند اپنے عقائد و اعمال میں اعتدال اور میانہ روی کا رنگ رکھتے ہیں۔ وہ توحید و رسالت، احکام قرآن و سنت پر سختی سے عامل نظر آتے ہیں۔ البتہ شرک و بدعت کا استیصال اپنا فریضہ اولیں سمجھتے ہیں وہ امام اعظم ابو حنیفہ کے مقلد ہیں۔ اولیائے کرام اور بزرگان دین کی عظمت بلکہ کرامت کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں رشد و ہدایت اور روحانی تعلیم دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ ہے۔ وہ اگر اپنے ظاہری علوم کے اعتبار سے خاندان ولی الہی کے شاگرد ہیں تو روحانی طور پر وہ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھانوی مہاجر کی کے مرید ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما دونوں نے حاجی صاحب کے دست مبارک پر بیعت کی۔ حاجی صاحب کے مریدین میں اس حدیث، بریلوی مکتب خیال اور دیوبندی مسلک کے ہر قسم کے اصحاب کیساتھ لیکن انہوں نے حاجی صاحب کی باطنی دونوں قسم کے بارے میں اپنا جائزہ



حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ہی منتخب کیا اور ضیاء القلوب کے آخر میں تحریر فرمایا:

مولوی رشید احمد سلمہ و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات ظاہری و باطنی اند بخائی من فقیر راقم اور اراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند ..... و طریق سلوک کہ در متن رسالہ (ضیاء القلوب) نوشتہ شد در نظر شماں تحصیل نمایند۔“ (صفحہ ۶۰)

مولانا رشید احمد صاحب سلمہ اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کو کہ تمام ظاہری اور باطنی کمالات کے خزانہ ہیں، مجھ راقم الحروف (حاجی امداد اللہ صاحب) کی جگہ بلکہ مجھ سے بھی زیادہ بلند خیال کریں اور سلوک کا طریقہ جو اس رسالے میں لکھا گیا ان دونوں کی زیر ہدایت حاصل کریں۔“

اس عبارت سے صاف طور پر واضح ہے کہ ان دونوں حضرات کو حضرت حاجی صاحب نے تمام ظاہری اور روحانی علوم کا سرچشمہ فرمایا ہے اور سلوک کی راہوں کو طے کرنے کے لئے ان دونوں کو اپنا قائم مقام بنایا ہے، لہذا حق انہیں حضرات کے ساتھ ہے ورنہ پھر حضرت حاجی صاحب کی رائے پر زبردست اعتراض لازم آتا ہے اور ان کے خیال کی تردید بلاشبہ ہو جاتی ہے۔

اپنے ایک خط مورخہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۱۰ھ میں حاجی صاحب مکہ معظمہ سے تحریر فرماتے ہیں:

”فقیر نے جو پچھان نہ ثانی ضیاء القلوب میں تحریر کیا ہے وہ حق ہے اور بفقیر کا حسن ظن اور محبت بہ نسبت پہلے کے ان کے ساتھ بہت زیادہ ہے۔ فقیر ان کو اپنے واسطے ذریعہ نجات سمجھتا ہے، میں صاف کہتا ہوں کہ جو شخص مولوی صاحب کو برا کہتا ہے وہ میری ذلت کو کھاتا ہے۔ میرے دو بازو ہیں ایک مولوی محمد

قاسم صاحب مرحوم دوسرے مولوی رشید احمد صاحب ایک جو باقی ہے اس کو بھی نظر لگاتے ہیں۔ میرا اور مولوی صاحب کا ایک عقیدہ ہے۔ میں بھی بدعات کو برا سمجھتا ہوں۔ جو مولوی صاحب کا امور دینیہ میں مخالف ہے وہ میرا مخالف ہے اور خدا اور رسول کا مخالف ہے۔“ (الشہاب الثاقب)

اس تحریر کے بعد ان لوگوں کو جو حاجی صاحب سے بیعت رکھتے ہیں علمائے دیوبند کے متعلق لب کشائی کی ذرہ برابر بھی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ گویا شریعت اور طریقت دونوں میں حاجی صاحب کے نزدیک علمائے دیوبند کا مسلک درست اور قابل قبول ہے۔ وہ مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب کو نہ صرف اپنا صحیح جانشین ٹھہراتے ہیں، بلکہ ان کو آخرت میں ذریعہ نجات سمجھتے ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر آخری فیصلہ یہ فرماتے ہیں کہ امور دینیہ میں جو ان کا مخالف ہے وہ میرا مخالف اور خدا اور رسول کا مخالف ہے۔ علمائے دیوبند کے متعلق سنجیدہ اور فہمیدہ طبقے کی بھی یہی رائے ہے کہ علمائے دیوبند کا مسلک درست ہے جیسا کہ آپ علامہ رشید رضا کے بیان میں پڑھ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محل بھی ان کے مسلک کو حق جانتے ہیں، مولانا محمد قاسم صاحب کی تحذیر الناس پر جہاں اور علمائے ہند کے دستخط وہاں اس پر ان کے بھی تائیدی دستخط موجود ہیں۔

حضرت مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف کے مفتی مولانا غلام محمد صاحب کی رائے گولڑہ شریف کے حضرت مہر علی صاحب اپنے زمانے میں روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں، اُن کے مفتی صاحب سے جب علمائے دیوبند کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے تحریر فرمایا:

”واضح ہو کہ علمائے مسئول عنہم شکر اللہ سبعہم ان کی نیات منیٰ بر خیر تھیں  
یعنی یہ لوگ نیک نیت تھے اور اغراض ان کے حسنہ اور افعال ان کے حسنہ تھے۔  
اور چند مسائل کی وجہ سے جو ان کی نسبت زبان درازیاں ہیں ہمیں ان سے



خداوند کریم نے محفوظ رکھا ہے اور آئندہ بھی اس کی درگاہ عالی سے ان کے لئے خیر خواہ ہیں۔“

دیوبند میں چار نوری وجود بقول میاں شیر محمد صاحب شر قیوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت صوفی محمد ابراہیم صاحب قصوری جو کہ حضرت میاں شیر محمد صاحب کے خلیفہ تھے انہوں نے خزینہ معرفت میں میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت میاں صاحب نے فرمایا:

”دیوبند میں چار نوری وجود ہیں ان میں سے ایک شاہ صاحب (مولانا سید

محمد انور شاہ صاحب سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند ہیں۔“

اب نہ تو حضرت مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف کے مفتی اور نہ حضرت میاں شیر محمد صاحب علیہ الرحمۃ دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ ہیں اور نہ ان سے روحانیت ہی میں وابستہ ہیں، لیکن ان حضرات کا تقویٰ علمائے دیوبند کے متعلق صحیح خیال پیش کرنے کا باعث ہوا ہے۔ لہذا ان چار حضرات کے نوری ہونے کا معاملہ ان کے عقائد کی صحت کا سرٹیفکیٹ ہے۔ الغرض دنیائے اسلام کے تمام غیر جانبدار لیڈر، علماء، مفکر، صوفیاء، سُفراء اور سنجیدہ حضرات دارالعلوم اور اس کے مکتبہ فکر کے حامی نظر آتے ہیں۔

علمائے دیوبند کا رنگِ اعتدال

کسی خاص اہل علم کے جلے میں ایک دفعہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تقریر فرما رہے تھے۔ کسی نے اثنائے تقریر میں کہا کہ آپ کی جماعت کو بھی تو ”گلابی وہابی“ کہا جاتا ہے۔ علامہ نے برجستہ جواب دیتے ہوئے فرمایا:

”الحمد للہ کہ آپ ہماری جماعت کو گلابی وہابی کہہ کر اس کی برائی نہیں بلکہ اس کی اچھائی بیان کر رہے ہیں، کیوں کہ گلابی رنگ نہ تو شدید گہرا ہوتا ہے اور نہ بالکل پھیکا، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال کی شان رکھتا ہے۔ علمائے دیوبند بھی نہ



احکام شریعت میں بعض جماعتوں کی طرح سخت ہیں کہ دین کو دشوار اور بوجھل بنادیں اور نہ بعض جماعتوں کی طرح بالکل نرم ہی ہیں کہ دین کو قبر پرستی، ادھام پرستی اور جٹوں اور بھوتوں کی کہانی بنادیں۔ ہاں ان کا ایک معتدل رنگ ہے کہ وہ توحید، رسالت، ولایت کو اپنے مقام پر رکھ کر تجاوز سے پرہیز کرتے ہیں، لہذا ہمیں اپنی گلابیت پر الحمد للہ فخر ہے۔“

یہ ہے علامہ عثمانی کا برجستہ حقیقت افروز جواب جس میں انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کر کے رکھ دیا ہے۔

### گلابی وہابیت

دیوبندی حضرات کو گلابی وہابی کا خطاب ستم ظریفی اور نادانی کا بہترین شاہکار ہے، دراصل وہابی کی نسبت عبدالوہاب نجدی کی طرف ہے جو ایک سخت قسم کا موحد شخص تھا اور بدعات، شرک کا سخت دشمن۔ اس کے معتقدات کے خلاف دنیائے اسلام میں عجیب طرح کا پروپیگنڈا کیا گیا، بالخصوص حکومت برطانیہ کے زمانے میں ہر اس عالم کے خلاف جو توحید میں راسخ، بدعات و شرک اور کافرانہ رسم و رواج کا سخت دشمن اور مجاہدانہ روحانیت رکھتا ہو، اس کو انگریز اپنی سیاست کے ماتحت بعض ہندوستانی مسلمانوں سے وہابی کہلا کر زبردست پروپیگنڈا کراتا تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا محمد اسماعیلؒ صاحب شہید جیسے مجاہدین کے خلاف وہابیت کا ڈھنڈورا پیٹا گیا، پھر یہی القاب و آداب ایک خاص گروہ کی طرف سے علمائے دیوبند کو دیئے گئے۔ البتہ ان کے ساتھ گلابی کا لفظ بڑھا کر اس سختی کا ازالہ کر دیا گیا جو عبدالوہاب میں تھی۔ جب صورت یہ ہو تو بقول علامہ شبیر احمد عثمانی گلابیت ان کے معتدل مسلک کی غمازی کرتی ہے۔ بہر حال علمائے دیوبند کو عبدالوہاب نجدی سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے، بلکہ اس کے کتنے ہی عقائد سے علمائے دیوبند کو اختلاف ہے۔ ملاحظہ ہو شبیر، شمس الحق، صفحہ ۱۰۰، حسین احمد صاحب مدنی۔



## علمائے دیوبند کے عقائد

علمائے دیوبند کے عقائد کے سلسلے میں ہم مختصر عقائد آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، مفتی عزیز الرحمن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند اپنے ایک فتوے میں تحریر فرماتے ہیں:

۱..... ”جملہ سلاسل کے بزرگان دین ہمارے مقتدر پیشوا، ان کی محبت ذریعہ نجات، ان کی کرامت ثابت، ان سے بغض و عداوت، شقاوت و محرومی کی علامت یہ ہمارا اعتقاد ہے۔ ہاں بزرگوں کو نبی نہیں سمجھتے۔ ان کو خدا یا خدائی کا مالک نہیں سمجھتے۔ ان کو دربار خداوندی میں شفع اور وسیلہ جانتے ہیں۔ کارخانہ عالم ان کے قبضہ قدرت میں نہیں سمجھتے کہ وہ جو چاہیں کریں، جس کو چاہیں دیں یا نہ دیں، ہاں جس سے خداوند عالم جس کام کو چاہے لے لے۔ یہ امر ثابت ہے ہم ان کی قبروں کو سجدہ نہیں کرتے۔ خانہ کعبہ کی طرح ان کے مزارات کا طواف نہیں کرتے۔ تعزیوں میں اولاد کے لئے عرضیاں لکھ کر نہیں لگاتے۔ خدائے ذوالجلال کی صفات مختصہ میں کوئی نبی شریک نہیں۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کمالات مختصہ میں کوئی مخلوق شریک نہیں۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے کوئی ولی افضل نہیں۔ ان کے بعد تابعین کا مرتبہ ہے پھر اولیائے امت کا۔ خیار امت (امت کے نیک لوگ) خلاصہ اسلام ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ممتاز فرمایا ہے، ان کی محبت ذریعہ نجات اور عداوت، شقاوت و حرمان کی علامت۔ جس سے سوء خاتمہ کا خوف ہے۔ یہ ہمارے وہ عقائد ہیں جن پر اپنی موت و حیات چاہتے ہیں اور یہ کہ ہمارا اسی پر خاتمہ ہو۔ ہم بالکل سچے کچے حنفی (امام ابوحنیفہؒ کے مقلد) اور سلاسل حضرات اولیاء نقشبندیہ، چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ کے حلقہ گوش ہیں۔ ہاں انہی حضرات کی برکت سے بدعات سے متفر تام (پوری نفرت) ہے (ماخوذ از فتویٰ مفتی عزیز الرحمن صاحب مندرجہ الختم ص ۱۵)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت درود عینِ ثواب ہے  
 مولانا خلیل احمد صاحب اپنی کتاب مہند میں لکھتے ہیں:

”ہمارے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کی کثرت مستحب  
 اور نہایت موجب اجر و ثواب ہے..... لیکن افضل ہمارے نزدیک وہ درود ہے  
 جس کے لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ گو غیر منقول کا پڑھنا  
 بھی فضیلت سے خالی نہیں۔“ (مہند ص ۱۸)

”ہمارا اور ہمارے مشائخ کا عقیدہ ہے کہ سیدنا و مولانا و حبیبنا و شفیعنا محمد رسول  
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق سے افضل اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے  
 بہتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قرب و منزلت میں کوئی شخص آپ کے برابر تو کیا  
 قریب بھی نہیں ہو سکتا۔“ (مہند ص ۲۰)

**ختم نبوت اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ**

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی کتاب تحذیر الناس میں ختم نبوت کی بحیثیت مرتبہ  
 و بحیثیت زمانہ تائید کی گئی ہے لیکن ان کی عبارت کو پورے طور پر پیش نہ کر کے زہر پھیلا یا گیا  
 ہے۔ کسی مولوی صاحب نے مولانا کے زمانے ہی میں آپ سے آپ کی عبارت کا مطلب  
 معلوم کیا تو آپ نے مناظرہ عجیبہ کے نام سے ایک مضمون چھاپ کر شائع کیا۔ چنانچہ  
 مناظرہ عجیبہ میں لکھتے ہیں:

”مولانا حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت زمانی تو سب کے  
 نزدیک مسلم ہے۔“ (ص ۳)

آگے چل کر مولانا محمد قاسم صاحب لکھتے ہیں:

”مولانا خاتمیت زمانی کی تو میں نے توجیہ اور تائید کی ہے، تعلیط نہیں کی، مگر  
 ہاں آپ گوشہ توجہ اور عنایت سے دیکھتے ہی نہیں تو میں کیا کروں۔“ (ص ۳۷)

پھر مولانا لکھتے ہیں:

”حاصل مطلب یہ ہے کہ خاتمیت زمانی سے مجھ کو انکار نہیں، بلکہ یوں کہئے کہ منکروں کے لئے انکار کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ افضلیت کا اقرار ہے بلکہ اقرار کرنے والوں کے پاؤں جمادیئے۔“ (مناظرہ عجیبہ ص ۵۰)

مولانا محمد قاسم صاحب کی نظر میں ختم نبوت کا مخالف کافر ہے اور آخر میں چل کر تو مولانا محمد قاسم صاحب نے صاف لکھ دیا:

”بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں۔ جو اس میں تامل کرے اس کو کافر سمجھتا ہوں۔“ (مناظرہ عجیبہ ص ۱۰۳)

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اُس کا کلام جملہ عیوب سے پاک ہے (مولانا رشید احمد)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اپنے فتوے میں تحریر فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کی ذات جملہ نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔ اس کے کلام میں ہرگز ہرگز کذب کا شائبہ نہیں ہے۔ یعنی جھوٹ کے کروڑوں کے کروڑوں حصے کا بھی احتمال نہیں نکل سکتا۔ آیہ کریمہ ﴿وَمَنْ أَضَدُّ مِنَ اللَّهِ قِيْلًا﴾ (اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون سچا ہو سکتا ہے) پر ہمارا ایمان ہے۔ جو شخص ایسا نہ مانے وہ قطعاً کافر اور ملعون ہے اور مخالف قرآن و حدیث اور اجماع امت کا ہے۔ وہ ہرگز مومن نہیں (بحوالہ شہاب ثاقب مولانا حسین احمد صاحب ص ۱۰۰)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف بڑے بھائی کی طرح فضیلت دینا کفر ہے

علمائے دیوبند کے مولانا غلیل احمد صاحب سہارنپوری مہند میں تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے نزدیک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم افضل البشر، تمام مخلوقات سے اشرف، جمیع پیغمبروں کے سردار، سارے نبیوں کے امام ہیں اور جو اس بات کا قائل ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم پر بس اتنی ہی فضیلت ہے جتنی بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی پر ہوتی ہے تو وہ ہمارے نزدیک دائرۃ اسلام سے خارج

ہے۔ انہی واہیات باتوں کی ہمارے یا ہمارے بزرگوں کی طرف نسبت کرنا بہتانِ عظیم اور کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ (مہند: ص ۲۳-۲۴)

### میلا و شریف اور علمائے دیوبند

مولانا خلیل احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”ذکرِ ولادت شریفہ صحیح روایات کے ساتھ صدق نیت اور اخلاص سے جب کہ وہ محفل میلا و خلاف شرع باتوں سے خالی ہو باعثِ خیر و برکت ہے ہم پر یہ افتراء ہے کہ ہم نفس مولود مبارک کو ناجائز یا بدعت کہتے ہیں۔ (از مہند: ص ۳۲)

### علم غیب اور علمائے دیوبند

علم غیب کے متعلق علمائے دیوبند کا مسلک قرآنی آیات کے ماتحت نہایت واضح ہے۔ وہ غیب کا علم کلی خدا ہی کے لئے مانتے ہیں، البتہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام مخلوق سے بڑھ کر تھا، تمام اولیاء اور تمام انبیاء سے آپ زیادہ علوم کے جاننے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے برابر کسی کا علم نہیں۔

در اصل اللہ کے لئے تو کوئی غیب ہے ہی نہیں۔ اس کے سامنے تو تمام کائنات حاضر ہے۔ ہماری آنکھوں سے جو چیزیں اوجھل اور غائب ہیں اور ہماری معلومات سے جو چیزیں پوشیدہ ہیں وہ سب اللہ کے سامنے ہیں۔ اولیاء اور پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ نے کشف، الہام اور وحی کے ذریعہ جو بتا دیا ہے وہ ان کو معلوم ہے۔ ﴿لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ یعنی اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں غیب کوئی نہیں جانتا۔ اس پر صاف دلیل ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہلوا لایہ ﴿لَوْ كُنْتَ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْمَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسْنِيَ السُّوءُ﴾ یعنی اگر میں غیب جانتا ہوتا تو میں بہت سی بھلائیوں جمع کر لیتا اور مجھے کوئی بھی برائی نہ پہنچتی۔ اور ﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ﴾ اور اللہ کے پاس ہی غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی

نہیں جانتا۔ مذکورہ بالا آیات کے ضمن میں علامہ شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مغیبات کا علم بجز خدا کے کسی کو حاصل نہیں..... ہاں بعض بندوں کو بعض غیوب پر با اختیار خود مطلع کر دیتا ہے..... شریعات کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے کامل ہونا چاہئے اور تکوینیات کا علم خدا تعالیٰ جس کو جس قدر دینا مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اس نوع میں ہمارے حضور تمام اولیٰین و آخرین سے فائق ہیں۔ آپ کو اتنے بے شمار علوم و معارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں جن کا شمار کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔

(پارہ نمبر ۹، سورہ اعراف، رکوع نمبر ۱۳)

علامہ عثمانی نے قرآن کریم کی مذکورہ آیات میں غیب کے متعلق جو لکھا ہے وہی متفقہ میں علماء اور اہل عقائد کا مسلک ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے بڑھ کر ان کے زمانے میں علوم شرعیہ کا جاننے والا کوئی نہ تھا، لیکن دنیا کے جزئی علوم کا علم جن کو تکوینیات کا علم کہا جاتا ہے آپ کو معلوم ہے کہ خضر علیہ السلام کو زیادہ تھا، چنانچہ کشتی کے توڑنے، ایک بچے کو قتل کرنے اور دیوار کو سیدھا کرنے کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام لاعلمی کی وجہ سے سخت حیران ہو کر رہ گئے ہیں۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت ایمان ہے

کسی مسلمان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے یا آپ سے محبت نہیں کرتا عقل و علم کا دیوالیہ پن ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی ؒ و لَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ ؕ کی تفسیر لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

”حضور کی تعظیم و محبت ہی وہ نقطہ ہے جس پر قوم مسلم کی تمام پراگندہ قوتیں اور

منتشر جذبات جمع ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وہ ایمانی رشتہ ہے جس پر اسلامی

اخوت کا نظام قائم ہے۔ (سورہ حجرات)

## یا رسول اللہ اور یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہنا جائز ہے

علمائے دیوبند کے نزدیک یا رسول اللہ اور یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہنا جائز ہے لیکن یہ اعتقاد نہیں رکھنا چاہئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر پکارنے والے کی ندا کو خود سنتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرح ہر ایک بات کو سنتے ہیں۔ اگر کوئی عاشق رسول غلبہٴ عشق و محبت میں فنا فی الرسول ہو کر اتنا غرق تصور ہے کہ گویا حضور کے وہ سامنے حاضر ہے تو یا رسول اللہ کہنا اس کو پھبتا ہے۔ دراصل یہ ایک لفظی نزاع ہے ورنہ اہل حال اور خصوصی عشاق کے لئے یہ مقام حاصل ہے۔ ہر بوالہوس کا یہ مقام نہیں۔ مذکورہ بالا شرط کے ساتھ کہ حضور پکارنے والے کی پکار کو خدا کی طرح نہیں سنتے الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کہنے میں بھی مضائقہ نہیں۔

(شہاب: ج ۷۹-۵۰)

## اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے امداد مانگنا

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے امداد طلب کرنے کا یہ مطلب ہے کہ بزرگوں کو حاجت روا سمجھ کر ان سے درخواست کی جائے کہ آپ ہمیں اولاد، روزی، شفاعت فرمائیں وہ امور جو مستقل طور پر خدائے تعالیٰ کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں مثلاً مینہ برسانا، رزق دینا اور غلہ اگانا، اولاد دینا ان میں سے کسی مخلوق سے اس نیت کے ساتھ دعا کرنا یا مدد مانگنا کہ آپ ہمیں یہ چیزیں عنایت فرمائیں کفر اور شرک ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے فتوے میں اسی طرح لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ (۵۴)۔ یہ بات عقل سلیم کے نزدیک مسلم ہے کہ نفع و نقصان، صحت و بیماری، رزق اور فراخی، موت و حیات سب اللہ تعالیٰ کے قبضہٴ قدرت میں ہیں کسی انسان کے نہیں، البتہ اولیاء اور انبیاء کی دعائیں اور ان کی برکتیں اللہ تعالیٰ سے دعاؤں کے ذریعہ مرادوں کے حصول میں اثر رکھتی ہیں اور بزرگانِ دین کی ارواح طیبہ اور ان کے باطنی فیوض اور برکات سے فائدہ پہنچتا ہے، مگر اس طریقے سے جو اس کے اہل اور خواص کو معلوم ہے نہ کہ اس طریقے سے جیسا کہ عوام کے عقائد میں ہے۔ دُنیا اور دین کے وہ

معاملات جو عام طور پر ایک دوسرے کے تعاون اور مدد سے چلتے ہیں ان میں ایک دوسرے کی مدد طلب کرنے اور تعاون حاصل کرنے کا کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔

## الحاصل

ہم علمائے دیوبند کے عقائد کے بیان کرنے میں کہاں سے کہاں نکل گئے، لیکن چاہتے ہیں کہ ان کے مذہبی عقائد کا ایک مختصر خاکہ اہل انصاف کے سامنے پیش کر دیں اور بتادیں کہ وہ اپنے عقائد میں متقدمین ائمہ اہل عقائد یعنی امام ابو الحسن اشعری کے مقلد ہیں۔ وہ مردوں کو ہی نہیں بلکہ زندوں کو ثواب پہنچانے کے لئے بھی قائل ہیں۔ غربا اور مساکین کو کپڑا پہنا کر، کھانا کھلا کر، اللہ کی راہ میں مال خرچ کر کے جن مردوں کی رُوح کو ثواب پہنچایا جائے وہ اس کے مؤید ہیں، لیکن ثواب کے لئے کسی دن یا وقت کی قید سے وہ اپنے آپ کو آزاد رکھتے ہیں کہ اس میں توسع ہے۔

## اسلام ایک ٹھوس اور متین مذہب ہے

ان عقائد پر قارئین کرام غور کریں اور دل میں انصاف سے فیصلہ فرمائیں کہ علمائے دیوبند کا مسلک اور ان کے عقائد کس قدر صاف اور واضح ہیں۔ وہ اسلام کو ٹھوس، متین اور سادہ مذہب سمجھتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں، وہ نہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جنہوں نے مذہب کو بے پلک سمجھا ہے اور نہ ان لوگوں کے حامی ہیں جنہوں نے مذہب کو ادھام پرستی، لہو و لعب اور کھیل تماشا بنا دیا ہے۔

## تکفیر سے تا بمقدور احتیاط

### اور اسلامی فرقوں سے رواداری

علمائے دیوبند نے حتی الامکان کسی اسلامی فرقے اور کسی مسلمان پر کفر کا فتویٰ لگانے اور کافر کہنے سے اجتناب اور پوری احتیاط کی ہے۔ ان کا مقصد دائرۂ اسلام کو تنگ کرنے کی



بجائے اس کو وسعت دینا رہا ہے، صرف ایک فرقہ قادیانی ہی ایسا فرقہ ہے جو اصولی طور پر اختلاف کے باعث ان کی نظروں میں اسلام سے خارج ٹھہرا، ورنہ وہ کسی جماعت سے ایسا سلوک روا نہیں رکھتے۔ وہ اہل حدیث اور بریلوی عقائد والوں کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ مفتی محمد حسن صاحب امرتسری خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کا بیان ہے کہ حضرت تھانوی نے فرمایا:

”اگر مجھے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے پیچھے نماز پڑھنے کا موقع ملتا تو میں پڑھ لیتا۔“ (بروایت مولوی بہاؤ الحق قاسمی)

خواجہ عزیز الحسن مجذوب ”اشرف السوانح“ میں حضرت تھانوی کی وسعت قلبی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا:

”میں علماء کے وجود کو دین کی بقا کے لئے اس درجہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر سارے علماء ایسے مسلک کے بھی ہو جائیں جو مجھ کو کافر کہتے ہیں (یعنی بریلوی صاحبان) تو میں پھر بھی ان کی بقا کے لئے دُعائیں مانگتا رہوں، کیونکہ وہ بعض مسائل میں غلو کریں اور مجھ کو برا کہیں لیکن وہ تعلیم تو قرآن و حدیث کی کرتے ہیں۔ (اشرف السوانح: ص ۱۸۹)

مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر فرمایا:

”نی زمانہ کفار کا غلبہ ہے، وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کو ہوا دی جائے جس سے انکا کلمہ متفرق ہو کر مزید ضعف پیدا ہو، بلکہ توڑنے کی بجائے جوڑنے کی فکر کی جائے۔“ (سوانح قاسمی، جلد اول: ص ۴۸۰)

ایک اور جگہ کسی شخص کے علم غیب کے مسئلے پر پوچھنے کے بارے میں مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا:

در مسلمانان کیست کہ قرآن درین ایمان او نباید بناءً علیہ  
تا مقدور کسی را کافر نیاید دانست (فیوض قاسمیہ: ص ۴۸)



مسلمانوں میں کون ایسا ہے کہ قرآن کریم پر اس کا دین و ایمان نہ ہو۔ اس لئے جہاں تک  
منجائش ہو کسی کو کافر نہ جانا چاہئے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ رشیدیہ میں تحریر فرماتے ہیں:  
”اور یہ بندہ تو شیعوں کو بھی مسلمان سمجھتا ہے۔ اور کما قال“

جس زمانے میں بہاولپور میں ایک قادیانی مرد اور مسلمان عورت سے نکاح کے سلسلے  
میں طلاق کا معاملہ عدالت میں پیش تھا اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ  
مسلمانوں کی طرف سے وکالت فرما رہے تھے تو قادیانی وکیل نے کہا کہ دیوبندی بریلویوں  
کو اور بریلوی دیوبندیوں کو کافر کہتے ہیں لہذا قادیانیوں کے خلاف کفر کا فتویٰ بھی قابل رد  
ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا:

”میں بطور وکیل تمام جماعت دیوبند کی طرف سے گزارش کرتا ہوں کہ  
حضرات دیوبند بریلوی حضرات کی تکفیر نہیں کرتے۔ اہلسنت وجماعت اور  
مرزائی مذہب میں قانون کا اختلاف ہے اور علمائے دیوبند اور بریلوی میں  
واقعات کا اختلاف ہے قانون کا نہیں۔ چنانچہ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ  
اگر کوئی مسلمان کلمہ کفر کی شبہ کی بنا پر کہتا ہے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔“

(حیاتِ انور: ص ۳۳۳، مقالہ مولانا محمد لاکل پوری)

علامہ شبیر احمد عثمانی ”الشہاب“ میں محمد علی صاحب لاہوری قادیانی پارٹی کے لیڈر کو  
خطاب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”آپ یقین کیجئے کہ ہم کو مرزا صاحب یا کسی ایک کلمہ گو کے کافر اور مرتد ثابت  
کرنے میں کوئی خوشی نہیں ہے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ نہ ہم غیر مقلدین کو  
کافر کہتے ہیں نہ تمام شیعوں کو، نہ سارے نیچریوں کو حتیٰ کہ ان بریلویوں کو بھی  
کافر نہیں کہتے جو ہم کو کافر بتلاتے ہیں۔ اور ہماری تمنا تھی کہ کوئی صورت ایسی  
نکل آتی کہ مرزائیوں کی تکفیر سے بھی ہم کو زبان آلودہ نہ کرنی پڑتی۔ لیکن ان



کر اسلام کو باہمی افتراق سے بچانے کی بے حد سعی کی ضرورت ہے اور اس کی یہی شکل ہے کہ اختلافی مسائل کو قطعاً چھیڑا ہی نہ جائے اور باہمی کشمکش پر وقت صرف کرنے کی بجائے تبلیغ اسلام پر قوتوں کو صرف کیا جائے۔ اور علمی اختلافی مسائل کو عوام میں نہ لاتے ہوئے آپس میں افہام و تفہیم سے طے کر لیا جائے اور اگر وہ اختلافی ہی رہیں تو تعلقات میں رواداری اور بیانات میں اسلام شکاری کو اپنائیں۔ یہی شعار علمائے دیوبند کا رہا ہے اور رہنا چاہئے۔ چنانچہ مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہے اور یہی طریقہ مثلاً حسب ذیل حضرات کے عمل اور زبان سے رہا ہے۔ مثلاً مولانا محمد قاسم صاحب کے متعلق جب جناب پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی سے کسی شخص نے پوچھا تو آپ نے فرمایا:

**مولانا محمد قاسم صاحب ”پیر سید مہر علی شاہ کی نظر میں**

تم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق پوچھتے ہو؟ سائل نے عرض کیا جی ہاں ان ہی کے متعلق۔ حضرت پیر صاحب نے فرمایا: ”وہ حضرت حق کی صفت علم کے مظہر اتم تھے۔“ (بروایت مولانا محمد سعید خلیب مسجد کوہ مری)

اسی طرح کے الفاظ مہر علی شاہ صاحب نے بروایت مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی مرید خاص پیر سید مہر علی شاہ صاحب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اور مولانا اشرف علی صاحب کے متعلق فرمائے جو حسب ذیل ہیں۔

”مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا زمانہ میں نے نہیں پایا، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی زیارت ایک دفعہ کی ہے مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک دفعہ زیارت کی ہے اور ایک دفعہ وعظ بھی سنا ہے اس سے زیادہ ان حضرات کے ساتھ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا مگر میرا اعتقاد ان بزرگوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ سب حضرات علمائے ربانین اور اولیاء امت محمدیہ میں سے تھے۔ احقر کو بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی ہے مگر میرا

کر اسلام کو باہمی افتراق سے بچانے کی بے حد سعی کی ضرورت ہے اور اس کی یہی شکل ہے کہ اختلافی مسائل کو قطعاً چھیڑا ہی نہ جائے اور باہمی کشمکش پر وقت صرف کرنے کی بجائے تبلیغ اسلام پر قوتوں کو صرف کیا جائے۔ اور علمی اختلافی مسائل کو عوام میں نہ لاتے ہوئے آپس میں افہام و تفہیم سے طے کر لیا جائے اور اگر وہ اختلافی ہی رہیں تو تعلقات میں رواداری اور بیانات میں اسلام شکاری کو اپنائیں۔ یہی شعار علمائے دیوبند کا رہا ہے اور رہنا چاہئے۔ چنانچہ مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہے اور یہی طریقہ مثلاً حسب ذیل حضرات کے عمل اور زبان سے رہا ہے۔ مثلاً مولانا محمد قاسم صاحب کے متعلق جب جناب پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی سے کسی شخص نے پوچھا تو آپ نے فرمایا:

**مولانا محمد قاسم صاحب ”پیر سید مہر علی شاہ کی نظر میں**

تم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق پوچھتے ہو؟ سائل نے۔

عرض کیا جی ہاں ان ہی کے متعلق۔ حضرت پیر صاحب نے فرمایا: ”وہ حضرت

حق کی صفت علم کے مظہر اتم تھے۔“ (برایت مولانا محمد سعید خطیب مسجد کوہ مری)

اسی طرح کے الفاظ مہر علی شاہ صاحب نے بروایت مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی مرید خاص پیر سید مہر علی شاہ صاحب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اور مولانا اشرف علی صاحب کے متعلق فرمائے جو حسب ذیل ہیں۔

”مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا زمانہ میں نے نہیں پایا، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی زیارت ایک دفعہ کی ہے مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک دفعہ زیارت کی ہے اور ایک دفعہ وعظ بھی سنا ہے اس سے زیادہ ان حضرات کے ساتھ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا مگر میرا اعتقاد ان بزرگوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ سب حضرات علمائے ربانین اور اولیاء امت محمدیہ میں سے تھے۔ احقر کو بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی ہے مگر میرا



اعتقاد یہی ہے اور اس اعتقاد کے اختیار کرنے کا سبب ان کی تصنیفات کا مطالعہ اور استفادہ اور قبول عام ہے۔

مولانا اشرف علی مجدد تھے

بالخصوص مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم کی خدمات طریقت پر نظر کر کے شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہیں۔

(چراغِ سنت: ج ۲۰، مصلحہ مولانا سید فردوس علی شاہ صاحب)

## علمائے دیوبند اور ادبی خدمات

ہم نے اپنے اس مقدمے میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے علما کے کارناموں، ان کی تصنیفات، تبلیغ شریعت اسلام اور دینی خدمات، علم و عمل، سیاسیات و عقائد کے متعلق جس تفصیل سے بیان کیا ہے ان کو پڑھ کر کوئی بھی انصاف پسند اہل علم دارالعلوم اور اس کے فضلا کی تحسین و تعریف اور حق پسندی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ واقعی دارالعلوم دیوبند تہا وہ ادارہ ہے جس کے سر دنیائے اسلام کی دینی خدمات کا سہرا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے عربی، فارسی اور اردو زبان کی اپنی تصنیفات کے ذریعے ہندوستان کے علما میں سب سے زیادہ خدمات انجام دی ہیں اور مختلف علوم و فنون پر عربی، فارسی اور اردو میں کتابیں لکھیں۔

## عربی زبان کی خدمات

دارالعلوم نے علم حدیث وغیرہ کی عربی زبان کے ذریعہ جو بیش بہا خدمات انجام دیں، ان میں مولانا سید انور شاہ صاحب کی فیض الباری شرح بخاری، العرف الشذی شرح ترمذی، حاشیہ ابن ماجہ، اکفار المحمدین، مرقات الطارم، نیل الفرقدین، بسط الیدین اور عربی قصائد۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے بخاری شریف کے آخری چھ پاروں کے عربی میں حواشی اور بعض عربی خطوط۔ مولانا ظلیل احمد صاحب سہارنپوری کی البذلۃ المجہود شرح ابی داؤد عربی



میں۔ مولانا حبیب الرحمن عثمانی کے عربی قصائد اور معجزات لامیہ۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کی فتح الہم شرح مسلم تین جندوں میں۔ مولانا اعجاز علی صاحب شیخ الادب دارالعلوم کے دیوان متنبی، دیوان حماسہ، کنز الدقائق، شرح نقایہ، اور نور الایضاح کے عربی حواشی اور عربی لٹریچر میں فتح العرب۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب شیخ الفلسفہ بلیاوی کا حاشیہ مسلم مولانا محمد عماد الدین انصاری کا حاشیہ مرقات عربی میں۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کی شرح مشکوٰۃ پانچ جندوں میں۔ حاشیہ مقامات حریری اور بعض عربی قصائد۔ مفتی محمد شفیع صاحب کی خاتم النبیین۔ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کی شرح ترمذی زیر طبع، فتح الغفر سوانح علامہ سید محمد انور شاہ اور عربی قصائد۔ مولانا عبدالرشید کی شرح ابن ماجہ۔

## فارسی زبان

جس دور میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی وہ اگرچہ فارسی کے زوال کا دور تھا تاہم فارسی زبان اچھی خاصی مروج تھی لیکن زیادہ تر اب اردو زبان میں کتابیں لکھی جا رہی تھیں۔ تاہم آغاز دارالعلوم سے اب تک وہاں فارسی کی اعلیٰ کتابوں کی تعلیم بھی ہوتی ہے، البتہ تصنیفات کا ذخیرہ فارسی میں زیادہ نہیں ہے، اگر ہے تو مختصر مثلاً حاجی امداد اللہ صاحب کی کتابوں میں ضیاء القلوب اور بعض دیگر رسالے نیز فارسی کلام حاشیہ مثنوی مولانا جلال الدین رومی اور ان کے فارسی مکتوبات، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی امداد السلوک، مولانا محمد قاسم صاحب کے بعض رسائل، فارسی خطوط اور قدرے فارسی کلام، مولانا اشرف علی صاحب کی فارسی میں مثنوی زیروم، مولانا اعجاز علی صاحب کا فارسی میں نور الایضاح کا حاشیہ، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کی معرکہ آراء کتاب خاتم النبیین اور ان کے بعض فارسی نعتیہ اور غیر نعتیہ قصائد۔

## اردو زبان اور علمائے دیوبند

اگر اردو زبان کی خدمات پر غور کیا جائے تو علمائے دیوبند نے اس سلسلے میں بھی بیش بہا

خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ علمائے دیوبند میں بہترین نثر نگار، بہترین شعرا بہترین ایڈیٹر اور نامور ادیب گذرے ہیں اور ہر دور میں اہل قلم مصنفین نے تصنیفات، مقالات مضامین سے اردو زبان کو مالا مال کیا ہے۔

## دورِ اول

اگر ہم دورِ اول سے اس ادارے کے اہل ادب کا جائزہ لیں تو ہمیں حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس دور کی ابتداء کرنا برکت کے طور پر مناسب ہوگا۔ اس دور میں حاجی صاحب کی اردو شاعری اور اردو خطوط، مولانا محمد قاسم صاحب کی اردو شاعری اور اردو مکتوبات، مولانا محمد یعقوب صاحب شیخ الحدیث اول دارالعلوم کی اردو شاعری اور ان کے اردو خطوط کا مجموعہ بنام منشی محمد قاسم صاحب، مولانا ذوالفقار علی صاحب والد مرحوم شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی اردو شاعری اور دیوانِ حماسہ، دیوانِ مثنوی، قصیدہ بردہ، قصیدہ بانٹ سعاد، سبجہ معلقات کے اردو ترجمے اور شرحیں، مولانا فضل الرحمن والد مرحوم مولانا شبیر احمد عثمانی دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ایک اور اس کے آخری سرپرست کی اردو شاعری ان حضرات پر پیش نظر کتاب میں ان کی زندگی کی پوری تصویر آپ کے سامنے آرہی ہے۔

## دورِ دوم

دوسرے دور میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی اردو شاعری، مولانا اشرف علی صاحب، مفتی عزیز الرحمن صاحب اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب کا شعری ذوق بھی قابلِ داد ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم صاحب کی یاد میں

لکھتے ہیں۔

قبر سے اٹھ کے پکاروں جو رشید و قاسم      بوسہ دیں لب کو مرے مالک و رضواں دونوں  
بحر موانِ طریقت کے ہیں دو چشمہ فیض      گلبنِ شرع کے ہیں سنبل وریحانِ دونوں

بحرِ خار ہیں، لیکن نہیں ساحل کا پتہ ابرِ رحمت ہیں مگر ہیں گہرا فشاں دونوں  
مولانا حافظ محمد احمد صاحب سابق مہتمم مولانا فضل الرحمن صاحب کے مرثیے میں لکھتے

ہیں۔

صدحیف کہ روشن دل دانا ز جہاں رفت ہیبت کہ سد مایہ دانش زمیاں رفت  
از بانی واسلاف دریں مدرسہ باقی دوست ہمیں فضل، اخوس ہماں رفت  
اور پھر حافظ صاحب مرحوم اردو مرثیے میں اس طرح خامہ طراز ہیں۔

خراب حیف ہوا، بوستانِ فضل و کمال وہ نخلبند معانی کدھر گیا ہے ہے  
بقیۃ السلف الصالحین وادبلا بس ایک دم تھا وہ بھی کدھر گیا ہے ہے  
جناب مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا عبدالباقر رئیس حیدر آباد دکن محسن  
دارالعلوم کی وفات پر لکھتے ہیں۔

عبد باقر آں کہ از علم و ورع داشت حفظے وافرے مالا کلام  
بخشے زیں دایر فانی در گذشت دایغِ فرقت داد بہر خاص و عام  
من علیہا فان و بقیۃ وجہہ قد کفی بالموت و عظام یا ہمام  
اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اٹھارہ  
سال کی عمر میں فارسی میں مثنوی زیر و بم لکھی جس کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں۔

عشق نورے ہست ز انوارِ خدا عشق سرے ہست ز اسرارِ خدا  
عشق گرداند ازیں دآں غنی روح و قالب را بخشد روشنی  
عشق می سازد زماں و جاں جدا عاشقان را نیست مطلب جز خدا

دو ربوہ سوم

تیسرے دور میں دارالعلوم کا ادبی ذوق اور بھی زیادہ بلند نظر آتا ہے۔ اس دور کے ممتاز  
اردو انشاء پرداز جس نے اہل ادب سے بہترین اردو نثر نگاری کا تمغہ حاصل کیا علامہ شبیر احمد



عثمانی ہیں۔ انہوں نے دور قدیم کی روایات کو شگفتہ اردو میں پیش کر کے اور اسلامی ادب کا نمایاں کردار ادا کر کے اپنی مادر علمی کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے ہیں، وہ کبھی کبھی شعر و سخن کی طرف بھی آتے تھے مگر جھجکتے جھجکتے مولانا اشرف علی صاحب کامرشیہ لکھتے ہوئے فرمایا۔

قلب و جگر نگار ہیں فریاد کیا کریں ہمد بیان گلشن برباد کیا کریں  
غم ہی وہ غم پڑا ہے کہ اللہ کی پناہ درمان راحت دل ناشاد کیا کریں

اسی دور میں بعض بعض ہستیوں کی طرف ہم نے ادبی حیثیت سے نہیں دیکھا ورنہ میاں صاحب مولانا سید اصغر حسینؒ جیسے فرشتہ سیرت ابوداؤد کے معلم جب ”مصیبت نامہ“ جیسی ٹریجڈی (المیہ) لکھتے ہیں اور اس میں جا بجا اپنے عبرت ناک اور درد انگیز اشعار موقع بہ موقع درج کرتے جاتے ہیں تو اردو زبان و خطارے لینے لگتی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی اسارت مالٹا سے پانچ سال کے بعد دیوبند واپسی پر لکھتے ہیں۔

آئیے تشریف لانا ہے تو جلد آجائیے ورنہ حضرت اب تو اپنا خاتما ہونے کو ہے  
آ رہے ہیں، دیکھ کر جن کو خدا آتا ہے یاد دیکھنا ہر گھر میں اب ذکر خدا ہونے کو ہے  
ہو چکی ظلمت، نظر آئے گا اب آبِ حیات اب مرا خضر طریقت رہنما ہونے کو ہے  
کہتے ہیں آئیں گے حضرت کلبہ، احزان میں رشک قالیں آج میرا بوریا ہونے کو ہے۔

میاں صاحب کا پہلا شعر ہائے کتنا درد انگیز اور سہل متمتع ہے کہ نظم کی نظم اور نثر کی نثر ہے۔

شیخ الادب مولانا اعجاز علی صاحب مرحوم اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں ذوق سخن کے مالک ہیں، اردو نثر میں جب کوئی مضمون لکھتے ہیں تو سادہ اور خشک عبارت کے ساتھ ساتھ تحریروں میں کہیں رنگ بھی بھرتے جاتے ہیں۔ غیر معمولی متانت اور ثقاہت کے نیچے ان کی شعری طبعیت دب کر رہ گئی ہے ورنہ اگر ان کے جاذبات شعری کو کرید کر دیکھا جائے تو اس میں چنگاریاں چمکتی نظر آئیں گی۔ منتہی کے اشعار کی شرح کرتے کرتے وہ اردو کے ہم معنی شعر لکھتے ہیں اور مثلاً یوں کہتے ہیں۔



درِ دل سے عجب اک لطف ہے حاصل ہوتا

سر سے لے پاؤں تک کاش کہ میں دل ہوتا

تو ان چنگاریوں کے چکارے صاف نظر آتے ہیں۔ یادِ یوبند کی تعریف کے متعلق  
اپنے ایک مسدس میں لکھتے ہیں۔

مخزنِ علم بنی آنکھوں کا تارِ دیوبند معدنِ فضلِ ہدیٰ، ہم سب کا پیارا دیوبند

ہنچہ شیطاں سے چھٹنے کا سہارا دیوبند دیوبندی ہم ہیں اب اور ہے ہمارا دیوبند

ہم کو کیا گر میر و مرزا پر کسیکو ناز ہے

نسبتِ دہین ہمیں تو مایہِ اعزاز ہے

مولانا سرانج احمد صاحب مرحوم مشکوٰۃ شریف کے مخصوص استاذ اور ادبی مذاق کے  
دلدادہ اردو اور فارسی شاعری کا ذوقِ سلیم رکھتے تھے اور دونوں زبانوں میں کہتے تھے، اور  
خوب کہتے تھے۔ مثلاً جب شیخ الہند مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند آنے والے ہیں تو موصوفیوں  
دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔

مالٹا سے اب نسیم جانفزا آنے کو ہے دل میں جاں آنے کو ہے عیسیٰ وا آنے کو ہے

کیوں کلی کو بے کلی پیدا ہوئی ہے آجکل چاک ہر ایک گل نے کسی کدنج میں کی ہے قبا

کس کا صدمہ ہے کہ سنبھل کھا رہا ہے بیچ و تاب کس کے غم سے ہو گیا ہے زرد رنگ اب کہہ رہا

لیتے لیتے ہچکیاں سوکھی ہے سون کی زباں

روتے روتے چشمِ زگس میں ہے اُترا موتیا

کیا اشعار کہے ہیں۔ بالکل استادِ ذوق کا وہ رنگ ہے جو ظفر کی صحت پر لکھا تھا جس کا  
مطلع ہے۔

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

اسی دورِ سوم میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب "احقر فارسی اور عربی کے زبردست

شاعر ہیں۔ عربی و فارسی نظم میں مولانا محمد قاسم صاحب کی طرح تقریر کرنے پر قادر ہیں۔ نعت کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے آں کہ ہمہ رحمت مہدۃ قدیری      باراں صفت و بحرِ سَمَتِ ابرِ مطیری  
معراج تو کرسی شدہ وسیع سادات      فرشِ قدمت عرشِ بریں سدرہ سریری  
بر فرق جہاں پایہ پائی تو شدہ ثبیت      ہم صدرِ کبیری وہمہ بدرِ منیری  
ختمِ رسل و نجمِ سُبُلِ صبحِ ہدایت      تھا کہ بشیری تو والحقِ نذیری  
آدم بھفِ محشر و ذریتِ آدم      در ظلِ لوائت کہ امامی و امیری  
یکتا کہ بود مرکز ہر دائرہ یکتا      تا مرکزِ عالم توئی بے مثل و نظیری  
کس نیست ازیں امت تو آنکہ چو احقر  
باروی سیہ آمدہ و موی زریری

### دورِ چہارم و پنجم

تیسرے دور کے بعد چوتھا اور پانچواں دور ہے۔ اس دور میں دیوبند کے علما میں امتیازی طور پر انشا نگاری اور شعر و سخن سے ذوق رکھنے والوں میں مولانا محمد طیب صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا بادر عالم صاحب، مولانا احسان اللہ خاں تاجور مرحوم، مولانا حفظ الرحمن مرحوم، مولانا محمد طاہر مرحوم، مفتی عتیق الرحمن، مولانا منظور احمد نعمانی، پروفیسر سعید احمد، مولانا عبدالوحید صدیقی، مولانا محمد میاں، مولانا حامد الانصاری اور پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی وغیرہم ہیں۔

مولانا محمد طیب صاحب اردو فارسی میں کہتے ہیں۔ مولانا عبدالباقر کے مرثیے میں لکھتے ہیں۔

خوگرِ عیش و طرب آج آہ اپنا دل نہیں      دور ہواے شادمانی میں تیرے قابل نہیں  
ہوں وہ بخرم کہیں جس کا کوئی ساحل نہیں      دل میں ہے اک دردِ شوقِ شرکتِ محفل نہیں

کیا نقابِ رُخ نہیں ہے موتِ محوید کی  
ناامیدی اک سزا ہے گشتِ امید کی

مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مفتی اعظم پاکستان اور سابق مدرس دیوبند لکھتے ہیں۔  
قیامت کیا ہے یارب اب قیامت کیوں نہیں آتی گہن میں تو بیک دم آگے شمس و قمر دونوں  
کسے تھا مومن کہ ٹکڑے ہو گئے قلب و جگر دونوں  
بجائے اشکِ خوں بر سار ہی ہیں چشمِ تردونوں

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم ”نغمہ ہمت“ کے عنوان پر لکھتے ہیں۔

چاہتا ہوں تجھے افلاک سے اونچا کر دوں چرخِ والوں سے بھی رتبہ تر ابلا کر دوں  
بحرِ گیتی کا بنادوں تجھے یکتا موتی چشمِ عالم کا تری ذات کو تارا کر دوں  
زخمِ جو دل پہ ترے ہے وہ ذرا اوچھا ہے آرزو ہے کہ اسے اور بھی گہرا کر دوں  
غلغلہ لے کے بڑھوں نعرۂ توحید کا میں  
کرۂ ارض پہ ایک زلزلہ برپا کر دوں  
پروفیسر دیال سنگھ کالج مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی مرحوم فاضل دیوبند  
لکھتے ہیں۔

نئی طرزِ ستم ایجاد کر کے  
ہوئے چمپت مجھے برباد کر کے  
سدھارے وہ تو بولی دل کی حسرت  
پیارے پھر بھی آنا یاد کر کے

مولانا محمد طاہر مرحوم برادرِ خرد مولانا محمد طیب صاحب شیخ الہند کی یاد میں لکھتے ہیں۔  
انتظارِ دید میں کیا جانے کیا ہونے کو ہے  
حسرتوں میں دل کی اب محشرِ پیا ہونے کو ہے

آپ کی صورت پہ صدقے آپ کے رخِ پر فدا  
اپنا اور بیگانہ، چھوٹا اور بڑا ہونے کو ہے  
مفتی عتیق الرحمن صاحب شاہ عبدالرحیم صاحب کے مرثیے میں لکھتے ہیں۔  
یہ وہ صدمہ ہے کہ جودل سے نکل سکتا نہیں  
یہ وہ غم ہے جودل بے تاب کی جاں ہو گیا  
میں ہی کچھ تنہا نہیں ہوں یہ قرار دردِ ہجر  
ایک عالم ہے جو اس غم سے پریشاں ہو گیا  
پروفیسر محمد انوار الحسن انور شیر کوٹی اسلامیہ کالج لائل پور لکھتے ہیں۔

زندگی کے ساز کی اقبل تو آواز ہے کس بلندی پر تخیل کی ترے پرداز ہے  
تیرے نالوں نے دیا ہم کو سراغِ زندگی تیری آہوں نے کیا روشن چراغِ زندگی  
تیرے نغموں نے کیا شاداب باغِ زندگی تو نے پہنچایا بلندی پر دماغِ زندگی  
تو نے گرمایا فغاں سے مرد مومن کا لہو  
تیرے نغموں نے کیا پیدا جہانِ رنگ و بو  
غرض یہ کہ علمائے دیوبند نے اردو فارسی اور عربی زبان کی بھی بے حد خدمت کی ہے  
لیکن ان کا میدان چونکہ تبلیغِ شریعت اور اعلائے دین اسلام تھا اس لئے وہ بزمِ ادب میں بیٹھے  
نظر نہیں آتے اور نہ ہی ان کی ان خدمات کے لئے کوئی تذکرہ ترتیب دیا گیا جو ان کے ان  
کارناموں کی یاد دلاتا اور وہ خود بھی گنما می کو اپنے لئے فخر سمجھتے رہے۔

وجہ تصنیف مشاہیر دیوبند

انہی امور کے پیشِ نظر میں نے علمائے دیوبند کے مشہور بزرگوں کا تذکرہ مرتب کرنے  
کا ارادہ کیا ہے جس کی پہلی جلد آپ کے پیشِ نظر ہے۔ اس میں حضرت حاجی امداد اللہ  
صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند،



مولانا محمد یعقوب صاحب اولین شیخ الحدیث، مولانا ذوالفقار علی صاحب رفیق بنائے دارالعلوم اور مولانا فضل الرحمن صاحب یکی از بنیان دارالعلوم کا ذکر اور ان کے حالات زندگی، علمی و عملی، روحانی و تصنیفی، ادبی، نثری اور شعری خدمات غرض کہ کسی شخصیت کے متعلق پوری زندگی کو گھیرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح دوسری جلد حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا اشرف علی، مفتی عزیز الرحمن صاحب، مولانا حافظ محمد احمد صاحب، مولانا حبیب الرحمن صاحب وغیرہم پر مشتمل ہوگی تیسری جلد میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا حسین احمد صاحب، مولانا اعجاز علی صاحب وغیرہم کا ذکر ہوگا۔ چوتھی جلد میں چوتھے دور کے علماء مولانا محمد طیب صاحب، مولانا محمد شفیع صاحب، مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہم کا تذکرہ ہوگا اور پانچویں جلد میں اب تک کے پانچویں دور کے مشاہیر ہوں گے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ تذکرے میں صرف انہی حضرات کو لیا ہے جو دارالعلوم کے سرپرست، بانی، مدرس یا طلبہ رہے ہیں اور جن کا دارالعلوم سے ملازمت کا تعلق رہا ہے، اور وہ کسی رنگ میں عمومی یا خصوصی شہرت کے مالک ہیں۔

## آغازِ تصنیف

جنوری ۱۹۵۳ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کی بات ہے جب راقم الحروف نے اپنے محترم مولانا ازہر شاہ صاحب (ابن شیخ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب) ایڈیٹر رسالہ دارالعلوم کی فرمائش پر ”تذکرہ ادبائے دیوبند“ کے نام سے تقریباً ۱۵-۱۶ مضامین لکھے اور جو ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء کے رسالوں میں شائع ہوئے لیکن ان مضامین کو میں نے اس عرصے میں وقتاً فوقتاً ہا کر کتابی شکل میں سیر حاصل تبصروں کے ساتھ لکھا اور اس پہلی جلد کو غالباً ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان ختم کر لیا اور کوشش یہ کی کہ صرف ادب پر ہی ان حضرات کے متعلق کچھ لکھنا ہے ادبی ہے اس لئے ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ اصل اسلامی اور دینی، روحانی و اخلاقی خدمات پر بھی ادب کے ضمن میں ان حضرات کے متعلق حتیٰ

المقدور تفصیل سے لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کے چھپنے میں نامساعد حالات کے باعث دیر ہوتی چلی گئی بعض دوستوں نے میرے شائع شدہ مضامین سے فائدہ اٹھایا اور ایک صاحب نے ”علمائے دیوبند اور ادب“ کے نام سے کتابچہ لکھ مارا۔ کاش وہ جلدی نہ کرتے اور مجھے کتاب شائع کرنے کا موقع دیتے۔ دوسری کتاب ”مشائخ دیوبند“ کے نام سے شائع ہوئی، مگر اس کتاب کا موضوع میرے نقطہ خیال اور وسعت خیال سے مختلف ہے۔ تاہم میرے مضامین کے بعض حصوں سے اس میں بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے ہماری یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔

شکریہ

میں اس مقام پر پہنچ کر استاد محترم حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ ان کی مساعی جلیلہ سے یہ کتاب منصفہ شہود پر آرہی ہے اور ساتھ یہ حاجی محمد شفیع صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کی طباعت کی طرف توجہ کی۔

والحمد للہ رب العلمین۔ والسلام علی رسولہ النبی الکریم۔

محمد انوار الحسن شیر کوٹی

پروفیسر اسلامیہ کالج لائلپور

۱۱/۱۲/۱۳۸۲ھ، ۶/۷/۱۹۶۳ء بروز ہفتہ ۱۲ بجے دوپہر

# مشاہیر دیوبند

## (جلد اول)

### حیاتِ امداد

حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی، مکی، رحمۃ اللہ علیہ کے تاریخی، علمی، ادبی روحانی اور مجاہدانہ حالات کا دلچسپ اور معلومات افزا مرقع اور ان کی تصنیفات، اردو فارسی انشا نگاری اور فن شعر و سخن پر فنکارانہ تبصرے۔

محمد انوار الحسن پروفیسر

## نذرِ عقیدت

میں سید الطائفہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات سے متعلق مشاہیر دیوبند کا یہ گلدستہ عقیدت ان کی بارگاہِ اقدس میں پیش کر کے شرفِ سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں جن کے انوار کے چمکارے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور پھر مرشدی مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری سے مجھ تک پہنچے ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر ان سب حضرات کی قبروں کو نور سے بھر دے اور قیامت میں ان اولیاء کا ساتھ نصیب فرمائے اور میری اس ناچیز کوشش کو ذخیرہ آخرت فرمائے۔ (آمین)

محمد انوار الحسن قاسمی





نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

# مشاہیر دیوبند

بابِ اوّل

پہلا دور

حاجی امداد اللہ صاحب امداد تھا نوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

ولادت ۲۲ صفر ۱۳۳۳ھ تا وفات ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۱۳ء تا ۱۸۹۶ء

## حمد

اے مرے معبود اے میرے الہ ہے تو ہی مقصودِ دل بے اشتباہ  
 اے مرے محبوب، اے میرے حبیب ہوں غمِ دوری سے مرنے کے قریب  
 ہجر سے زیادہ مصیبت کچھ نہیں اس سے بہتر ہے کہ مر جاؤں کہیں  
 یا الہی مجھ کو مجھ سے دور کر تاکہ دیکھوں تجھ سے تجھ کو، اک نظر  
 یا الہی تو ہے خلاق جہاں مالکِ دارین و شاہِ انس و جاں  
 گرچہ دو عالم سے تو ہے بے نیاز لیک بے چاروں کا تو ہے چارہ ساز  
 دُگلیر بے کساں ہے تیری ذات  
 مستغیثِ عاجزاں ہے تیری ذات

آسرا بے آسروں کا ہے تو ہی بے سہاروں کا سہارا ہے تو ہی  
 اس سے زیادہ اب تمنا کچھ نہیں آستاں تیرا ہو اور میری جہیں  
 تجھ کو ہی تجھ سے طلب کرتا ہوں میں اور کی خواہش نہ اب کرتا ہوں میں  
 فکرِ باطل، دل سے میرے دور کر عشق کے انوار سے پُر نور کر  
 دو جہاں سے کر کے مجھ کو بے نیاز دولتِ دیدار سے اپنی نواز  
 کر عطا ایسی تپشِ دل کو مرے ماسوا جاناں کے سب کو پھونکدے

ختم کر کے یہ مناجات کنو  
 کر وسیلہ ذاتِ پیغمبر کو تو

## نعت

حامد و محمود و ممدوح خدا احمد مرسل محمد مصطفیٰ  
 زینت تاج رسالت ہے وہ ذات رونقِ تختِ نبوت ہے وہ ذات  
 عزتِ شہائی و فخرِ سروری شانِ بخشِ مسندِ پیغمبری  
 روشنی عرش و نورِ لامکاں شمعِ بزمِ عالم کون و مکاں  
 راحت و روح و روانِ کائنات زندگی پرور و جانِ حیات  
 پڑھ تو امداد اس پہ صلوات و سلام  
 آل اور اصحاب پر اس کی تمام

## آغازِ کتاب

ہم نے اس کتاب کا آغاز، حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذکرِ اوّل میں ان ہی کی نوشتہ حمد و نعتِ خدا و رسول سے کیا ہے۔ حاجی صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند کے پیرِ طریقت اور مرشدِ ہدایت تھے۔ اس کتاب کا مقصد دارالعلوم دیوبند کے علماء و فضلاء اور متعلقین کے سیاسی، علمی، مذہبی اور اصلاحی کارناموں اور بالخصوص ادب کو اجاگر کرنا ہے جو گمنامی کے گوشوں میں پڑے ہوئے اہل علم کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ آپ کے تذکرہ کا دارالعلوم اور اس کی بنیاد سے ایک گہرا اور ابتدائی تعلق ہے جس کا پتہ مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے سابق اور دوسرے مہتمم اور حاجی صاحب کے درمیان تبادلۃ الفاظ سے چلتا ہے۔ علمائے حق کے فاضل مصنف لکھتے ہیں:

”قیام دارالعلوم کے بعد اسی جماعت کے ایک بزرگ (مولانا رفیع الدین صاحب) جب حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ میں حاضر ہوئے تو وہاں سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ سے عرض کیا۔ ”ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا

ہے اس کے لئے دُعا فرمائے۔

حضرت حاجی صاحب نے دلچسپ انداز میں فرمایا:

”سبحان اللہ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقاتِ سحر میں سر بسجود ہو کر گزر گزرتی رہیں کہ خداوند ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ اسلام کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ انہی سحر گاہی دُعاؤں کا ثمرہ ہے یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانقدر کو یہ سرزمین لے اڑی۔“ (علمائے حق ص: ۱۷ جلد اول)

اس لئے دارالعلوم کا وجود دوسرے صاحب دلوں کی رگڑی ہوئی پیشانیوں کے علاوہ خاص طور پر چونکہ حاجی صاحب کی جبہ سائی کا نور ہے لہذا ہم نے بھی اس تذکرہ کو حاجی صاحب کے ذکر سے زینت دینا باعثِ سعادت سمجھا ہے۔

حاجی صاحب کا نام، لقب اور تاریخی اسم

آپ کا نام نامی آپ کے والد مرحوم نے امداد حسین رکھا تھا۔ لیکن حضرت شاہ محمد الحق صاحب نمبرہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے امداد اللہ کے لقب سے ملقب فرمایا۔ شاید ان کو امداد حسین نام پسند نہ آیا۔ کہ اس میں شرک کی بو آتی ہے، چنانچہ اس نام کو حاجی صاحب نے بھی ترک کر دیا اور کتابوں نیز خطوط میں ہمیشہ امداد اللہ ہی لکھا کئے۔

راقم الحروف کو ”گلزارِ معرفت“ سے جو آپ کی غزلیات وغیرہ کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے ایک اور نام کا بھی پتہ چلا ہے اور وہ نام خدا بخش ہے۔ یہ نام کس نے رکھا معلوم نہ ہو سکا۔ لکھتے ہیں۔

ہم نہ شاعر ہیں، نہ ملا ہیں، نہ عالم ہیں ولے رکھتے ہیں ہر باب میں اللہ سے امداد ہم  
اے خدا بخش اس زمین میں لکھ غزل اک اور تو تاکہ جانیں شعر گوئی میں تجھے اُستاد ہم  
لیکن اسی قافیے اور ردیف میں دوسری غزل لکھنے کا مذکورہ بالا شعر میں جو پتہ دیا ہے اس



میں آپ لکھتے ہیں۔

ہے نہ یہ شعر و غزل، ہے اپنی مجذوبانہ بڑ بڑ نہیں یہ مشق کو کرتے ہیں کچھ ارشاد ہم  
 ذرے کیا فوج گنہ سے، ہے خدا بخش اپنا نام اور تسپر رکھتے ہیں اللہ کی امداد ہم  
 ان اشعار میں بھی خدا بخش اور امداد اللہ دونوں ناموں کا اظہار صاف ہے۔ آپ نے  
 اپنے مختلف خطوط میں اپنا ایک اور نام عبدالکریم بھی ظاہر فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد  
 قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھتے ہیں:

”از فقیر عبدالکریم عزیز القدر، عالی مرتبت مولوی محمد قاسم زاد شوقہ و ذوقہ باللہ

تعالیٰ۔“ (امداد المشاق کا حصہ مرقومات امدادیہ: ص ۲۱۷)

ایک اور خط میں جو حکیم ضیاء الدین صاحب کو لکھا ہے تحریر فرماتے ہیں:

”از فقیر حقیر عبدالکریم عفی عنہ۔“ (مرقومات امدادیہ: ص ۲۲۱)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام حاجی صاحب نے کسی مصلحت کی وجہ سے رکھا تھا۔ آپ کا  
 تاریخی نام ظفر احمد تھا اور والد صاحب کا نام حافظ محمد امین بن شیخ بڈھا بن حافظ شیخ بلاتی تھا۔

(شائلم امدادیہ: ص ۶)

پیدائش، وطن اور نسب نامہ

آپ کی پیدائش ۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۴ء پیر کے روز قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور  
 (یو۔ پی) میں ہوئی جو آپ کی نانہال تھی۔ لیکن آبائی وطن تھا نہ بھون ضلع مظفر نگر (یو۔ پی)  
 ہے۔ سلسلہ نسب کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی  
 نسل سے تھے۔ اپنی کتاب ضیاء القلوب کے دیباچے میں نسب نامہ، وطن اور سلسلہ بیعت کا  
 اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

”احقر ناچیز سراپا گناہ امداد اللہ فاروقی، چشتی، تھانوی۔“

اس جملے میں نام، وطن، نسب اور سلسلہ چشتیہ تمام امور کا ذکر کر کے طالبین کے لئے

تحقیق کا سامان پیدا کر دیا ہے۔

## بھائی بہن

مولانا اشرف علی صاحب اپنی کتاب امداد المشاق میں شانم امدادیہ سے حسب ذیل عبارت لے کر تحریر فرماتے ہیں:

”حضرت (حاجی) صاحب ..... کے دو بڑے بھائی اور ایک بھائی اور ہمیشہ چھوٹے تھے۔ بڑے بھائی ذوالفقار علی، مجھلے بھائی فدا حسین۔ تیسرے خود حضرت اور چھوٹے بھائی بہادر علی اور ہمیشہ بی بی وزیر انسا تھیں۔“ (ص: ۷)

## والدہ کی وفات

ابھی آپ سات سال کے تھے کہ آپ کی والدہ محترمہ بی بی حسینی بنت شیخ علی محمد صدیقی نانوتوی کا انتقال ہو گیا اور آپ والدہ کے سائے سے محروم ہو گئے۔

## تعلیم

ابتدائے طفلی میں تعلیم شروع کی۔ قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا۔ کئی حافظوں کو استاد بنایا لیکن ہندوستان سے ہجرت کے بعد ۱۲۵۸ھ میں چند دن مکہ معظمہ میں پورا ہو گیا۔ سولہ سال کی عمر میں تقریباً ۱۲۳۹ھ میں مولانا مملوک علی صاحب مشہور استاد صدر شعبہ علوم مشرقیہ دہلی کالج کے ہمراہ دہلی کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اسی زمانے میں فارسی کی مختصر کتابیں پڑھیں اور کچھ علم صرف و نحو حاصل کیا۔ مولانا رحمت علی صاحب تھانوی سے تکمیل الایمان، شیخ عبدالحق دہلوی کی قرأت اخذ فرمائی۔ (شانم امدادیہ ص: ۹)

## تعلیم مشکوٰۃ شریف

”بعد ازاں بالہام غیبی و بجزبہ لذت کلام نبوی مشکوٰۃ شریف کا ایک رُبع قراءۃ عاشق زار رسول انور حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی پر گزرانا، حصن حصین اور فقہ اکبر،

امام الائمہ سراج الائمہ امام اعظم ابی حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ قراءۃ حضرت مولانا عبدالرحیم مرحوم نانوتوی سے اخذ کیا“ (امداد المشاق از حضرت مولانا اشرف علی ص: ۷)

اگرچہ حاجی صاحب کا علم ظاہری قلیل تھا لیکن باطنی علوم کی وجہ سے کہ آپ کو علم لدنی دیا گیا تھا بڑے بڑے عظیم الشان مسائل حل فرما دیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ کیا حاجی صاحب عالم بھی تھی تو آپ نے فرمایا ”عالم ہونا کیا معنی، اللہ کی ذات پاک نے آپ کو عالم کر فرمایا ہے۔ (امداد المشاق ص: ۱۰)

ایک اور جگہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی امداد المشاق ص: ۱۵ پر تحریر فرماتے ہیں جس سے آپ کے علم لدنی کا بخوبی پتہ چلتا ہے لکھتے ہیں:

”گو ظاہری علم شریعت میں علما مدد اور مشہور زماں مولوی نہ تھے مگر علم لدنی کے جامعہ غنیمت نامہ سے آراستہ اور نور عرفان و ایقان کے زیورات سے سرتاپا پیراستہ تھے۔“

ارواحِ ثلاثہ میں حضرت مولانا اشرف علی کا ایک قول یہ بھی درج ہے۔ فرماتے ہیں:

”حضرت حاجی صاحب نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا اور ہم نے اتنا پڑھا ہے کہ ایک اور کافیہ لکھ دیں مگر حضرت کے علوم ایسے تھے کہ آپ کے سامنے علما کی کوئی حقیقت نہ تھی ہاں اصطلاحات تو ضرور نہیں بولتے تھے۔“ (ص: ۱۸۶)

### مولانا محمد قاسم صاحب حاجی صاحب کی زبان تھے

حاجی صاحب کے علوم کا اندازہ اگر کسی کو کرنا ہو تو آپ کے ملفوظات، مکتوبات، شرح مشنوی مولانا روم از حاجی صاحب، مطالعہ کیجئے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ظاہری تعلیم اگرچہ قلیل تھی لیکن علم لدنی (اللہ کے دیئے ہوئے علم) کے باعث آپ پر شریعت اور تصوف کے راز فاش کر دیئے گئے تھے۔ آپ کے علوم کی حقیقت کا اظہار آپ کے اس ملفوظ سے بھی واضح ہوتا ہے جو مولانا اشرف علی صاحب اور دوسروں کی روایات میں ہے۔ مولانا

تھانوی کے ملفوظات میں ہے:

”حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حقائق کو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بکثرت ظاہر فرمایا ہے حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ ہر ایک بزرگ کو ایک خاص لسان دی جاتی ہے میری لسان مولوی محمد قاسم صاحب ہیں۔ (النور ۲۴ شعبان ۱۳۵۲ھ، ملفوظ نمبر ۳۵)

لیکن امداد المشتاق میں مولانا تھانوی کے الفاظ یہ ہیں:

”(مؤلف) یعنی مولانا اشرف علی صاحب نے اکثر زبان حق ترجمان حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) سے سنا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ مولوی محمد قاسم مرحوم کو میری زبان بنایا تھا جیسے مولانا روم کو حضرت شمس تبریز قدس سرہ کی زبان بنایا تھا۔“ (امداد ص: ۱۱)

ان ملفوظات سے واضح ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت حاجی صاحب کی زبان تھے اور یہ مسلم ہے کہ مولانا محمد قاسم کا علمی مقام اتنا بلند تھا کہ ان سے بڑھ کر اس زمانے میں شاید ہی کسی کا مقام اتنا بلند ہو۔ ذرا غور کیجئے کہ گلستانِ مثنوی اور تھوڑی سی صرف و نحو اور کچھ مشکوٰۃ شریف پڑھنے والا شخص معرفت آگاہ کیسے بن گیا؟ دراصل یہ علم سینہ بسینہ چلتا ہے آخر سب سے پہلی وحی پر جب جبریل علیہ السلام نے آنحضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کہا کہ ”اقْرَأْ“ پڑھئے تو آپ نے فرمایا ”ما انا بقارئ“ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں تو جبریل علیہ السلام نے تین مرتبہ سینے سے بھیجا اور علوم الہی کے خزانوں سے سینہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم لبریز ہو گیا۔ یہی حال حاجی صاحب اور دوسرے بے پڑھے لکھے اولیاء کا ہوتا ہے۔

حاجی صاحب کے ظاہری علمی مقامات کی مثالیں

مولانا اشرف علی صاحب لکھتے ہیں کہ حاجی صاحب نے فرمایا:

”أَلَوْلَايَةُ أَفْضَلُ مِنَ السُّبُورَةِ (والایت نبوت سے افضل ہے) حق ہے۔ لیکن مراد



(نماز دل کی حاضری کے بغیر نہیں ہوتی) وارد ہوا ہے۔ اور دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کرتا تھا کہ اِنِّیْ اُحِبُّهُ الْخَیْشَ وَ اَنَا فِی الصَّلٰوۃِ (میں نماز پڑھنے کے دوران میں لشکر کا انتظام کرتا ہوں) اس سے زیادہ کون امر منافی نماز ہو سکتا ہے آخر الامر آپ (حضرت حاجی صاحب) سے محاکمہ (فیصلہ) چاہا۔ ارشاد ہوا کہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہیں ہے۔ مقربوں کو جب بادشاہوں کی حضوری ہوتی ہے امور لاحقہ عرض کرتے ہیں اور استمران چاہتے ہیں اور بجا آوری خدمت کی کوشش کرتے ہیں پس یہ عین حضوری ہے نہ منافی حضوری۔“ (امداد ص: ۵۱-۵۲)

کسی اہل علم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں بظاہر تعارض کو ایسے طریقے سے بیان کرتا ہے کہ تعارض نہیں رہتا اور ہر آیت و حدیث اپنی اپنی جگہ فٹ اور صحیح ہو جاتی ہے۔ دیکھئے ان دونوں حدیثوں کے معنی حاجی صاحب نے کس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔

## فیضان کی قسمیں

ایک اور موقع پر حاجی صاحب نے فرمایا:

”فیضان کی تین قسمیں ہیں۔ فیضان حالی جیسا کہ عبد اللہ بن مسعودؓ نے حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ میں آیا اور گریہ (رونا) شروع کر دیا۔ حافظ صاحب نے اس کے آنسو اپنی انگلیوں میں لے کر اپنی آنکھوں کے نیچے لگائے بجز اس کے ایک کیفیت ساری محفل پر طاری ہو گئی اور سب وجد میں آ گئے۔ یہ فیضان حالی ہے۔

”قسم دوم فیضان قوی کہ کوئی عارف کچھ کہے اور اس سے وہ فائدہ مرتب ہو جو سالہا سال کی عبادت میں ممکن نہ ہو۔“

”قسم سوم فیضانِ فعلی کہ شیخ کی ریاکاری مرید کے اخلاص سے بہتر ہے جیسے کہ شیخ کوئی عمل اس نیت سے کرے کہ مرید بھی اس پر عمل کریں۔“ (امداد المشاق ص: ۶۹)

### خدا کا دُنیا میں دیکھنا

ایک ملفوظ میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سوال کے جواب میں آیا خدا کو اس عالم میں آنکھوں سے دیکھنا ممکن ہے یا نہیں فرمایا:

”ممکن ہے۔ معنی آیہ ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ کے یہ ہیں کہ اس بصارت ظاہری سے رویت حق تعالیٰ کی ممکن نہیں ہے اور جب نظر بصیرت (باطنہ) حاصل ہو جاتی ہے بصارت (ظاہری) پر غالب آتی ہے، پس عارف حقیقت میں نظر بصیرت سے دیکھتا ہے اور اگر یہ سمجھے کہ آنکھوں سے دیکھنا ہے تو اس کی غلطی ہے، دلیل اس بات کی کہ اس نظر سے نہیں دیکھتا یہ ہے کہ آنکھ بند کر لے رویت بدستور ہے۔ دوسرے یہ کہ دید آنکھوں کی عارضی نور آفتاب کی محتاج ہے بخلاف اس دید کے کہ محتاج نور بصیرت ہے بدون پر تو اس نور کے غیر ممکن و محال ہے۔ پھر مولانا (اشرف علی صاحب) نے استفسار فرمایا کہ خطاب ﴿لَنْ نَرَاكَ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیوں کیا گیا (حاجی صاحب نے) فرمایا کہ اس میں نفی رویت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور یہ درست ہے کہ عارف (خدا کا پہچاننے والا) اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا بلکہ دیدہ حق سے دیکھتا ہے اور نیز اس میں نفی رویت ذات ہے کیوں کہ فنائے عبد اس کو لازم ہے اور جب فنا ہوا پھر رویت کجا۔“ (امداد ص: ۵۱)

ایک موقع پر فرمایا:

”دُعا کی چار قسمیں ہیں اول دُعاے فرض مثلاً نبی کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کے واسطے بلا کی دُعا کرے پس اس پر یہ دُعا کرنا فرض ہے۔ دوم دُعاے واجب جیسے قنوت (وتروں میں) سوم دُعاے سنت جیسے بعد تشہد (التحیات پڑھنے کے بعد اور ادعیہ ماثورہ، چہارم دُعاے

عبادت جیسا کہ عارفین کرتے ہیں اور اس سے محض عبادت مقصود ہے کیوں کہ دُعا میں تذلل ہے اور تذلل (عاجزی) حق تعالیٰ کو محبوب ہے، لہذا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اُنْعِبَادَہٗ (دُعا عبادت کا مغز ہے) وارد ہوا ہے۔“ (امداد ص ۵۰-۵۱)

ہم نے یہ چند نمونے حضرت حاجی صاحب کے علم و عرفان کے پیش کئے ہیں تاکہ ان کے تذکرے سے انکا علمی مقام متعین ہو سکے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہم اللہ علیہم بھی جب کسی مسئلہ میں ان حضرات کو شبہ ہوتا تو حضرت حاجی صاحب سے دریافت فرمایا کرتے تھے۔ بس ان کے ظاہری علوم کے متعلق اسی قدر لکھنا کافی ہے۔

### مولانا نصیر الدین صاحب سے بیعت

یہ تو ظاہری علوم و تسلیم کا حال تھا لیکن روحانیت کے مقام کی تاریخ یہ ہے کہ آپ ابھی ظاہری تعلیم میں مصروف تھے کہ خدا کی تلاش کا جوش دل میں اٹھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مولانا نصیر الدین صاحب نقشبندی مجددی دہلوی سے جو شاہ محمد آفاق صاحب کے خلیفہ اور مرید اور شاہ محمد اسحاق صاحب کے داماد اور شاگرد تھے طریقہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی اور چند دن ان سے فیض حاصل کر کے اجازت اور خرچہ سے مشرف ہوئے۔ (امداد ص ۷۰)

### میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے بیعت

مولانا نصیر الدین صاحب کے انتقال کے بعد آپ نے حضرت میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے جو اپنے زمانے کے بلند پایہ صاحب طریقت تھے بیعت کی۔ میانجی صاحب کی خدمت میں آپ ایک عرصہ تک قیام پذیر رہے اور چاروں سلسلوں یعنی نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ کے سلسلوں کی تکمیل کر کے اجازت حاصل کی۔ پھر میانجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ۱۲۵۹ھ میں انتقال ہو گیا۔



## مقام روحانیت

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کا روحانی مقام بھی اس بات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے تقریباً بڑے بڑے بلند پایہ علما اور صلحا آپ کے مرید تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب، شیخ الحدیث و مدرس اول دارالعلوم دیوبند، مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری مشہور ادیب و استاد شبلی، مولانا ذوالفقار علی صاحب شارح حماسہ، مثنوی وغیرہ، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری، مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری، نواب حاجی مولوی محی الدین خاں مراد آبادی، علامہ عصر مولانا عبدالرحمن کاندھلوی، مولانا الحاج محی الدین خاں خاطر میسوری مصنف کتب کثیرہ مولانا صفات احمد غازی پوری وغیرہم۔

## اتباع شریعت

تصوف کے اعلیٰ مقامات طے کرنے کے باوجود جاہل صوفیوں کے علی الرغم (برخلاف) شریعت کے سخت متبع اور پابند تھے، ہر بات میں سنت کا خیال رہتا تھا، اس کے باوجود کہ آپ صاحب کرامت تھے لیکن کرامت کو تصوف اور دوراندیشی کی دلیل نہ سمجھتے تھے، بلکہ اس کے اظہار کو صاحب کرامت صوفیاء کی کم حوصلگی جانتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے یہاں بہت سے مہمان آگئے، کھانا کم تھا، حضرت حاجی صاحب نے اپنا رومال بھیج دیا کہ اس کو ڈھانک دو۔ کھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ یہ سب نے کھالیا اور کھانا بچ گیا۔ حضرت حافظ ضامن صاحب کو خبر ہوئی تو عرض کیا کہ حضرت آپ کا رومال سلامت چاہئے اب تو قحط کیوں پڑے گا۔ حضرت شرمندہ ہو گئے اور فرمایا کہ واقعی خطا ہو گئی تو بہ کرتا ہوں پھر ایسا نہ ہوگا۔ (امداد بحوالہ امثال عبرت ص: ۱۸۲)

آپ کی کرامتوں میں سے ایک مشہور اور زبردست کرامت جو تذکرۃ الرشید اور دیگر کتابوں میں موجود ہے یہ ہے کہ جب حاجی صاحب راؤ عبداللہ صاحب رئیس پنجلاہ ضلع



انبالہ کے یہاں مقیم تھے اور ۱۸۵۷ء و ۱۲۷۷ھ کے ہنگامہ آزادی کے عاشقوں اور مجاہدوں کی تفتیش اور پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی تو کسی نے ضلع کے کلکٹر کو اطلاع دی کہ حاجی صاحب جو شمالی ضلع مظفرنگر کے جہاد میں امیر جہاد تھے اپنے مرید یا عقیدت مند راؤ عبداللہ صاحب کے یہاں اصطلیل میں مقیم ہیں۔ ضلع کا کلکٹر خود سوار ہو کر اصطلیل پر آ موجود ہوا اور کہنے لگا ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس بہت اچھے اچھے گھوڑے ہیں ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اصطلیل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ معتقدین سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ انگریز کلکٹر جب اندر داخل ہوا بستر لگا ہوا تھا، مصلیٰ بچھا ہوا تھا اور وضو کا لوٹا بھی موجود تھا۔ اس کے پانی سے زمین تر تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر حاجی صاحب غائب تھے۔ لیکن جب وہ چلا گیا تھا حاجی صاحب کو مصلے پر دیکھا گیا۔ دراصل سلوک اور تصوف کی منزلوں میں ایک مقام فنا سالک پر ایسا بھی آتا ہے جس میں وہ کثافت سے علیحدہ ہو کر لوگوں کو دکھائی نہیں دیتا۔

غرض کہ حاجی صاحب کی کرامتوں، فضیلتوں اور بزرگیوں کو تمام اہل ہند اور اہل عرب نے تسلیم کیا ہے اور آپ عرب و عجم کے مسلمہ شیخ مانے گئے ہیں۔

۱

نجاتِ مکیہ کے مترجم، شام امداد میں لکھتے ہیں:

”اولیائے عصر آپ کی ولایت پر اجماع رکھتے ہیں اور علمائے زمان آپ کے علوم منزل کا اعتراف کرتے ہیں۔ حضرت حق سبحانہ نے علوم اسماء و صفات سے آپ کو مخصوص فرمایا ہے اور معارف خاص و خصوصیات علوم اعلیٰ سے مقامات مرحمت فرمائے ہیں۔“ (شام ص: ۳۷)

آگے چل کر یہی مترجم حاجی صاحب کے مقام روحانیت کے متعلق لکھتے ہیں:

”قطبوں کا ایک گروہ مامور بمسکوت کلیہ نہیں ہوتا بلکہ اسرار معارف و دقائق تصوف و نکات حروف و اسما وغیرہا سے کہ بظاہر حقیقت شریعت سے مخاطب معلوم ہوتے ہیں ممنوع ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ تعلیم و ارشاد میں مشغول رہتے ہیں اور بندگانِ خدا کو منافع پہنچاتے رہتے ہیں اور داعی الخلق الی الحق رہتے



ہیں اور حقیقت میں قطب ارشاد یہی ہیں۔ حضرت (حاجی صاحب) اسی جماعت سے تھے۔“ (ثائم امدادیہ: ۴۳)

## شامی ضلع مظفر نگر میں ۱۷۲ھ کی جنگ آزادی

اور حاجی صاحب اور اُن کے رفقاء کا جہاد

ابھی گذشتہ سطور میں آپ نے حاجی صاحب کی جنگ آزادی کے سلسلے میں جہاد کرنے کے بعد بمقام مخلا سہ راؤ عبداللہ کے یہاں قیام اور ضلع کے کلکٹر کا اصطبل میں پہنچ کر ان کی تفتیش اور حاجی صاحب کا دکھائی نہ دئے جانے کا اجمالی حال پڑھا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے بغیر حضرت والا کے سوانح زندگی نامکمل سے رہ جائیں گے۔ اس لئے ہم آپ کی کتاب زندگی کے اس ورق کو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان میں مئی ۱۸۵۷ء کا دور بھی عجیب ہنگامہ خیز دور اپنی نوعیت کا نہایت ہی طلاطم خیز اور فتنہ آشوب دور تھا۔ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کو سنبھالا دینے کے لئے، جنگی سلطنت اب قلعے میں رہ گئی تھی یا دہلی شہر میں، میرٹھ..... سے جنگ آزادی کا ایک طوفان اٹھا اور وہاں کی فوج نے علم خربت بلند کیا اور پھر یہ شعلہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا..... سلسلے میں خواجہ حسن نظامی کے ”عذر دہلی کے افسانے“ معلومات افزا ہیں۔ بہر حال ہر جگہ بد امنی تھی، مسلمانوں کا منصوبہ یہ تھا کہ انگریزوں کے ہندوستان میں پاؤں نہ جننے دیئے جائیں اور جہاں جہاں جم گئے ہیں ان کے قدم وہاں سے اکھاڑ دیے جائیں۔ کسی حکومت کے ختم ہونے اور دوسری حکومت کے آنے پر جس عبوری دور سے دُنیا گذرتی ہے وہ دور نہایت ہی نازک دور ہوا کرتا ہے۔ اسی صورت حال سے ہندوستان دوچار تھا۔ خصوصاً مسلمانوں کے لئے یہ وقت نہایت ہی خطرناک تھا۔ انگریزوں کو جس کے متعلق شبہ ہوتا یا جس کسی کے متعلق رپورٹ ملتی کہ وہ بھی اس ہنگامے میں شریک تھا تو اس کو سولی پر چڑھا دیا



جاتا۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم آخری تاجدار دہلی نے اپنے حسب ذیل اشعار میں اس وقت کی حالت کا نقشہ خوب کھینچا ہے لکھتے ہیں۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرا قرار ہے      کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ نگار ہے  
یہ رعایا ہند تہہ ہوئی کہوں اس پہ کیا یہ جفا ہوئی      جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے  
یہ اشعار بتا رہے ہیں کہ اس وقت شرفا کا کیا حال ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ کتنوں کو پھانسی ہوئی، کتنے قید کئے گئے، کتنوں کو کالے پانی پہنچا دیا گیا۔ کتنے چھپتے چھپاتے ہجرت کر گئے انہی میں حاجی صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی اور شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی مولانا محمد قاسم صاحب کے شیخ الحدیث تھے۔ جب یہ ہنگامہ فرو ہو گیا اور مئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہو کر دسمبر ۱۸۵۷ء تک پہنچا، دہلی مسلمانوں سے خالی ہو چکی تھی۔ بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلا وہ اور ان کی بیگم زینت محل رنگون میں نظر بند کر دئے گئے اور وہیں دنیا سے گذر گئے شہزادوں کو قتل کر کے ان کے سر طشت میں رکھ کر بہادر شاہ ظفر کے سامنے پیش کئے گئے۔ یہ انتقام تھا ان انگریز مردوں و عورتوں اور بچوں کے قتل کا جو باغیوں نے لال قلعے میں پناہ گزین انگریزوں کو قتل کیا تھا۔ جس میں بہادر شاہ کا ہاتھ بالکل نہ تھا۔ مرزا غالب اپنے ایک خط مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء بنام ہرگوپال تفتہ میں دہلی کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

” (غدر سے پہلے) پہلے جنم میں میں بھی دلی کے محلے بلی ماروں میں رہا کرتا تھا لیکن اس دوسرے جنم میں نہ اس دور کا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی ملنے جلنے والا۔ امیر، غریب اور پیشہ ور کوئی بھی اس دور کا موجود نہیں۔ کچھ لوگ ہیں تو وہ باہر کے مسلمانوں کا تو کہیں نام و نشان نہیں۔ ہاں کچھ ہندو آکر آباد ہو گئے ہیں۔ میں اپنے پرانے گھر میں کس طرح محفوظ رہا اس کی تفصیل یہ ہے کہ میں حکیم حسن محمد خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے بحیثیت کرایہ دار کے رہ

رہا ہوں اور ان حکیموں کے خاندان کے لوگ زیندر سنگھ مہاراجہ پٹیالہ کے نوکر ہیں۔ پٹیا لے کے راجہ نے انگریزوں سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ دلی پر فتح پانے کے بعد اس خاندان کے لوگوں پر کوئی ظلم نہ ڈھایا جائے، چنانچہ ہنگامے کے دوران مہاراجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اس طرح یہ گلی فساد سے محفوظ رہی۔ ورنہ میرا بھی اس شہر میں رہنا ناممکن تھا۔ تم یقین کرو کہ امیر و غریب سبھی شہر سے باہر نکل گئے اور جو نوگ رہ گئے تھے وہ زبردستی نکالے گئے، کسی طبقے کا کوئی آدمی یہاں موجود نہیں۔ زیادہ تفصیل سے لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، وہ نوکر جو اس ہنگامے کے دوران ملازم ہوئے ان کی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے اور ان سے سوال و جواب کیا جا رہا ہے۔ میرا قلعے سے صرف اتنا تعلق تھا کہ تاریخ لکھنے اور بادشاہ کے شعر کہنے کی اصلاح کا کام میرے سپرد تھا۔ اب اسے نوکری سمجھو یا مزدوری، ہنگامے اور فساد میں، میں شامل نہ تھا۔ لہذا اپنے کو بے گناہ سمجھتے ہوئے میں نے شہر نہ چھوڑا۔ شہر میں موجودگی کا علم حکام کو ہے لیکن بادشاہ کے دفتر یا جاسوسوں کے ذریعے میرے خلاف کوئی بات نہیں پائی گئی۔ اس لئے میری پیشی کی نوبت نہ آئی ورنہ بڑے بڑے راجے اور مہاراجے پکڑ کر لائے گئے، ہاں صورت یہ ہے کہ دن بھر گھر میں بیٹھا رہتا ہوں کہیں باہر نکلنے کی نوبت نہیں آتی۔ اور نہ کوئی میرے پاس آتا ہے اور آئے بھی کون جب شہر میں کوئی موجود ہی نہ ہو مجرم سزا پار ہے ہیں۔ فوجی انتظام گیارہ مئی سے آج (۵ دسمبر ۱۸۵۷ء) بروز ہفتہ تک بدستور ہے دیکھئے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ یہاں باہر سے کوئی بغیر ٹکٹ نہیں آ سکتا، تم یہاں آنے کا ارادہ ہرگز نہ کرنا۔ دیکھو مسلمانوں کو آباد ہونے کی اجازت ملتی ہے یا نہیں۔ منشی صاحب کو میرا سلام کہنا۔ تمہارا خط ملتے ہی میں نے جواب لکھ کر ڈاکے کے حوالے کر دیا۔ شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء۔ غالب

اس خط سے دہلی کا حال زار، مسلمانوں کا دہلی سے اخراج، مقدمات کا چلنا، صاف معلوم ہوتا ہے۔



بہر حال چونکہ ملک میں ہر طرف انتشار تھا، اس لئے غنڈوں نے بھی سر نکالا اور لوٹ کا بازار گرم رکھا۔ ایک جماعت کہ جو انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں سرگرم تھی اور دوسری طرف ایسے پُر آشوب دور سے فائدہ اٹھانے کے لئے ملک کا ناشائستہ اور ناپسندیدہ طبقہ فتنہ و فساد کے شعلوں پر مٹی کا تیل چھڑک رہا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو گھروں میں اپنی عزت کی حفاظت کی خاطر چھپے بیٹھے تھے۔ ہندو راجاؤں میں کچھ ایسے تھے جو بہادر شاہ کا ساتھ دے رہے تھے اور کچھ مخالف تھے۔ ہندو پبلک اور سکھوں کے بھی کتنے عناصر انگریز کا ساتھ دے رہے تھے اور مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔

ضلع مظفر نگر کا قصبہ تھانہ بھون بھی اس جنگ آزادی میں ایک خاص پارٹ ادا کر رہا تھا، یہ قصبہ ہندو پاک کے مرشد کامل حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وطن تھا اور اسی مقام پر حضرت محمد ضامن صاحب اور حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ، حاجی صاحب کے پیر بھائی بھی سکونت رکھتے تھے۔ اور پھر حاجی صاحب کی وجہ سے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند اس نازک دور میں اکثر تھانہ بھون میں اپنے پیر و مرشد حاجی صاحب کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے۔ یہ صوفیاء اور علمائے ربانی کی جماعت کب یہ چاہ سکتی تھی کہ مسلمانوں کی حکومت ہندوستان سے ختم ہو جائے اس لئے انہوں نے انگریز حکومت کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا اور اپنے قصبے میں متوازی حکومت قائم کر کے مقدمات کے فیصلے شروع کر دیے۔ جہاد کی تحریک حضرت حافظ محمد ضامن صاحب نے کی، لیکن مولانا گنگوہی نے فقہی نکتہ پیش کیا کہ امیر کے بغیر جہاد کی صورت جواز کیونکر ممکن ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے امارت کے لئے حاجی صاحب کو تجویز فرمایا اور ان کو امیر جہاد بنا کر بیعت کر لی، حافظ محمد ضامن صاحب جو حاجی صاحب کے پیر بھائی تھے انہوں نے بھی اور حضرت گنگوہی نے اور سب جماعت نے جہاد کے لئے عہد کیا۔ حضرت مولانا محمد صاحب بھی جہاد کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے کہ ہمارے پاس جہاد کے

لئے ہتھیار نہیں ہیں۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا کہ کیا ہمارے پاس اتنے بھی ہتھیار نہیں ہیں جتنے جنگ بدر میں کفار مکہ کے مقابلے میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاس تھے۔ یہ سن کر مولانا محمد صاحب خاموش ہو گئے اور بہر حال جہاد کرنے پر متفقہ فیصلہ ہو گیا۔

تذکرۃ الرشید میں جو واقعات درج ہیں چونکہ یہ کتاب انگریزوں کے عہد حکومت میں لکھی گئی اس لئے اس میں کچھ مصلحت کو پیش نظر رکھ کر ان واقعات کا سبب یہ لکھا ہے:

”تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی خاں کا چھوٹا بھائی عبدالرحیم خاں چند ہاتھی خریدنے سہارنپور گیا۔ وہاں اس آفت رسیدہ کا کوئی بنیاد می دشمن کئی دن سے ٹھہرا ہوا تھا جس کو زمیندارانہ حمصات میں عبدالرحیم کے ساتھ خاص عداوت تھی۔ دشمن نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً حاکم ضلع سے جا کر رپورٹ کی کہ فلاں رئیس بھی باغی و منفد ہے، چنانچہ دہلی میں کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے سہارنپور آیا ہوا ہے۔ زمانہ تھا اندیشہ ناک اور احتیاط کا اسی وقت دوڑ گئی اور رئیس گرفتار ہو گیا نتیجہ یہ ہوا کہ پھانسی ہوئی۔“

(تذکرۃ الرشید جلد اول ص: ۷۴)

اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرحیم خاں کی پھانسی تھانہ بھون میں شورش اور شامی کی تحصیل پر حملے کا باعث ہوئی جس کے محرک ان کے بڑے بھائی عنایت علی تھے۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھیوں کی خریداری کا مقصد دہلی کمک پہنچانا تھا ورنہ کئی ہاتھی خریدنے کے کیا معنی لہذا اینیے نے جو رپورٹ دی تھی وہ صحیح تھی۔ تذکرۃ الرشید کے مصنف آگے چل کر تھانہ بھون کے لوگوں کے متعلق عبدالرحیم خاں صاحب کے پھانسی پا جانے کے بعد لکھتے ہیں:

یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گذران دشوار ہے۔ گورنمنٹ نے باغیوں کی



بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھالیا اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دے دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہئے اس لئے آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بھی بار اپنے سر رکھیں اور امیر المؤمنین بن کر ہمارے باہمی قفسے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔ اس قفسے نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی خبری کا موقع دیا..... ادھر اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضا میں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتا رہے اس لئے آپ (مولانا رشید احمد صاحب) اور مولانا محمد قاسم صاحب مع دیگر خدام کے یہیں رہ پڑے۔“ (تذکرۃ الرشید ج ۱، ص: ۷۴)

یہ عبارت بتاتی ہے کہ ان علمائے ربانی نے قصبے میں جنگ آزادی کے زمانے میں اپنی متوازن حکومت قائم کر لی تھی، امیر المؤمنین جو حاجی صاحب بنائے گئے اس لفظ کے معنی بہت ہی دور رس اور اس کی حقیقت بہت ہی نتیجہ خیز ہے، صاف پتہ چلتا ہے کہ حاجی صاحب کو امیر المؤمنین بنایا گیا اور مؤمنین نے جہاد کیا، ورنہ جب انگریز کمپنی کی حکومت تھی تو اس میں امیر المؤمنین بننے کے کیا معنی؟ حکومت نے پبلک کو امن خود قائم کرنے کا اعلان کیا تھا نہ کہ حکومت سے استعفاء دے دیا تھا۔ بہر حال مجاہدین کی اس جماعت نے شاملی کی تحصیل پر حملہ کیا اور چونکہ وہاں کمپنی کی حکومت کا خزانہ اور توپ خانہ تھا اس لئے اس کو حاصل کرنا ضروری تھا تا کہ جہاد کا سامان مہیا کیا جاسکے اور حکومت کی قوت کو کم کیا جاسکے۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”اعلان کر دیا گیا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت

مولانا محمد قاسم صاحب کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو قاضی بنایا گیا اور مولانا منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو مہتمم اور میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔“ (نقش حیات ص: ۴۲)

چونکہ مذکورہ بالا حضرات نے جہاد کا فیصلہ کر لیا اور یہ صاحبان اپنی بزرگی، پرہیز گاری اور شخصیت کے اعتبار سے با اثر تھے اس لئے چاروں طرف سے لوگ جہاد کے لئے آ کر تھانہ بھون میں جمع ہو گئے۔ یہ اجتماع ان ہی امیر المؤمنین حاجی صاحب کے گرد جمع ہو گیا تھا چنانچہ ان حضرات نے تھانہ بھون اور اطراف و جوانب میں اپنی حکومت قائم کر لی اور انگریزی حاکموں کو نکال باہر کیا۔ پھر معلوم ہوا کہ شمالی ضلع مظفر نگر میں جو تھانہ بھون کے قریب ہے اور سہارنپور سے تھانہ بھون کو چھوٹی لائن پر واقع ہے جو ان دنوں انگریزوں کا فوجی مرکزی مقام بھی تھا انگریز اپنا توپ خانہ بھیج رہے ہیں۔ اس خبر سے مجاہدین کو تشویش لاحق ہوئی اور ان کے استیصال کے لئے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو مقرر کیا گیا۔ مولانا مدنی لکھتے ہیں:

”سڑک ایک باغ کے کنارے سے گذرتی تھی۔ جب مولانا رشید احمد صاحب کو تمیں یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی صاحب نے افسر مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے تمام ماتحتوں کو لے کر باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم کیا پہلے سے تیار رہو جب میں حکم کروں سب کے سب ایک دم فیر کرنا، چنانچہ جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گذری تو سب نے یکدم فیر کیا، پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کتنے آدمی ہوں جو یہاں چھپے ہوئے ہیں توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کے سامنے لا کر ڈال دیا۔“ (نقش ص: ۴۳)

بعد ازاں ان حضرات نے سوچا کہ شملی پر حملہ کرنا چاہئے، چنانچہ وہاں حضرت مولانا



محمد قاسم صاحب اور حضرت حافظ محمد ضامن صاحب نے سخت حملے کئے اور تحصیل کے دروازے کو آگ لگا دی ناگاہ ایسا پسا پلا کہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب کی ناف کے نیچے گولی لگی اور وہ شہید ہو گئے۔ اب انگریزوں کی فوج کا پلا بھاری ہوا اور مجاہدین کو پسپائی ہوئی، کمپنی کی قوت زیادہ تھی، رفتہ رفتہ تمام ہندوستان پر ان کے پاؤں جم گئے۔ شامی کے بعد تھانہ بھون پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور جو بھی ہاتھ لگا اس کو قتل کر دیا اور ان کے گھروں کو آگ لگا دی گئی، خانقاہ امدادیہ جہاں بزرگوں کا مجمع رہتا اس کو بھی آگ لگا دی گئی، مجاہدین کے وارنٹ جاری ہوئے۔ حاجی صاحب تین دن گنگوہ پھر انبالہ، نگرہ، بخلاہ میں مقیم رہے یہیں (راؤ عبداللہ صاحب کے اصطبل میں آپ کو تلاش کیا گیا لیکن آپ کرامت سے پکڑے نہ گئے پھر وہاں سند کو ہوتے ہوئے کراچی پہنچے اور وہاں سے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ مولانا محمد قاسم صاحب تین دن تو گھر میں چھپے رہے پھر باہر نکلے لیکن حکومت کے ہاتھ نہ آئے۔ مولانا گنگوہی حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری منہارن ضلع سہارنپور کے مکان سے گرفتار ہوئے اور چھ مہینے جیل میں رہے، آخر ثبوت نہ ملنے کے باعث چھ ماہ کے بعد رہا ہوئے۔ آخر جب وکٹوریہ تخت نشین ہوئی اور ہندوستان کے مجاہدین کی عام معافی کا اعلان ہوا تو یہ ڈرامہ ڈراپ سین ہوا اور سب نے آزادی کا سانس لیا۔

ناحق شناسی اور بے ادبی ہوگی اگر ہم یہاں حافظ محمد ضامن حسن صاحب شہید جہاد شامی کا ذکر خیر نہ کریں۔

## ذکر خیر حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ

حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر دارالعلوم دیوبند اور اس کے متعلقین میں تواتر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے ہم زمانہ اور رفیقوں میں سے تھے۔ عام طور پر یہ تینوں حضرات جن میں تیسرے شیخ محمد تھانویؒ تھے تھانہ بھون کی

خانقاہ جو مسجد پیر محمد میں واقع ہے اس میں جمع رہتے۔ جیسا کہ حاجی صاحب کی پیدائش ۱۲۳۳ھ میں ہوئی اسی کے لگ بھگ حافظ صاحب ان سے پیدائش میں پہلے ہیں۔

ہم مولانا نسیم احمد فریدی کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمارے لئے ایک خزانہ مدرسہ صولتیہ کے کتب خانے سے معلوم کیا یعنی حکیم ضیاء الدین صاحب کے ایک رسالہ بنام ”مولنس مہجوراں“ کا پتہ دیا جس میں ۱۸۵۷ء کے واقعات میں حافظ صاحب کی شہادت اور ان کا جہاد حریت بیان کیا ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے کسی طرح حاجی صاحب کے پاس مکہ معظمہ بھیجا تھا۔ حکیم ضیاء الدین صاحب رام پور منہار ان ضلع سہارنپور کے رئیس اور مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت گنگوہی کے دوستوں میں سے ہیں۔ مولانا نانوتوی کے بعض خطوط حکیم صاحب کے نام مکتوبات قاسمی میں موجود ہیں۔ بہر حال حکیم صاحب، حافظ صاحب کے مرید اور جاں نثار تھے۔ حافظ صاحب نے بمشکل حاجی صاحب کی سفارش پر حکیم صاحب کو بیعت کیا تھا ورنہ مولانا نانوتوی کی طرح کسی کو مرید نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی بیعت ہونے آتا تو فرماتے:

”بھائی اگر بیعت ہونا ہے تو حاجی صاحب کے پاس جاؤ، وہ خانقاہ میں اندر

بیٹھے ہیں۔ اور اگر کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہے تو مولانا محدث کے پاس جا کر

پوچھو اور حقہ پینا ہے تو میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“

اسی رسالے میں جو ”مولنس مہجوراں“ کے نام سے موسوم ہے حکیم صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے اشعار جو سو سے زیادہ ہیں نقل کئے ہیں۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے ان کو انتخاب کیا ہے اور مضمون کے ضمن میں رسالہ ”تذکرہ“ نومبر ۱۹۶۱ء دیوبند میں شائع کیا ہے۔ ان اشعار میں مولانا نے حافظ صاحب کا سراپا لکھا ہے، ہم سراپا کے اشعار کا اردو میں مفہوم پیش کرتے ہیں، البتہ سراپا کے اشعار مولانا محمد یعقوب صاحب کے بیان میں سوانح یعقوبی میں پڑھیں گے۔ جو حیاتِ امداد سے علیحدہ انشاء اللہ چھاپی جائے گی۔



## حافظ صاحب کا سراپا یعنی حلیہ

آپ کا رنگ گورا سفید تھا، چپک کے کچھ داغ چہرے پر تھے لیکن خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ قد درمیانہ درجے کا تھا اور نہایت متناسب، خوبصورت اور چہرے سے رعب نمایاں، آنکھوں میں سُرخ جھمکتی تھی، سینے پر سیاہ بال تھے، بھوئیں آپس میں ملی ہوئی نہ تھیں بلکہ کشادہ تھیں، سر منڈاتے رہتے تھے، گردن بلند تھی اور چہرے پر تبسم رہتا تھا، بے تکلف، سیدھے سادھے بزرگ اور نظریفانہ طبیعت کے مالک تھے۔

## عادات و اخلاق

حکیم صاحب آپ کے اخلاق و عادات کے متعلق ”مونس مجھوراں“ میں لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے اس ذات عالی کو کیا بے نظیر پیدا کیا تھا کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور بایں صورت و شان باکمال..... ایسے بے ساختہ اردو بے تکلف تھے کہ تصنع کا گمان بھی نہ آتا تھا۔ اور ظاہر و باطن وہ صاف معاملہ تھا کہ ریا کی بو پاس نہ تھی۔ اور ہر ایک یہ جانتا تھا کہ مجھ سے نہایت محبت رکھتے ہیں، بہت حق، چہرہ پر نور سے ایسی عیاں تھی کہ ہر ایک نعمت آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔ اور مردم شناسی کا یہ ملکہ تھا کہ کبھی خطا نہ ہوتی تھی اور جیسا جس کو دیکھتے دیے اس سے کلام فرمایا کرتے تھے۔ غرض کسی حال میں افراط و تفریط نہ تھی اور باوصف خانہ داری اور اہل و عیال کے نہایت آزاد اور مستغنی رہتے تھے۔ گویا فکر دنیا پاس بھی نہ آیا تھا۔ دانائے عصر اور علمائے زمانہ ہر ایک مخلص و منقاد تھا۔ نادان و منافق سے کچھ باک نہ تھا۔ ہر وقت عشق الہی میں مست و سرشار رہتے تھے۔ دل کی کیفیت چہرہ مبارک پر معلوم ہوا کرتی تھی۔ آنکھیں ہر وقت سرخ رہتی تھیں۔ محبت الہی کا صورت شریف پر ہر آن ظہور تھا۔“

## تعلیم و تربیت

حضرت حافظ صاحب شہید کی تعلیم و تربیت اُس زمانے کے مطابق معمولی سی تعلیم ہوگی، کیوں کہ آپ کوئی مستند تعلیم یافتہ نہ تھے۔ تھانہ بھون میں آپ کے زمانے میں جس مستند عالم کا نشان ملتا ہے وہ مولانا شیخ محمد تھانوی تھے۔ حاجی صاحب بھی جیسا کہ پیشتر ذکر کیا گیا انتہی عالم نہ تھے۔ اسی طرح کی تعلیم بہر حال حافظ صاحب کی معلوم ہوتی ہے حافظ بھی آپ البتہ ضرور تھے۔

## حالات بیعت

اُس زمانے میں لوگوں میں روحانیت کا شغل خوب خوب تھا۔ حاجی صاحب کی طرح حافظ صاحب نے حضرت میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے بیعت کی، حکیم ضیاء الدین صاحب لکھتے ہیں:

”وقت عصر حضرت میاں جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ تم آیہ کریمہ ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ ختم کرلو۔ حضرت حافظ صاحب نے بعد عصر آیت کریمہ شروع فرمائی اور اگلی عصر تک ختم فرما کر اُسی جگہ سے اٹھے۔ اور اس ایک رات دن میں بجز حاجت ضروری یا نماز وغیرہ ضروریات کے کوئی بات نہ کی۔ جب میانجی (صاحب) نے ذکر و اشغال تلقین فرمائے اُسی ہمت اور استقامت کے ساتھ انجام کو پہنچائے۔ سوائے اور اشغال کے چند روز میں جس دم کی یہ مشق حاصل فرمائی تھی کہ ایک دم میں ذکر نفی و اثبات بعد شرائط پانسو مرتبہ تلک پہنچا کر چھوڑ دیا، زیادہ حاجت نہ ہوئی ورنہ خدا جانے کہاں تک کثرت فرماتے اور کئی سال تک فقط آدھ پاؤ کے بقدر کھانا نوش جاں فرمایا کرتے تھے۔ اور ربط قلب شیخ کے ساتھ اس قدر پیدا کیا تھا کہ بالکل محو اور فنا فی الشیخ ہو گئے تھے۔ ۱۵ شعبان (شب براءت) سے آخر رمضان شریف تک ڈیڑھ مہینے تمام شب



مشغول رہتے تھے۔ شب کو لیٹنا، سونا بالکل موقوف کر دیتے تھے۔ چند روز میں کمال جذب کے ساتھ سلوک طے فرمایا اور اس قدر کمال تو حید اور وسعت حال حاصل ہوئی کہ خارج از بیان ہے۔ اس وقت تمام درویش اہل حال فن تصوف میں پیشوا سمجھتے اور خاص و عام دریافت حال و مقام میں حیران تھے۔“

(مولیٰ یار ان بحوالہ مضمون تذکرہ نومبر ۱۹۶۱ء ص ۱۰-۱۱)

## حصول سلوک کی ابتدائی منزلوں میں حافظ صاحب کا مقام

”مشائخ دیوبند“ کے مصنف (نور محمدی) کے حوالے سے حضرت حافظ صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

”حضرت میانجو علوی جھنجھانوی کے ایک دوست دہلی میں رہتے تھے یہ دونوں حضرات سال بھر میں ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ یعنی کبھی میانجو صاحب ان سے ملتے جاتے تھے کبھی وہ خود میانجو صاحب سے ملتے آتے تھے۔ ایک بار حضرت (میانجو صاحب) ان سے ملنے دہلی تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ حافظ ضامن صاحب بھی تھے۔ ملاقات کے بعد ان دوست صاحب نے حضرت سے دریافت کیا کہ اس سال کتنے تیار کئے۔ فرمایا یہاں تو یہی ایک ہیں۔ انہوں نے کہا جا میرے یا مدر سے میں بھی تعلیم میں پھسڈی تھا اور اب بھی ہے۔ دیکھو یہاں تو اس سال بیس تیار کئے ہیں۔ حضرت حافظ صاحب کو اپنے مرشد کے متعلق یہ توہین آمیز الفاظ ناگوار گذرے اور آپ جامع مسجد کی حوض پر وضو کرنے بیٹھ گئے۔ ابھی داہنا پاؤں ہی دھو رہے تھے کہ حضرت کے ان دوست کو گھبراہٹ محسوس ہوئی تو حضرت میانجو صاحب نے فرمایا ”گھبراؤ نہیں ہم اپنے باو لے کو خود سنبھال لیں گے۔ اور بائیں پاؤں بغیر دھوئے ہوئے حضرت میانجو صاحب نے حضرت حافظ کو بلایا۔ حافظ صاحب امتثال حکم کے طور پر وضو نا تمام چھوڑ کر حاضر ہوئے اور ان بیس والے صاحب سے

فرمایا کہ آپ کے بیسوں تو کورے ہیں۔ کیوں کہ حافظ صاحب نے ان بیسوں کی نسبت سلب کر لی تھی۔“ (مشائخ دیوبند ص: ۸۲، ۸۳)

نسبت کا سلب کرنا تو ولیوں کی باتیں ہیں وہی ان رموز کو خوب پہنچانتے ہیں۔ تاہم کسی سے اس کا منصب چھین لینا جب کہ اس پر کوئی اور بالا دست حاکم ہو عتلا مسلم ہے۔ یہی کچھ روحانی طاقت حافظ محمد ضامن صاحب میں پیدا ہو گئی تھی جو ان کی منزل سلوک کا پتہ دیتی ہے۔

### سلوک میں ترقی

آپ کی روحانی حالت نے بعد ازاں بہت ترقی کی حتیٰ کہ جب آپ کے پیر و مرشد میاں نجی نور محمد صاحب جھنجھانوی کا انتقال ہو گیا تو حاجی امداد اللہ صاحب جو آپ کے پیر بھائی تھے ان کی روحانی تربیت کو حافظ محمد ضامن صاحب نے معراج کمال پر پہنچایا۔

### مولانا شیخ محمد محدث تھانوی کا حافظ صاحب سے کسب روحانیت

مولانا شیخ محمد محدث تھانوی جو اپنے زمانے کے جید عالم اور زبردست صاحب نسبت تھے انہوں نے تعلیم کے بعد سب سے پہلے حافظ محمد ضامن صاحب شہید جو مولانا کے رشتے کے ماموں ہوتے تھے اور ہم عمر تھے، روحانی فیض حاصل کیا اور بعد ازاں میاں نجی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے بیعت کی۔

### اخفائے حال

تصوف اور طریقت کی منزل میں جو کیفیتیں حاصل ہوتی ہیں ان کا چھپانا صوفی اور عارف خدا کے لئے ظرف کی بلندی کی دلیل ہے۔ حافظ صاحب میں اپنے حالات معرفت کو چھپانا خوب آتا تھا جس سے ان کے بلند مقامات کا پتہ چلتا ہے۔ حکیم ضیاء الدین صاحب مونس یاراں میں لکھتے ہیں:

”ابتدائے حال میں حضرت حافظ صاحب کو قمریوں سے شوق تھا۔ ایک روز بعد کھانا کھانے کے ایک روٹی قمریوں کے لئے لائے۔ جس وقت قریب پنجرے کے پہنچے (تو) ایک قمری نے صدائے حق سرہ سنائی، اس صدا کو سنتے ہی بیہوش ہو کر گر پڑے، ناگاہ ایک شخص آگیا (اس وقت ہوش آگیا تھا) گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور یوں فرمایا کہ:

”دیکھو اکثر آدمی راد میں پانی گرا دیتے ہیں لوگ رپٹ کر گر جاتے ہیں“ سبحان اللہ کتنا اخفائے حال تھا کہ حتی المقدور اپنے حال کو باتوں سے چھپا دیا۔ اسی وجہ سے آپ کے اکثر حال اور خرق عادات ظاہر نہ ہوئے۔

(مولف یاراں تہذیب نومبر ۱۹۶۱ء)

حکیم صاحب کی اس عبارت سے حافظ صاحب کے اخفائے حال، وجد و ذوق، عشق و معرفت خداوندی اور قمریوں کے پالنے کا پتہ چلتا ہے۔

### چشتی اور فاروقی

چونکہ آپ سلوک کے خاندان چشتیہ میں بیعت تھے اس لئے سوز عشق اور بھی زیادہ تھا اس پر ضبط حیرانی سے کم نہیں ورنہ چشتیوں کو وجد و حال بے تاب رکھتا ہے۔ اس کے برعکس نقشبندیہ خاندان والوں کے لب پر مہر خاموشی ہوتی ہے۔ الحاصل حافظ صاحب سلسلہ سلوک میں چشتیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن نسب کے اعتبار سے آپ کا سلسلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا اس لئے طبیعت میں جرأت، دل میں حوصلہ، دین میں پختگی اور شدت حضرت عمرؓ کی سی تھی۔

### اتباع شریعت اور زہد و تقویٰ

صوفی اور عارفِ خدا کی سب سے بڑی پہچان شریعت کی پیروی، سنت کا اتباع اور بدعت سے نفرت ہے۔ حافظ صاحب اتباع سنت اور استیصال بدعت میں بہت آگے

تھے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں:

”اور اتباعِ شریعت یہ کچھ تھا کہ ادنیٰ بدعت بھی جڑ سے اکھاڑ دیا کرتے تھے اور خود مسئلہ مختلف فیہا میں احتیاط پر عمل فرمایا کرتے تھے، اور اوامر و نواہی میں شانِ فاروقیت کا عروج ہوتا تھا۔ زہد و تقویٰ پر ایسی کمر چست باندھی تھی کہ جان تک سے دریغ نہ فرمایا۔ اللہ اللہ کیا اوصاف بیان کروں مختصر یہ کہ ایک دریاے نور تھا، نور محمدی کا ظہور تھا۔“ (مونس یاراں)

**شہادت اور کشف شہادت ۲۴ محرم ۱۲۷۳ھ بروز پیر بوقت ظہر بمقام شاملی**  
جب ہندوستان میں جنگِ آزادی کا ولولہ مسلمانوں میں آگ کی طرح پھیل گیا اور اُدھر ضلع مظفر نگر اور سہارنپور بھی اس کی لپیٹ میں آگئے تو حافظ محمد ضامن صاحب اور حاجی امداد اللہ صاحب کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ فقہی طور پر جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے مسئلے کی صورت حال اور جہاد کی فرضیت طے کر دی اور حاجی صاحب کو امیر جہاد بنالیا گیا، کیوں کہ امیر کے بغیر جہاد جائز نہیں تو شاملی ضلع مظفر نگر میں جہاں کی تحصیل میں حکومت کا خزانہ تھا اور یہیں پر توپ خانہ اور اسلحہ بھی موجود تھا اس لئے ان حضرات نے جہاد کیا اور انگریزی فوجوں سے سخت لڑائی کی۔ کئی گھنٹے تک میدانِ کارزار گرم رہا، بالآخر حافظ محمد ضامن صاحب کی ناف کے نیچے گولی لگی اور شہید ہو گئے اور رع  
شہید ہو کے مرے عمر جادواں کے لئے

**حوریں پیالے لئے ہوئے مکانوں کی منڈیروں پر کھڑی ہیں**

شہادت سے پہلے آپ کو شہادت کا کشف ہو چکا تھا۔ حکیم ضیاء الدین صاحب نے ”مونس یاراں“ میں لکھا ہے کہ شہادت کے سال حافظ صاحب اس طرح فرمایا کرتے تھے:  
”دیکھو حوریں پیالے لئے ہوئے مکانوں کی منڈیروں پر کھڑی ہیں جس کا جی  
چاہے لے لیوے۔“

ان ایام میں میں حضرت پیر مرشد (حافظ صاحب) ولولہٗ محبت الہی میں ایسے مست و مخمور ہوئے تھے (کہ) اکثر ذکر شہادت بر زبان تھا اور بہت باتیں اسرار کی کہ اٹھتے تھے۔ ستر حال (اخفائے حال) کا چنداں لحاظ نہ رہا تھا اور جو کوئی مستعدی بیعت ہوتا تھا برخلاف عادت فوراً بیعت کر لیتے تھے۔

حالانکہ اُس سے پہلے حافظ صاحب اخفائے حال اور مرید نہ کرنے پر مستقل مزاج نظر آتے ہیں۔ حکیم ضیاء الدین صاحب لکھتے ہیں:

”ستر حال کا بہت خیال تھا۔ آزادانہ وضع رکھتے تھے۔ بوسیلہ سفارش حضرت حاجی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ میں مشرف بہ بیعت ہوا تھا۔“

### شہادت سے پہلے

شہادت سے آٹھ دس روز پہلے ایک خط فارسی زبان میں حافظ صاحب نے اپنے مرید حکیم صاحب کو لکھا، جس کا ترجمہ حکیم صاحب نے محسن یاراں میں حسب ذیل لکھا ہے:

”برادر دینی حکیم محمد ضیاء الدین سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام واضح رائے ہو کہ تمہاری تحریر کے موافق دل میرا تمنی ملاقات ہے۔ لازم کہ بطور مطالعہ اس خط کے اپنے تئیں یہاں پہنچاؤ، ایسا نہ ہو کہ کہیں توقف میں حسرت ملاقات کی دل میں رہ جائے۔ عاقل کو اشارہ کافی ہے۔ باقی حال بروقت ملاقات بیان کیا جائیگا۔ فقط والسلام

### شہادت کا دولہا

میدان شہادت میں جانے سے پہلے آپ نے جو زیب وزینت کی اس کا نقشہ حکیم صاحب نے اس طرح کھینچا ہے۔

جس وقت ارادہٗ معرکہ کیا، غسل فرما کر سب لباسِ نیازیب بدن شریف فرمایا اور یہ لباس بہت روز بیشتر رکھ چھوڑا تھا، حالانکہ اس کے بعد کے کپڑے بنائے ہوئے استعمال فرمائے۔ اور وہ لباس اس دن کام آیا۔ نعلین شریف کچھ بوسیدہ نہ تھی مگر وہ بھی نئی منگا کر زیب



پاکیں، اور یہاں تلک سامان لباس وغیرہ کا اہتمام کیا تھا کہ خوشبو ملی اور سرمہ لگایا، دستار پیچھا رہا سپاہیانہ وضع، شمشیر لے کر شربت دیدار کی تمنائیں علم جوانمردی اٹھا کر مردانہ اور مشاقانہ برسرِ معرکہ جاں بحق تسلیم فرمائی جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

در کوئے تو عاشقان چناں جاں بدہند

کانجا ملک الموت نہ گنجد ہر گز

(محسن یاراں)

اللہ حافظ کو شوق شہادت کا جذبہ کس شان سے ان کو مقتل کی طرف کھینچ رہا تھا اور آپ کو یقین تھا کہ مجھے آج شہادت کا جام پینا ہے، اس لئے عید کی طرح خوشیاں مناتے ہوئے یہ دولہا شہید ہوا۔ حکیم صاحب نے اوپر کی عبارت میں افسوس کہ کپڑوں کی نوعیت نہ لکھی حالانکہ جائے شہادت میں جانے سے پہلے حکیم صاحب نے ان کو خوب دیکھا تھا۔

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے زانو پر

حافظ صاحب نے مولانا گنگوہیؒ کو وصیت فرمائی تھی کہ بوقت شہادت یعنی نزاع کے وقت میرے پاس رہنا، چنانچہ مولانا گنگوہیؒ ہی آپ کو گولی لگنے کے بعد قریب کی مسجد میں لے گئے اور اپنے زانو پر حافظ صاحب کا سر رکھا اور اسی عالم میں یہ شہید الفت اپنے حقیقی محبوب سے جاملا، جس سے ملنے کے لئے بے حد بے چین تھا۔

سنہ پیدائش اور عمر بوقت شہادت

آپ کی پیدائش کی تاریخ اگرچہ کہیں درج نہیں لیکن حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے معاصر ہونے کے سبب اندازہ یہ ہے کہ ۱۲۳۳ھ سے غالباً چند سال پہلے پیدا ہوئے ہوں، کیوں کہ آپ حاجی صاحب سے کچھ عمر میں بڑے تھے۔ اور حاجی صاحب کا سن پیدائش ۱۲۳۳ھ یعنی ۱۸۱۴ء ہے۔ ادھر آپ کے دوسرے معاصر مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن حافظ صاحب ان سے بھی یقیناً عمر میں بڑے تھے۔ قیاس اور درایت سے

معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب ۱۲۲۵ھ اور ۱۲۳۰ھ کے درمیان میں پیدا ہوئے۔ اس حساب سے شہادت کے وقت آپ کی عمر تقریباً پینتالیس سال تھی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شہادت کے وقت جو سراپا لکھا ہے اس کے دو شعر یہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ڈاڑھی اور سینہ کے بال اس وقت بالکل سیاہ تھے۔ لکھتے ہیں۔

ان کے محاسن میں وہ چمکے غدار شعلے کی جوں دودسیہ میں بہار  
سینے پہ کچھ بال سیاہ ہیں نمود ہیں یہ اسی آتش سوزاں کے دود  
یعنی حافظ صاحب کے رخسار، محاسن، (ڈاڑھی) میں اس طرح چمکتے تھے جس طرح  
سیاہ دھوئیں میں شعلہ چمکتا ہے اور سینے پر کچھ بال تھے اور وہ بھی سیاہ تھے جو سوز عشق الہی کے  
باعث دھوئیں کی بجائے بال بن گئے تھے۔

### تاریخ شہادت

حکیم ضیاء الدین صاحب کے ہم بے حد ممنون ہیں کہ انہوں نے ”محسن یاراں“ جیسا  
رسالہ لکھ کر ہمارے ہاتھوں تک تاریخی سند پہنچائی۔ تاریخ شہادت کے متعلق لکھتے ہیں:

آپ نے ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو پیر کے دن ظہر کے وقت شربت شہادت  
نوش جاں فرمایا۔ آپ کی وفات و شہادت پر جو تاریخیں کہی گئیں وہ یہ ہیں۔

۱..... مؤلف رسالہ (حکیم ضیاء الدین) کے بھائی محمد علاء الدین صاحب رام  
پوری نے ”شہادت (۱۲۷۴) مرشد ہادی“ تاریخ شہادت نکالی۔

۲..... مرزا غالب کے شاگرد مولوی عبدالمسیح صاحب بیدل رام پوری  
(منہار ان) نے یہ قطعہ لکھا جس سے معرکہ جہاد پر بھی تھوڑی سی روشنی پڑتی

ہے:

شہید ہو گئے ضامن علی پاک نہاد جواب جن کا نہ تھا کوئی نسلِ آدم میں

ہوئے شہید مگر اک تماشا دکھلا کر      لہولہاں کیا دشمنوں کو اک دم میں  
 نہ چھوڑی نام کو گردن کہیں نصاریٰ کی      گلو بریدہ ہے سکے بھی ان کا درہم میں  
 جو مارے تیر، تو لگتے ہی جا لیا گوشہ      ہزاروں کا فر بد کیش نے جہنم میں  
 خدا کو پیارے ہوئے آخرش شہید ہوئے      نہ دل میں تاب ہے باقی نہ کچھ توں ہم میں  
 جو پوچھا سن شہادت کہا فلک نے کہ ہائے      ہوئے شہید وہ شاہ جری محرم میں  
 دوسری تاریخ بیدل صاحب نے یوں نکالی۔

بیدل آنوقت کہ حافظ ضامن      رفت و آراست بخت مسند  
 شاہ رضواں شد و گفت ایں تاریخ      حافظ مصحف ایزد آمد  
 میانجی عبدالغفور کوئی بزرگ اس وقت ہوں گے انہوں نے یہ تاریخ نکالی۔  
 حوریں سب مل کر کے بولیں واہ واہ      پیر کے دن خلد میں پیر آگئے  
 ۱۷۷۴

ان میں ایک یہ ہے:

شہ بہشت بریں بود نیز از پئے سال      بفال طرفہ بر آمد شہ بہشت بریں  
 (محسن یاراں)

مذکورہ بالا تاریخوں سے اور بالخصوص مولوی عبدالسمیع بیدل مصنف حمد باری کے اشعار سے حافظ صاحب کے جہاد سے متعلق کچھ اور تاریخی اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حافظ صاحب اگرچہ شہید ہوئے لیکن ہزاروں کافروں کو مار کر شہید ہوئے۔ یہ ہزاروں کافر انگریزوں کی فوج کے تھے جن میں سکھ بھی تھے۔ موصوف کے تاریخی اشعار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس جہاد میں کسی انگریز کو حافظ صاحب نے نہیں چھوڑا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے تیروں سے دشمنوں کو خوب لہولہاں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد صبح سے شروع ہوا اور دوپہر تک جاری رہا اور ظہر تک حافظ صاحب نے بہت سے دشمنوں کو جہنم میں پہنچایا اور پھر بالآخر آپ کی ناف کے نیچے گولی لگی اور شہید ہو گئے۔



جونیف بندے تھے حق کے انہوں نے دنیا میں شہید ہو کے مرے عمر جادواں کے لئے

## جہاد سے پہلے

جہاد سے پہلے حافظ صاحب، حاجی صاحب اور مولانا محمد صاحب کی باہم مجلسوں اور ملاقاتوں کا نقشہ حکیم ضیاء الدین صاحب نے اس طرح کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں:

غرض اس طور طریق خیر و برکت کا یہ مجمع تھا نہ بھون مسجد پیر محمد مرحوم میں جمع ہوا تھا کہ کچھ بیان نہیں کیا جاتا۔ اس آخری وقت میں یہ حضرات نمونہ متقدمین کے پیدا ہوئے تھے اور تھوڑے عرصے میں اس قدر تعلیم و تلقین راہِ خدا جاری ہوئی کہ عالم میں شہرہ ہو گیا۔ ہر طرف سے طالب خدا اور درویش وقت رجوع ہونے لگے اور سب اپنے اپنے حوصلے کے موافق فیضیاب ہوتے تھے، عجیب وہ زمانہ تھا اور عجائب کیفیت وہاں رہتی تھی کہ نہ آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی اور ہر چند غور کیا مگر بہر حال اس مجمع کو رنج و راحت دنیا سے بے فکر پایا۔ بجز یادِ خدا کسی شے کا فکر و اہتمام کرتے نہ دیکھا۔ سبحان اللہ کیا وقت سرور و حضور تھا اور وہ کیسی برکات عام تھیں کہ جو اخلاص سے چند روز بھی اس صحبت میں رہ گیا ایک حال پیدا کر لے گیا۔ یہ بات اس زمانے میں کہیں نہ تھی۔ سالہا سال کے عابد و زاہد دیکھے جو کچھ ان کے قلب میں اثر ذکر پایا، ان حضرات موصوفینِ ادام اللہ فیوضہم کی خدمت میں چند روز کے طالبوں کو اس سے بہتر پایا غرض کہ وہاں اوّل ہی ایک نسبت کا اثر ہو جاتا تھا اور جس کسی طالب نے وساوس و شیطانی کو دفع کیا اور جس عقیدت سے وہاں حاضر ہو کر ہمت کر کے زہد و تقویٰ میں قدم چست رکھا اور جی لگا کر ان بزرگوں کی خدمت میں کچھ تربیت پائی مقام عالی پایا، چنانچہ ایسے کتنے خدام ان حضرات کے موجود ہیں کہ ہر طرح کی نعمت دینی سے مالا مال ہیں اور روز و شب اسی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ (محسن یاراں)



جہاد کے بعد مسجد پیر محمد، تھانہ بھون اور حافظ صاحب کے گھر کی حالت

اب حکیم ضیاء الدین صاحب کے قلم سے جہاد کے بعد ان اصحاب ثلاثہ کی جدائی، تھانہ بھون اور حافظ صاحب کے گھر اور مسجد پیر والی کی ویرانی کا حال سنئے، لکھتے ہیں:

”وا حسرتا! کدھر گیا اور کیا ہوا وہ مجمع خیر اور جماعت محبت آمیز اور وہ صحبت عشق انگیز اور وہ مکانِ دل آویز یعنی مسکن حضرت اقدس کہ اب ویران ہے۔ باوصف اس خستہ حال کے دیکھو وہاں کیا جلوۂ حق ہے اور اس اجڑے مکان میں کیا دل کشادگی ہے؟ خس و خاشاک سے بوئے گل اور نغمہ بلبل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اکثر اہل دل وہاں جا کر مسرور ہوتے ہیں اور فیض اٹھاتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

بز مینیکہ نشاں کف پائے تو بود      سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

حافظ صاحب مرشد کی جدائی میں مرید ضیاء الدین کا حال

حکیم صاحب کی حالت زار خود انہی کی زبانی سنئے۔ لکھتے ہیں:

”آتش مفارقت جی جلائے دیتی ہے۔ دل مجبور گھبراتا ہے۔ سوزش درونی کو بیان کیا چاہتا ہے۔ اور کوئی ذکر خوش نہیں آتا۔ حاصل کلام اس ہنگامے میں جلالِ کبریائی کو جوش و خروش تھا۔ اور مدہوشان شیون الہی کو بھی ایک ولولہ اور ذوق و شوق تھا۔ چنانچہ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ و نور اللہ مرقدہ و قدس سرہ نے بھی ضرور دُنیاۓ دنیہ کا کچھ خیال نہ فرمایا۔ کمر ہمت چست باندھ کر امر حق پر جان و مال کو قربان کیا اور ذوق و شوق دیدارِ الہی میں ایسے مست ہوئے کہ کسی طرح کا تردد نہ ہوا۔ اور تمنائے شربت شہادت و جام کوثر میں ہماری بے کسی کا بھی کچھ خیال نہ فرمایا، سبحان اللہ! کیا ہمتِ مردانِ مددِ خدا کا تماشا دکھلا کر مردانہ اور مشاقانہ چوبیس محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو برسرِ معرکہ ہو کر جام شہادت نوش



فرمایا۔ واہ کیا خوب داد ہمت لے گئے اور داغِ حسرت دے گئے (دوہرہ)  
 ساجن دکھیا کر گئے اور کچھ کو لے گئے ساتھ جنم بچھو ہاوے گئے اور پھر نہ پوچھی بات  
 وفی و مرا خبر نکر دی بر بے کسیم نظر نکر دی  
 اسی رسالے میں حکیم صاحب لکھتے ہیں:

”آہ جس وقت وہ صحبت یاد آتی ہے اور وہ صورت شریف رحمۃ اللہ علیہ نظر میں پھر جاتی ہے، اس دلِ ناشاد پر جو کچھ گذرتا ہے بیان نہیں ہو سکتا۔ ہر چند تڑپ تڑپ کر جی چاہتا ہے کہ مر جاؤں، اس ہر دم کی جان کنی سے چھٹ جاؤں مگر کچھ بس نہیں چلتا۔ اور از خود مرا نہیں جاتا۔ ناچار کلیجہ پکڑ کر بے اختیار اپنی زندگانی پر رو دیتا ہوں۔ جب کہیں صورت مراد کی نہ بندھی اور کچھ بس نہ چلا، بجز عرض حاجت کوئی چارہ نہ دیکھا، اب اکثر یہ دُعا ورد زبان اور مونہں جاں ہے۔

یہ غلام آپ کا اے شاہ محمد ضامن  
 کب تلک حسرت دیدار میں کالے گاؤں

ہم حافظ صاحب کے حالات شہادت، تھانہ بھون کی ویرانی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، حاجی صاحب، مولانا محمد صاحب اور حافظ صاحب کی صحبتوں، اہل علم و حال کی فیض یابیوں کا حال بیان کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ ہمارا مقصد ایک تاریخی دستاویز کو جو اس تفصیل سے کتابوں کے اوراق میں منتشر ہے یکجا کر دینا ضروری تھا، مگر نہ اتنا طویل کہ سمیٹنا مشکل ہو جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ توفیق نے ساتھ دیا تو ہم ایک مستقل کتاب اس مضمون پر علیحدہ لکھیں گے، بہر حال مذکورہ بالا حضرات اور پھر حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب وغیرہما کا تھانہ بھون آجانا اور سب کا ایک جگہ جمع ہونا کیا روح پرور نظارہ ہوتا ہوگا جس کا نقشہ کھینچنا قلم کے ارکان سے باہر ہے۔



## مسجد پیر والی تھانہ بھون کا منظر حکم محمد عمر چر تھاولی کے الفاظ میں

حکیم محمد عمر چر تھاولی مولانا شیخ محمد محدث کے مرید اپنی ایک تحریر میں مسجد پیر والی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

”سبحان اللہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ یہ مسجد عبادت گاہ قدسی نفساں تھی۔ ہمایہ نجوم یہاں کے نمازی تھے، ہم مرتبہ فلک یہاں کی زمین تھی۔ ایک طرف شمال کے حجرے میں مثال قطب شمالی عاشق ذوالجلال شہید لم یزل، دلی ازلی حافظ ضامن علی رحمۃ اللہ علیہ یاد الہی میں مشغول رہتے، ایک جانب جنوب کی سہ دری میں حضرت فیض درجت سلطان زمین ولایت و کرامت ماہ آسمان رفعت و عظمت، درویش صاحب برکت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ سرگرم قال اللہ و قال الرسول رہتے اور مسجد کے سامنے کوگرتوں پڑتوں کے تھانے کو مشرق کے حجرے میں ہمارے مرشد مشفق قدس اللہ سرہ الخالق..... کبھی درس و تدریس طلبہ میں..... کبھی مشاہدات ذات و سلطان اذکار میں مستغرق..... ہر ڈھنگ میں زیر قدم نبی مقبول، باطن میں سب سے الگ ظاہر میں شامل رہتے تھے تینوں صاحب علاوہ اتحاد نسب، ایک پیر (میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی) کے مرید۔ وہ ماہ نور تو وہ بدر، وہ بدر تو وہ خورشید، جب کوئی شخص مرید ہونے کے لئے اس قافلہ میں آتا، ہفتوں بلکہ مہینوں بار بیعت نہ پاتا، جس کے پاس جاتا وہ اپنے سے بہتر دوسرے کو بتلاتا، دن رات پانچ سات طالب علم بحث مابعد و مابقی میں مصروف، کوئی ذکر کلمہ طیب سے مطیب، کوئی تلاوت کلام زیبا سے مزین، کسی کا دل پر اضطراب، صورت سیما، گرمی شغل ہو سے جواب برق مضطر، کسی کا سینہ فگار، ضربات اسم ذات حق سے نمونہ شق القمر، کوئی آٹھوں پہر بارہ تسبیح کے ذکر میں، کوئی نفی و اثبات..... پر نظر جمائے ہوئے، کوئی ذکر خفی

کے ذریعے..... وہ بیان لگائے ہوئے کوئی مجرد ”اللا اللہ“ کی ضربیں لگاتا اسم ذات پڑھتا..... کوئی درویش نامحدود پڑھنے میں دل و جان سے متوجہ، کوئی اداۓ نوافل و وظائف میں اطمینان سے متوجہ، کوئی قرآن خوانی کرتا..... کوئی مراقبات میں جانفشانی کرتا، کوئی تفسیر پڑھتا، حدیث سند کرتا، کوئی فقہ و اصول میں جدوجہد کرتا، کوئی منازل درویشی کی تحقیق میں، کوئی مراحل و مراتب تصوف کی تصدیق میں، طرہ برآن کسی طرف تسبیح خوان کبوتران یا ہو، کسی طرف کچھ قمریان مشغول حق سرؤ اور جب کبھی دو چاروں فگار مریدان رشید حضرت ممدوح الازکار میں سے مثل مولانا قاسم نانوتوی میاں جی کمال الدین چرتھالی غفرلہما اللہ الولیٰ خواجہ حکیم ضیاء الدین راجپوری یا مولوی رشید احمد گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ آتے جاتے اور ہی رنگ جماتے..... جہاں گل وہاں خار، جہاں نیک وہاں کوبیدہ کار جس جگہ یہ سب حضرات وہاں ہم سا بھی وایات کم محنت، غفلت شعار، محض مشاق دیدار، اپنے مرشد کا چہرہ دیکھنے کے مارے سب سے کنارے ٹکٹکی لگائے ہوئے ذکر سے مطلب نہ فکر سے واسطہ، دید کی عید میں شد بد گنوائے ہوئے، ہر شب میں وقت سحر ذکر جبر کا وہ شور بڑھتا کہ دن چڑھے اٹھنے والا بھی نہایت ذوق و شوق سے اول وقت اٹھ کر صبح کی نماز جماعت سے پڑھتا..... ایک طرف گوشہ جنوب احاطہ مسجد (پیر والی) میں مولوی محمد اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مثل پارہ ابر شجر احضر کے پائے میں..... یہ بزرگ مولانا صاحب (شیخ محمد محدث) کے دادا بھائی ہیں، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ہم عصر تھے، عالم و فاضل، درویش کامل، صاحب نظم و نثر تھے ”اصطلاحات الفنون“ آنحضرت کی بہت بڑی کتاب ہے، فی زمانہ نہایت کارآمد ہے ایک مرتبہ طبع ہوئی اب نایاب ہے۔



## مسجد کے بیچ میں کوئی

بیچ میں مسجد کے..... ایک چھوٹی کوئی بڑے موقع سے بنی ہوئی۔ پانی وہ خشک اور شیریں گویا بہشت کی نہر کا سونا ہے..... مسجد

## مسجد کی ہیئت

مسجد کی صورت و شان قطع نظر خوبی عمارت و اسلوبی بنیان، قائل تامل عارفاں، بُرجی نہ مینار، صرف بیچ میں ایک گنبد صورت سر انسان۔ خیال کر کے دیکھو تو ایک آدمی بیٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور غور کر کے صاف مفہوم ہوتا ہے کہ امام اپنے مقتدیوں کو نماز پڑھا کر دُعا مانگ رہا ہے۔ اور یہ بھی پوشیدہ نہیں کہ اسی مسجد تبرک میں پہلے ان حضرات ممدوح سے ایک مدت تک حضرت مفتی الہی بخش کا مدھنوی قدس سرہ الولی رہے

## مفتی الہی بخش صاحب

اور حسب پیش گوئی مولوی معنویؒ اشعار باقی ماندہ دفتر ششم..... کہے.....  
(المختصر لغایت ۱۲۷۲ھ قائم یہ سلسلہ سعید رہا۔ ہر رات، شب برات، ہر روز عید رہا۔)  
(بحوالہ مضمون مولانا نسیم احمد فریدی تذکرہ دیوبند اپریل ۱۹۶۲ء ص: ۳۳-۳۴)

مولانا محمد عمر صاحب چرتھاولی کے مذکورہ بالا تاریخی نوٹ میں حضرات ثلاثہ کے اجتماع مسجد پیر والی کی وضع، طالبین کا ہجوم، ذکر و شغل کے چرچے اور مفتی الہی بخش کا بھی اس مسجد میں قیام اور مولانا روم کی مثنوی کے چھٹے دفتر کی مفتی الہی بخش کے ذریعہ تکمیل ان تمام امور پر نہایت واضح طور پر روشنی پڑتی ہے۔

الغرض حافظ صاحب کی شخصیت ان حضرات میں بڑی ممتاز شخصیت تھی اور جہاد شامی کے دراصل وہی ہیر و نظر آتے ہیں۔ وہ سب کی نظروں میں عزیز اور سب کے دلوں کے محبوب تھے۔ ان کی شہادت کا سب کو بے حد غم ہوا۔ اور جس قدر احباب کو غم ہوا اسی قدر

شہید کو اپنی شہادت کی خوشی ہوئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی ان کے مرثیے میں ۶۵ اشعار لکھے ہیں۔ یہ اشعار حکیم صاحب کے رسالے ”محسن یاراں“ میں درج ہیں جن کا نشان خود حکیم ضیاء الدین صاحب نے دیا ہے اور جن میں سے کچھ اشعار ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

نہ پوچھو ہو رہے ہیں کیوں خفا ہم اس قدر جاں سے  
ہمیں پالا پڑا ہے اب کے غمہائے فراواں سے  
کہیں سے مول لے دے دل، مجھے کچھ اور اے ہدم  
کہ اٹھنے کا نہیں بار غم اس قلب پریشاں سے  
چھپا آنکھوں سے وہ نور مجسم خاک میں جا کر  
کہ جس کا خال پا بہتر تھا اس مہر درخشاں سے  
شہید راہِ حق، حافظ محمد ضامن چشتی  
بنایا تھا جسے حق نے ملا کر عشق و عرفاں سے  
فراقِ یار میں جینا تعجب ہے ولے ہدم  
اجل سے اٹھ سکے شاید نہ ہم بار گناہاں سے  
نظر آئے گی یارب پھر بھی وہ صورت کبھی ہم کو  
سنیں گے پھر بھی وہ آواز ان لب ہائے خنداں سے  
کسی کا کیا گیا پر رنجِ فرقت کی مصیبت کو  
کوئی جا کر کے ٹک پوچھے ضیاء الدین نالاں سے  
ہوئی ہم سے خطا یا تھی کششِ حُبِ الہی کی  
کوئی پوچھے سببِ رحلت کا اس سالارِ خوباں سے

گناہوں کے سبب گرہم نہیں تھے لائقِ صحبت  
 تو ہم کو بخشوالینا کچھ کہہ سن کے رحماں سے  
 اگر ممنوع تھا ہم سے گنہگاروں کا لے چلنا  
 تو تنہا اس طرح جانا ہی نازیبا ہے سلطان سے  
 اگر قاصد مجھے کوئی دہاں تک کا ہم پہنچے  
 تو کہلا کر کے بھیجوں یوں میں اس سالارِ نیکاں سے  
 مبارک ہو تمہیں وصلِ خدا، خلد بریں میں، پر  
 ہمیں یوں چھوڑ کر تنہا تمہیں جانا نہ تھا یاں سے  
 غمِ فرقت میں یاں گزرے ہے پر کچھ بن نہیں پڑتی  
 تمہیں فرصت نہیں واں لذتِ دیدارِ یزداں سے  
 بنے تھے یوں تو ہم روزِ ازل سے غم اٹھانے کو  
 نہ تھی پر یہ خبر ہوں گے الگ بھی تیرے داماں سے  
 تمہارے ہجر میں جانِ جہاں کچھ بن نہیں آتا  
 دلِ حسرت زدہ گھبرائے ہے سیرِ گلستاں سے  
 دلِ مایوس کی کوئی نہیں صورتِ تسلی کی  
 مگر ہاں سرِ نکالو تم اگر گنجِ شہیداں سے  
 تمہاری بزم پر انوار جب یاد آئے ہے ہم کو  
 تو ایک شعلہ سا اٹھتا ہے ہمارے قلبِ سوزاں سے  
 یہ مرثیہ بھی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اس کا ایک مصرعہ  
 تو تنہا اس طرح جانا بھی نازیبا ہے سلطان سے



اس مصرعے میں سلطان کا لفظ بتاتا ہے کہ حافظ صاحب جہاد میں بڑے سرگرم تھے۔ اور تمام علماء کے نزدیک صحیح معنی میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کر کے شہادت کا مقام حاصل کیا۔

ہم یہاں پہنچ کر حافظ صاحب کے ذکر مبارک کو ختم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاید ان کے اس تذکرے سے ہمیں سرمایہٴ سعادت حاصل ہو جائے۔ لہذا پھر حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے حالات کی طرف اپنے قلم کی باگ موڑتے ہیں جن کا سلسلہ ہم نے شروع کیا ہے۔

## پھر حاجی امداد اللہ صاحب کی طرف

### حاجی صاحب کا پہلا حج ۱۲۱۱ھ میں

حاجی صاحب نے پہلا حج ۱۲۱۱ھ میں ادا کیا جیسا کہ آپ کے ایک قول سے واضح ہے۔ پہلے حج کے موقع پر حاجی صاحب کی جدائی سے متاثر ہو کر مولانا محمد محدث تھانوی نے چند اشعار لکھے ہیں جو آپ کی مثنوی میں موجود ہیں۔

اے غذائے رُوح امدادِ الہ	آہ قدرے تو کسی نشاخت آہ
حیف راہی حرم تنہا شدی	ناگہاں چوں جاں جدا از ماشدی
آنچہ وصف تو مرادِ باطن است	راز دارِ گوش حافظِ ضامن است
گومن تو ہر دوائے ہم پیر من	خولجہ تا شائیم دہم بزم سخن
لیکن باشم چاکر تو گر بجاں	موجبِ فخر است پیدا و نہاں

پہلے حج کے بعد آپ ہندوستان اپنے وطن تھانہ بھون کی طرف لوٹے لیکن کعبۃ اللہ کے جوار اور پڑوس میں رہنے کا جذبہ اسی وقت سے دل میں موجیں مارنے لگا تھا، اس لئے اسی وقت ہجرت کا ارادہ فرمایا۔

## جنگ آزادی کے بعد

جنگ آزادی اور جہاد شامی کے بعد جب حکومت فرنگ کی طرف سے گرفتاری کے احکامات صادر ہوئے تو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تھانہ بھون اور خانقاہ کو خیر باد کہا، اس اثنا میں آپ گنگوہ، انبالہ، تنکھری، پنچلا سہ میں مقیم رہے اور پھر سند کی راہ سے کراچی پہنچے۔ اس اثنا میں حکومت کے افراد آپ کی گرفتاری کی فکر میں برابر رہے لیکن یہ بھی آپ کی کرامت سمجھئے کہ حکومت آپ کو گرفتار کرنے سے قاصر رہی۔ کراچی تک پہنچنے اور مریدین اور معتقدین کے یہاں قیام کرنے میں آپ کو تقریباً سوا دو سال گزر گئے۔ اسی سفر میں آپ نے گذشتہ اوراق میں راؤ عبداللہ صاحب کے یہاں قیام کیا۔ ضلع کے کلکٹر کو اطلاع، اس کا راؤ صاحب کے گھر میں گھوڑے دیکھنے کے بہانے داخل ہونا اور حاجی صاحب کا اس کو دکھائی نہ دینا پڑھا ہے۔ بہر حال حاجی صاحب جمادی الاخریٰ ۱۲۷۶ھ میں پنجاب اور سندھ سے ہوتے ہوئے ذیقعدہ ۱۲۷۶ھ میں مکہ معظمہ پہنچے۔ لیکن حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۷۷ھ میں روانگی لکھتے ہیں جیسا کہ سوانح قاسمی میں آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

حکیم ضیاء الدین صاحب کا عقیدہ ہے کہ حاجی صاحب اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکہ معظمہ کو ہجرت فرما گئے چنانچہ مولس یا راں میں وہ لکھتے ہیں:

ناگاہ جناب حاجی صاحب قبلہ سلمہ اللہ تعالیٰ کو جناب باری سے الہام ہوا کہ  
بیت اللہ کو آؤ، چنانچہ وہ بھی بالہام حق بیت اللہ شریف کو تشریف لئے گئے.....  
ہائے بیدادی کیسے کیسے مربی جدا ہوئے اس پر بھی ہم سر پھرے جیتے رہے.....  
یہ نظم حسب حال ہے۔

چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تجمل تھا  
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اک شور تھا غل تھا

خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خاک گلشن میں  
بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

### مکہ معظمہ میں غربت کی زندگی

جب آپ مکہ معظمہ پہنچے اور ہمارے خیال میں انہیں انگریزوں کی حکومت میں ہندوستان میں رہنا گوارا نہ ہوا تو وہاں آپ کو سخت تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی کئی وقت بغیر خور و نوش فاتے سے گذرتے۔ اپنی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

”جب میں اول مکہ مکرمہ آیا فقر و فاقہ کی یہاں تک نوبت پہنچی کہ نوروز تک بجز زم زم شریف کے کچھ نہ ملا۔ تین چار دن کے بعد بعض احباب سے قرض مانگا۔ انہوں نے باوجود وسعت کے انکار کیا، مجھے معلوم ہوا کہ یہ امتحان ہے پس عبد کر لیا کہ اب قرض بھی نہ لوں گا اور ضعف سے یہ حالت تھی کہ نشست و برخاست دشوار تھی۔“ (کرامات امدادیہ ص: ۳۲)

صاحبِ دل خوب جانتے ہیں کہ ان حالات میں اولیائے کرام کا خاص امتحان ہوتا ہے۔ توکل کا مقام اور اس پر ثبات قدمی کا سبق یہیں سے ملتا ہے۔ پھر جیسا اور جس قدر جس کا توکل زیادہ ہوگا اسی قدر اس کے لئے غیب کے خزانے کھل جاتے ہیں۔ اور ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ کے مطابق جہاں سے سان گمان بھی نہیں ہوتا رزق ملتا ہے، امام غزالیؒ نے توکل کے چار مقامات لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ توکل کرنے والا اپنے آپ کو سرتاپا خدائے تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے، اور جس طرح سے ماں باپ بچے کی خوراک و پوشاک کا خود پورے طور پر خیال رکھتے ہیں اور بچے کو پروا بھی نہیں ہوتی، یہی حال توکل کے آخری مقام کا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ آخر یہ بیشمار پرندے جو صبح کو اپنے آشیانوں سے اڑ کر جاتے ہیں شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں، ان سب کا خدا ہی تو ضامن ہے۔

## سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

ایک روز سلطان باہو جنگل میں بھوکے پیاسے تھے، ہمارے روزی کی کوئی شکل نہ تھی، مقام تو کل زوروں پر تھا، ناگاہ پاس سے ایک ہرن گذرا جس کے سینگ میں بھنی ہوئی مچھلی بندھی ہوئی تھی، آپ نے اُسے لے لیا نوش فرمایا۔ اس وقت مقام حیرت میں فرمایا۔

عجب دیدم تماشہ شیخ باہو      برات عاشقان بر شاخ آہو

## چار محمدوں کی حالت زار اور نبی امداد

یا قوت رومی نے کتاب السمعانی سے اپنی کتاب ارشاد الاریب میں نقل کیا ہے کہ محمد بن جریر طبری، محمد بن اسحاق بن خزیمہ، محمد بن نصر مروزی اور محمد بن ہارون رویانی چاروں کے چاروں سفر کرتے مصر میں جمع ہو گئے۔ جو کچھ پاس تھا ختم ہو گیا۔ جس مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے ایک رات اس میں سب مل کر بیٹھے اور یہ طے پایا کہ قرعہ اندازی کی جائے اور جس کے نام قرعہ نکلے وہ لوگوں سے ساتھیوں کے لئے کھانا حاصل کرے۔ اچانک قرعہ محمد بن اسحاق کے نام نکل آیا انہیں کسی کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہوئے شرم آئی۔ آپ نے وضو کیا اور نماز خیر پڑھنی شروع کر دی۔ ابھی نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دیکھا تو بادشاہ کا خواجہ سرا تھا۔ جو حاکم مصر کی طرف سے آیا تھا۔ اس نے پوچھا تم میں سے محمد بن نصر کون ہے۔ رفقاء نے ان کی طرف اشارہ کیا تو خواجہ سرانے ایک تھیلی نکالی اور ان کو دی جس میں پچاس دینار تھے اور ان کو دے دی۔ پھر اس نے پوچھا کہ محمد بن جریر کون صاحب ہیں، اُن کو بھی پچاس دینار کی تھیلی پیش کی، پھر خواجہ سرانے محمد بن ہارون کے متعلق پوچھا، ان کو بھی پچاس دینار کی تھیلی عنایت کی، آخر میں محمد بن اسحاق کے متعلق دریافت کیا تو رفقاء نے ان کی طرف اشارہ کیا جو ابھی صلوٰۃ الخیر میں مصروف تھے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو ان کو بھی پچاس دینار کی تھیلی گزرائی۔ اور پھر بولا کہ امیر مصر دو پہر میں آرام کر رہے تھے تو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان سے کوئی کہہ رہا ہے کہ محمد

(چار محمد) سخت تکلیف میں ہیں۔ اس لئے امیر نے یہ روپیہ بھیجا ہے اور کہا ہے کہ جب یہ رقم خرچ ہو جائے تو امیر کو اطلاع دیجئے تاکہ مزید روپیہ بھیج دیا جائے۔

### حاجی صاحب کے ساتھ بھی قدرت کا خصوصی معاملہ

اس قسم کے بیسیوں واقعات اللہ والوں کے ہمارے علم میں ہیں جن کو جھٹلانا بہت مشکل ہے اور عقل سلیم ان کو ماننے پر مجبور ہے۔ یہی کچھ واقعہ حاجی امداد اللہ صاحب کے ساتھ ہوا۔ جب حاجی صاحب کو نو دین نہایت مصیبت کے گذر گئے تو کیا ہوا۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی لکھتے ہیں:

”رات میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس الدسرہ العزیز کو خواب میں دیکھا کہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اپنے باورچی خانے کا ناظم اور مہتمم بنا دیا۔ صبح کو اندھیرے میں ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا، میں نے دروازہ کھولا تو اس نے ایک تھیلی دی جس میں سو ریال (حجازی روپیہ) تھے۔ اور چلا گیا۔

غرض حاجی صاحب کو پھر خورد و نوش کی تکلیف نہیں ہوئی اور معیشت کے لئے ہر ماہ سو روپیہ کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتے تھے۔

### ہجرت سے پہلے مالی حالت

جب آپ تھانہ بھون اپنے وطن میں قیام پذیر تھے تو آپ کی مالی حالت بہتر تھی۔ جانداد کا معقول حصہ آپ کے پاس تھا لیکن اپنی تمام زرعی جائیداد اور مکان اپنے بھائی کو دے دیا اور اپنے آپ اسی پیر محمد والی مسجد کے ایک حجرے میں رہنے لگے۔

### مکہ معظمہ میں قیام

جب آپ ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ پہنچے تو اول اول چند سال صفا پہاڑی پر اسماعیل سینڈھ کے ربا۔ رباط (گھر) میں ایک خنودہ (گوشے) میں معتکف رہے۔ پھر بعض یاران طریقت

نے حارۃ الباب کے محلے میں ایک مکان میں قیام کی درخواست کی، بلکہ بہت اصرار کیا تب آپ نے دلجوئی کو وہاں رہنا اختیار فرمایا۔

### شہرت و ولایت

جوں جوں آپ کا مکے میں قیام کا زمانہ گذرتا گیا اہل مکہ اور باہر کے حجاج میں آپ کے صاحب ولایت ہونے کی شہرت ہوتی چلی گئی اور بڑے بڑے صاحب نسبت بزرگوں نے آپ کی خدا دوستی کو تسلیم کر لیا۔ قیام مکہ مکرمہ کے اثنا میں بھی رشد و ہدایت اور درسِ مثنوی کا سلسلہ جاری رہا۔ ہزاروں لوگوں کو روحانی فیض پہنچا۔

### نکاحِ اوّل اور اولاد

آپ نے پچاس، پچپن سال تک شادی نہیں کی، کسی اللہ والے کا بغیر شادی رہنا سنت کے خلاف ہے۔ ہجرت کے بعد غیبی اشارہ ہوا کہ عارف درویش کو یہ موزوں اور مناسب نہیں کہ وہ ایسی سنت سے کنارہ کش رہے۔ لہذا آپ نے معتقدین کے اور بی بی نورن صاحب ساکنہ کلکتہ زوجہ سید حیدر علی بنارسی کے اصرار پر بی بی خدیجہ سے جو کہ بی بی نورن کی نواسی تھیں ۲۱ رمضان المبارک ۱۲۸۱ھ کو بعوض مہر ساٹھ ریال جو ہندوستان اور پاکستان کے ایک سو پچیس روپیہ کے برابر ہوتے ہیں نکاح کر لیا۔ لیکن ان سے کوئی بچہ نہیں ہوا اور مرحومہ کا انتقال ہو گیا۔

### دوسرا اور تیسرا نکاح

دورانِ قیامِ وطن میں آپ کی نسبت بی بی خیر النساء سے ہوئی تھی لیکن نکاح نہ ہو سکا تھا۔ حاجی صاحب نے ہجرت کی اور ان کا کسی اور شخص سے نکاح ہو گیا۔ لیکن قدرت الہی سے وہ بیوہ ہوئیں اور حج کے لئے مکہ معظمہ آئیں تو حضرت کا پھر ان سے نکاح ہوا۔ یہ خاتون بے حد عابدہ اور زاہدہ تھیں لیکن حاجی صاحب کی خدمت سے ناپید ہونے کے باعث قاصر



تھیں۔ انہی بی بی کی موجودگی میں ایک اور بی بی قصبہ رام پور منہارن کی حضرت سے مرید بھی تھیں اور گھر کا کام کاج بھی کیا کرتی تھیں۔ حاجی صاحب بالا خانے پر رہتے۔ نیچے آنے اور اوپر جانے کے لئے ضرورت تھی کہ کوئی سہارا دے۔ حاجی صاحب کسی نامحرم کے ہاتھ سے چھوانا بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ اس لئے اس خاتون نے عرض کیا کہ مجھ سے نکاح کر لیجئے تاکہ خدمت میں تکلیف نہ رہے چنانچہ تیسرا نکاح ان سے ہوا، ان کا نام بی بی امت اللہ تھا، مگر ان میں سے کسی سے بھی اولاد نہ ہوئی۔

### اخلاق و عادات اور حاجی صاحب کا سراپا

آپ کا سر بڑا، پیشانی کشادہ بلند، ابرو وسیع و خمدار، آنکھیں بڑی، رنگ گندمی، نحیف الجسم، درمیانہ قد ایک گونہ طوالت کی طرف مائل، فصیح البیان، شیریں کلام، صاحب مروت، صاحب اخلاق، بشارت سے کلام فرماتے، سنت کے سختی سے پابندی کرتے تھے۔ جسم نحیف اور کمزور اس پر مجاہدات و ریاضات، کھانے اور سونے کی قلت اور سب سے زیادہ خدا تعالیٰ کا عشق جس نے ہڈیوں تک کو گھلادیا تھا اور آخر عمر میں کروٹ تک لینا دشوار تھا۔ (ثائم امدادیہ و امداد ص ۲۰۰)

### رواداری و وسعت قلبی

حاجی صاحب کی ایک خاص صفت جو اولیائے کرام میں ان کا خاص طرہ امتیاز تھا ان کی وسعت قلبی اور رواداری تھی۔ کسی کی دل شکنی تو ان کے مذہب میں قطعاً روانہ تھی۔ کسی سے معاصرانہ چشمک کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ اس قسم کے مصالحت تھے کہ دیوبندی، بریلوی، غیر مقلد غرض کہ ہر عقیدے کے لوگ آپ سے مرید تھے، لیکن کسی کے عقیدے سے غرض نہ رکھتے تھے صرف اصلاح سے کام تھا۔ ایک دفعہ ایک غیر مقلد آپ کا مرید ہو گیا۔ لیکن اس نے جلدی آئین بالجبر اور رفع یدین ترک کر دیا، آپ نے اس کو بلا کر فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا

ہے کہ تم نے آمین بالجبر اور رفع یدین ترک کر دیا ہے۔ کیا یہ خود ایسا کیا ہے یا ہماری وجہ سے۔ اگر ہماری وجہ سے کیا ہے تو بھائی ایسا نہ کرو۔ میں ترک سنت کا باعث کیوں بنوں۔ سنت یہ بھی ہے اور وہ بھی، اور اگر اپنی مرضی سے ایسا کیا ہے تو خیر اس نے عرض کیا حضرت! میں نے تو اپنی مرضی سے ایسا کیا ہے۔

اس حکایت سے حاجی صاحب کی وسعت قلبی کا گہرا نقشِ دل پر ثبت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی وسعت خیالی کے باعث آپ سے ہر عقیدے کا مسلمان بخوشی بیعت کرتا اور وہ خود بخود اصلاح کی طرف مائل ہو جاتا۔ آپ کا طریقہ ہر شخص سے رواداری اور نرمی کا تھا۔

### معاصرین، خلفا اور مریدین

یوں تو آپ کے معاصرین اور ہم عصر حضرات میں سے بہت سے تھے، لیکن خصوصیت سے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی و مہاجر مدنی، مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر کی، مولانا شیخ محمد محدث تھانوی، حافظ محمد ضامن شہید، مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری، مولانا فیض الحسن صاحب ادیب سہارنپوری شارح حماسہ پروفیسر اور نٹھل کالج لاہور خصوصی ہم عصر تھے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب تو مکہ معظمہ میں بھی حضرت کے رفیق رہے۔ آپ کیرانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے مشہور مناظر تھے۔ آپ نے اور مولانا محمد قاسم صاحب نے اُس نازک وقت اسلام کی تائید کی جب کہ ہندوستان میں عیسائی پادریوں کی انگریزی حکومت کی وجہ سے یلغار تھی اور مزید براں آریہ پنڈتوں نے بھی سر نکالا ہوا تھا۔ اس وقت مولانا رحمت اللہ صاحب نے پادریوں اور پنڈتوں کے دانت کھنے کر دیئے تھے۔ مولانا رحمت اللہ نے مناظرے میں کئی لا جواب کتابیں لکھی ہیں جن کے دوسری زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے تھے اور ان کی بڑی مقبولیت ہوئی تھی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں آپ بھی مکہ معظمہ کو ہجرت





کر گئے تھے چنانچہ وہاں آپ نے مدرسہ صولتیہ کی بنیاد ڈالی اور کلکتے کی صولت بیگم کے نام سے جنہوں نے اپنے حج کے زمانے میں مدرسہ صولتیہ کے لئے مولانا کی گزارش پر روپیہ دیا تھا اس کو منسوب کیا۔ یہ مدرسہ ابھی تک محلہ حارۃ الباب مکہ معظمہ میں دو منزلہ عمارت میں موجود ہے اور اس کے برابر میں مولانا کی ہی تعمیر کرائی ہوئی مسجد ہے جو مدرسہ صولتیہ کے دفتر کے سامنے ہے۔ مولانا کا مزار مکہ معظمہ ہی میں ہے۔ آپ کے برادر زادہ مولانا محمد سعید تھے جو آپ کی خدمت میں مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے مدرسے کا انتظام ۱۲ سال کی عمر میں ان کے سپرد کر دیا تھا۔ بعد ازاں مولانا محمد سلیم صاحب ان کے فرزند اس مدرسے کے ناظم بنے جو ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ اس مدرسے میں کبھی سات سو تک طلبہ کی تعداد تھی۔ بہر حال مولانا رحمت اللہ صاحب حاجی صاحب کے خاص رفقا میں سے تھے۔

حاجی صاحب کے فریدوں میں سے یوں تو تقریباً پانسو علماء تھے اور عوام کی تعداد بتانا مشکل ہے۔ مگر خاص خاص خلفاء میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، حاجی عابد حسین صاحب دیوبندی، مولانا ذوالفقار علی صاحب شارح حماسہ و متنبی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا عبد السمیع صاحب رام پوری مصنف حمد باری، مولانا خلیل احمد صاحب بہار پوری خاص خاص ہستیاں ہیں۔

### حاجی صاحب کا کتب خانہ

حاجی صاحب جب بڑھاپے کے باعث بہت کمزور ہو گئے تو آپ نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب کو جنہوں نے خانقاہ امدادیہ کو ۱۸۵۷ء میں جل کر خاکستر ہونے کے بعد پھر بسایا اور صحیح معنی میں حاجی صاحب کی جانشینی کی، لکھا کہ میرا کتب خانہ آکر لے جاؤ، یہ خطوط مسلسل آتے رہے اور حضرت تھانوی نے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ بھی کر لیا، لیکن اس اثنا



میں حاجی صاحب کا انتقال ہو گیا، اور یہ کتب خانہ مدرسہ صولتیہ کی لائبریری میں بطور وقف پہنچ گیا۔ میں نے جون ۱۹۵۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ میں حاجی صاحب کے کتب خانے کی اکثر قلمی اور مطبوعہ کتابیں مولوی شمیم احمد صاحب خلف الرشید مولانا سلیم احمد صاحب موجودہ مہتمم مدرسہ صولتیہ کی معیت میں دیکھی ہیں۔ کتابوں پر حاجی صاحب کی مہریں بھی لگی ہوئی نظر سے گذریں، ضرورت اس بات کی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا کوئی نمائندہ حاجی صاحب کی تمام کتابوں کا جائزہ لے اور اگر کوئی کتاب غیر مطبوعہ ہے تو اس کو چھپوائے، جیسا کہ حکیم ضیاء الدین صاحب کا رسالہ ”محسن یاراں“ وغیرہ۔ اس کتب خانے میں بہت سی قلمی اور مطبوعہ نادر کتابیں ہیں جو استفادہ اور مطالعہ کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

### حاجی صاحب کے ورثہ کے معظمہ میں

حاجی صاحب کے حقیقی بیٹے حافظ احمد حسین صاحب تھانہ بھون سے آپ کی زندگی میں ہی ہجرت کر کے آپ کی مرضی کے مطابق مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے۔ حافظ صاحب کی شادی مکہ معظمہ میں گاما والوں میں ہوئی تھی جو سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ حافظ صاحب کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ ان کی چھوٹی لڑکی مسماۃ خدیجہ کی شادی مکہ معظمہ کے مشہور معلم شیخ عمر اکبر سے ۱۳۳۲ھ میں ہوئی تھی، ان کا انتقال ہو گیا تھا، لیکن شیخ عمر صاحب اب بھی زندہ ہیں اور عمر کی آخری گھڑیاں گزار رہے ہیں، اس وقت وہ ستر سال کے ہیں۔ وہ مکہ مکرمہ کے امراء میں شمار ہوتے ہیں اور نہایت بااخلاق، مہمان نواز اور حجاج کے بے حد ہمدرد ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں وہ میرے بھی معلم تھے، اور میں نے ایام حج میں اکثر ان کے ساتھ اپنے پیارے لمحے گزارے ہیں اور ان کے دسترخوان پر کھانے کھائے ہیں۔ انہوں نے چودہ سال کی عمر سے تعلیمی اختیار کی۔ نہایت ظریف الطبع، شیریں زبان اور اہل علم ہیں۔ ان کا اصلی وطن انبالہ (پنجاب ہندوستان) تھا۔ عمر اکبر صاحب کے والد صاحب شیخ محمد اکبر جنگ آزادی ۱۹۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں اپنی پھوپھی صاحبہ کے ہمراہ حاجی امداد



اللہ صاحب کے بعد جب کہ ان کی عمر سات سال کی تھی پہنچے۔ ان کے جوان ہونے اور شادی کے بعد شیخ عمر اکبر پیدا ہوئے۔ شیخ عمر اکبر تین سال کے تھے کہ حاجی صاحب موجود تھے اور ان کو گود میں لے کر بہت پیار کرتے تھے اور ان کو بیٹا کہا کرتے تھے۔ ان کے تین صاحبزادے سب سے بڑے شیخ عبداللہ، دوسرے شیخ سراج اور تیسرے شیخ عثمان حجاج کے بہت خدمت گزار اور منکسر المزاج ہیں۔ عثمان صاحب ابھی چھوٹے ہی تھے کہ حاجی صاحب کے بھتیجے احمد حسین صاحب کی صاحبزادی، شیخ عمر اکبر کی بیوی اور عثمان صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر عمر اکبر صاحب نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ پس حاجی صاحب کی آخری دو بیویاں اور ان کے بھتیجے احمد حسین صاحب اور بعد کے وارث بی بی خدیجہ اور شیخ عمر اکبر ہی ہیں۔ یہ سب معلومات مجھے شیخ عمر اکبر صاحب سے ہی حاصل ہوئی ہیں۔

### حافظ صاحب کا ترکہ اور تبرکات

ہم حاجی صاحب کی وفات کے ذکر سے پہلے ہی حاجی صاحب کے ورثہ اور ترکہ کے ذکر کر رہے ہیں جو وفات کے ذکر کے بعد ہی ہونا چاہئے تھا، مگر بہر حال یہ ذکر آگیا تو کیا مضائقہ ہے۔ مولانا سلیم احمد صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ نے بتایا کہ حاجی صاحب کے انتقال کے وقت ان کے سامان میں ایک عصاء، تین تنکے جن میں سے ایک چڑے کا تھا اور اس پر اشعار تھے۔ دو جوڑے سردی کے اور دو جوڑے گرمی کے اور بقیہ کل ستر ریال (حجازی روپیہ) چھوڑا تھا۔ مولانا سلیم احمد صاحب کے پاس حاجی صاحب کا ایک نام چینی کا پیکدان ہے جس کو وہ آج کل استعمال کرتے ہیں اور یہ کسی نواب صاحب غالباً نواب محمد یوسف صاحب نے حاجی صاحب کو تحفے میں پیش کیا تھا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کے یہاں کراچی میں جہاں حضرت نانوتویؒ، اور حضرت شیخ الہندؒ، حضرت گنگوہیؒ رحمہم اللہ علیہم کے بالوں اور خطوط کے تبرکات ہیں ان میں حاجی صاحب کے پیر ابن کا ایک ٹکڑا بھی ہے، جس میں سے اس ناچیز کے پاس بھی اس کا کچھ حصہ موجود ہے۔

## وفات

مگر وہ وقت بھی آپہنچا کہ اس باخدا انسان کی عمر کا جام لبریز ہو گیا اور آپ ۱۲ یا ۱۳ جمادی الاخریٰ ۷۳۱ھ کو بروز بدھ صبح کی اذان کے وقت چوراسی سال تین ماہ بیس دن کی عمر میں محبوب حقیقی سے جا ملے اور جنت المعلیٰ مقبرہ اہل مکہ میں (جہاں حضرت خدیجہ کا مزار ہے) مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر مکی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ تقریباً چالیس سال آپ ہندوستان میں رہے اور چالیس سال کی عمر کا حصہ آپ نے بیت اللہ کے پڑوس میں گزار دیا۔ کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق  
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما







## باب دوم

# علمیات

## حاجی صاحب کی تصنیفات

ہم نے گذشتہ اوراق میں حاجی صاحب کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ سادہ طور پر حسب ضرورت پیش کیا ہے۔ اسی میں آپ کی علمی لیاقت اور محدود و مختصر تحصیل علم کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ آپ نے اگرچہ علوم و فنون میں فضیلت حاصل نہیں کی تھی لیکن آپ پر علم لدنی کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔

اس مختصر سی تعلیم کے باوجود آپ نے کئی کتابیں اور رسالے تحریر فرمائے جو آپ کی علمی لیاقت کے آئینہ دار ہیں، یہ تصنیفات اگرچہ مختصر ہیں مگر ان میں مضامین کی رُوح الفاظ کے جسم میں ڈال دی گئی ہے اور ایک ایک جملے میں علماء اور صوفیاء کے لئے حقائق اور معرفت کے خزانے بھر دئے ہیں تصنیفات حسب ذیل ہیں:

۱..... مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کا حاشیہ فارسی زبان میں۔

۲..... ضیاء القلوب بزبان فارسی۔

۳..... ارشاد مرشد (اردو)

۴..... وحدۃ الوجود (فارسی)

۵..... ہفت مسئلہ (اردو)

۶..... گلزارِ معرفت (اردو کلام)

۷.....تحفۃ العشاق (اردو مثنوی)

۸.....جہاد اکبر (مثنوی اردو)

۹.....غذائے روح (اردو مثنوی)

۱۰.....درد نامہ رُغمناک (اردو کلام)

۱۱.....مکتوبات فارسی وارو۔

ان سب کے مجموعے کو یک جا جمع کر کے اُس کا نام ”کلیات امدادیہ“ رکھ دیا ہے لیکن جن صاحب نے بھی یہ نام رکھا ستم ظریفی سے خالی نہیں۔ اس لئے کہ اس نام سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ حاجی صاحب کے اشعار، غزلیات اور نظموں کا مجموعہ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریس والوں نے غالباً یہ نام دیا ہے۔ الحاصل ہم حاجی صاحب کی تصنیفات پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

### مثنوی مولانا رومی

مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی دنیا کی مشہور کتابوں میں سے ایک کتاب ہے۔ اس کی معنوی بلندی کا حال یہ ہے کہ۔

شش جہت را نور و زیں شش صُحف کے یطوف حلہ من لم یطف

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآن در زبان پہلوی

اور جہاں تک مثنوی کی ادبی اور لسانی قوت کا اثر ہے اس کے متعلق بعض ادبائے فارسی نے کہا ہے کہ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی ادبی اور لسانی حیثیت سے مستند نہیں کہی جاسکتی، کیوں کہ اس میں زبان کی حیثیت سے کوتاہیاں ہیں۔ لیکن ارواحِ ثلاثہ میں جو امیر الروایات، روایات الطیب، اور اشرف التنبیہات کا مجموعہ ہے مولانا اشرف علی صاحب کی روایت یہ ہے کہ:

حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب قدس سرہ العزیز فرماتے تھے کہ میں نے

مثنوی کے بارے میں مومن خاں شاعر سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا رومی کا کلام شاعری کی حیثیت سے حجت نہیں۔ مومن خاں نے کہا کہ کسی جاہل کا قول ہوگا کہ ان کا کلام شاعری کی حیثیت سے بھی بہت مستند ہے۔

(ارواحِ ثلاثہ: ص ۱۸۱-۱۸۲)

## مثنوی کی تالیف کا سبب

مولانا اشرف علی صاحب امداد المشتاق میں تحریر فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب نے فرمایا:

مولانا روم کے والد اپنے وطن بلخ سے باقصد حج و زیارت مدینہ طیبہ مع مولانا (روم) کے روانہ ہوئے۔ نیشاپور میں مولانا فرید الدین عطار کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مولانا عطار نے ان سے پوچھا کہ کہاں کا عزم ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ”حرمین شریفین کا۔“ شیخ فرید الدین نے فرمایا کہ تمہارے لڑکے کے سینہ بے کینہ میں دریائے معرفت جوش زن ہے اس کی بہت حفاظت رکھو اور اس سفر میں اس کو ہمراہ نہ لے جاؤ اور اپنی تصنیف الہی نامہ مولانا روم کو دے کر فرمایا کہ اس کو دیکھا کرو تمہارے دیکھنے سے اس کو شرف ہوگا۔ مولانا کے والد نے عزم حج فسخ کر کے ملک روم میں شہر قونیہ میں اقامت اختیار کی بحیال تبرک مولانا (رومی) ”الہی نامہ“ کو روم میں رکھتے تھے۔ اسی طرز پر مثنوی تحریر فرمائی اور مولانا عطار کی تعریف میں ”ہفت شہر عشق عطار“ الخ کہا۔ (حاجی صاحب نے) فرمایا کہ جو نعمت مولانا روم کو حاصل تھی اگر تمام عمر کی جانفشانی سے بھی حاصل ہو اس کا شکر یہ قیامت تک ادا ہونا دشوار ہے..... فرمایا (یعنی حاجی صاحب نے) کہنا مولانا روم کہیں تشریف لے جاتے تھے اور جماعت طلبہ ہر کاب تھی مولانا شمس تبریز نے آپ کی سواری کی باگ پکڑ کے پوچھا کہ حضرت بایزید بسطامی قَوْمًا أَعْظَمَ شَانِي (میری شان کیا بلند ہے) کا



دم بھرتے ہیں اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ (ہم نے تجھے معرفت کے حق کی طرح نہیں پہچانا) ورد فرماتے ہیں۔ پس افضل کون ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم حوصلہ عالی رکھتے تھے لہذا باوجود کمال معرفت کے مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ فرماتے تھے اور حضرت بایزید بسطامی باعث کم حوصلگی و نقصانِ ہمت کے نعرہٴ مَاعْظَمَ شَانِی کا مارتے تھے، پس افضل وہی ہے کہ ہمت عالی و حوصلہ بلند رکھتا ہے، یہ سن کر حضرت شمس تبریز نے شادان و فرحاں ہو کر ایک چیخ ماری، اس چیخ نے مولانا روم کا مطلب پورا کر دیا اور مولانا شمس تبریز کا عاشق بنادیا۔ اس کے بعد حضرت شمس تبریز غائب ہو گئے، مولانا کو آپ کے عشق کا غلبہ ہو چکا تھا لہذا بہت پریشان ہو کر آپ کے متلاشی ہوئے۔ چونکہ حضرت شمس تبریز طریقہٴ ملامتیہ رکھتے تھے اس وجہ سے گانے والوں کے ساتھ رہا کرتے تھے، مولانا روم کو ایک جگہ پتہ ملا کہ مولانا شمس تبریز ایک جگہ نے (بانسری) بجارہے ہیں۔ یہ سن کر وہاں پہنچے اور حضرت سے لپٹ گئے۔ حضرت شمس صاحب اس وقت اپنے گانے بجانے میں مست تھے جب ہوش آیا تو دیکھا کہ مولانا روم حاضر ہیں۔ اسی وقت ان کے کان میں نے رکھ کر بجا دیا اور خود پھر غائب ہو گئے، مولانا روم نے اول مثنوی میں اسی نے کا حال بیان کیا ہے۔

بشنو از نئے چوں حکایت می کند و ز جدائی ہا شکایت می کند

### حاجی صاحبؒ کا مثنوی پر حاشیہ

مولانا روم کی یہ مثنوی چھ دفتروں میں ہے اس پر حاجی صاحب نے فارسی زبان میں حواشی لکھے ہیں۔ اگر حواشی کا پوری تحقیق اور احتیاط سے مطالعہ کیا جائے تو حاجی صاحب کے علوم اور معارف کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ آپ ہی اندازہ کیجئے کہ مثنوی کا حاشیہ



کوئی معمولی کھیل نہیں ہے۔ حاجی صاحب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ایک خط میں اپنے ان حواشی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

فقیر کی مثنوی شریف جو بعض حواشی و فوائد سے اپنی سمجھ کے مطابق مخفی ہے عزیز مولوی عبداللہ صاحب بواسطہ مولوی ابوالاحمد صاحب باستبداد و اصرار اشد بغرض طبع لے گئے تھے اور مشہور کر دیا ہے کہ فقیر نے خواہش اس کے طبع کی کی ہے، فقیر حیران ہے کہ اول تو وہ حواشی اور فوائد کچھ ایسے قائل نہیں خیال کئے جاتے تسہر طرہ یہ کہ فقیر کی خواہش ہے۔ (مکاتیب رشیدیہ ص ۵)

حاجی صاحب کے اس مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے مثنوی کے حواشی اور فوائد تحریر فرمائے۔ یہ حواشی اس قدر مقبول ہوئے کہ بعد میں آنے والوں نے مثنوی کی شرحوں میں ان سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

### حاجی صاحب، علمائے دیوبند اور صوفیاء کا مثنوی سے شغف

علامہ اقبال جن کو مولانا روم کی مثنوی نے کندن بنادیا اور وہ غالباً نہ مولانا روم کے مرید ہو گئے، چنانچہ اپنے آپ کو مرید ہندی اور مولانا کو پیر رومی کے لقب سے بار بار پکارا کرتے ہیں اور اصل مولانا روم کے ہی فیض یافتہ ہیں۔ جن لوگوں کا مطالعہ وسیع نہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت اقبال نے ہی خصوصی طور پر مولانا رومی سے استفادہ کیا ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہر دور میں علماء اور صوفیاء کی جماعت نے مثنوی سے بہت کچھ باطنی فیضان حاصل کیا ہے۔ انہیں میں سے ایک حاجی امداد اللہ صاحب ہیں۔ خود حاجی صاحب فرماتے ہیں:

جو کچھ مثنوی میں ہے اس کی روحانی تعلیم مجھ کو حضرت مولانا روم نے فرمائی ہے۔ (امداد المثنوی ص ۶۱)

میں نے مثنوی شریف تین بار حضرت مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی پر عرض کی اور بعض مقامات کی تحقیق مولوی ابوالحسن کاندھلوی سے کی۔ (امداد ص ۶۳)



اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پڑھی نہیں، بلکہ جو کچھ اس کے معانی حاجی صاحب پر منکشف ہوئے تھے وہ مولانا جھنجھانوی پر پیش کر کے تصدیق چاہی۔ البتہ بعض مقامات کی تحقیق مولانا ابوالحسن کاندھلوی سے کی۔

### حاجی صاحب کا درسِ مثنوی

نہ صرف یہ کہ حاجی صاحب مثنوی کا مظانہ فرماتے، بلکہ اس کا درس بھی دیتے تھے۔ مولانا تھانوی نے فرمایا کہ:

ایک دفعہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مثنوی کا درس ہو رہا تھا اور جلسہ عجیب جوش و خروش سے پُر تھا اس روز حضرت نے پکار کر یوں دُعا فرمائی۔

اے اللہ! ہم لوگوں کو بھی ایک ذرہ محبت عطا فرما، آمین۔

پھر دُعا کے بعد فرمایا کہ الحمد للہ ہم سب کو عطا ہو گیا۔ پھر دوسرے جلسے میں فرمایا کہ بھائی ذرے سے زیادہ کا تحمل بھی نہیں ہو سکتا۔

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں

یک قطرہ آب خور دم و دریا گریستم

ارواحِ ثلاثہ ص: ۱۸۵

حاجی صاحب کا مثنوی سے اس قدر شغف تھا کہ سفر میں بھی ساتھ رکھتے تھے۔ فرماتے

ہیں:

فقیر نے اپنی عادت کرائی ہے کہ سفر و حضر میں کلام اللہ شریف، دلائل الخیرات، مثنوی معنوی حضرت مولانا کو ضرور پاس رکھتا ہوں..... اور کوئی کتاب حدیث کی خواہ مشکوٰۃ ہی کیوں نہ ہو اور ایک رسالہ فقہ اگرچہ مالا بدمنہ ہو اور کیمیائے سعادت امام غزالی قدس سرہ بھی لوازم سفر پر زیادہ کرتا ہوں۔ (اندلس: ۳۶-۳۷)



## مثنوی کا کشفی درس

یوں تو بعض اہل علم مثنوی کو اپنے علم کے زور پر پڑھاتے ہیں لیکن صحیح معنی میں اس کا درس وہی دے سکتا ہے جس پر سلوک کے مراتب ختم ہو گئے ہوں اور کشف سے اس کو پورا حصہ نصیب ہوا ہو۔ حاجی صاحب پر مثنوی کے راز بستہ کھلتے تھے۔ مولانا اشرف علی صاحب نے فرمایا:

حاجی مرتضیٰ خاں لکھنوی کہتے تھے کہ ایک عالم نے جو کہ اپنے شیخ سے مثنوی پڑھے ہوئے تھے حضرت حاجی صاحب کے یہاں مثنوی آ کر شروع کی۔ ان سے ایک روز میں نے پوچھا کہ تم نے حضرت حاجی صاحب کی پڑھائی میں اور اپنے مرشد شیخ کی پڑھائی میں کیا فرق دیکھا..... انہوں نے کہا کہ تم ایک مثال سے سمجھو کہ جیسے ایک مکان نہایت شاندار ہے اور ہر طرح سے آراستہ و پیراستہ اور ہر قسم کے فرنیچر سے بھرا ہوا ہے۔ ایک شخص تو وہ ہے کہ کسی کو اس کے دروازے پر لے جا کر کھڑا کر دیا اور اس کا تمام نقشہ ایسا بیان کر دیا کہ کوئی چیز نہ چھوڑی اور ایک شخص وہ ہے کہ جس نے زیادہ بیان تو نہیں کیا لیکن دروازے سے اندر لے جا کر مکان کے بیچ میں کھڑا کر دیا اس طرح کہ سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ لے۔ حاجی صاحب کا پڑھانا تو ایسا ہی ہے کہ مجھے اندر لے جا کر کھڑا کر دیا اور میرے شیخ کا پڑھانا ایسا ہے جیسا کہ باہر سے پورا نقشہ بتا دیا۔

(ارواحِ ثلاثہ، ص: ۱۸۴)

خود مولانا اشرف علی صاحب جب مکہ معظمہ پہنچے تو لکھتے ہیں کہ میں اپنے ساتھ مثنوی لے گیا کہ حضرت حاجی صاحب کے درس میں شامل ہوا کروں گا۔ چنانچہ حضرت تھانوی نے وہاں پہنچ کر حاجی صاحب کے حلقہ درس مثنوی میں شمولیت کی اور استفادہ کیا۔ آپ ہی کی روایت ہے کہ ایک دفعہ جب (حاجی صاحب کے درس میں) مثنوی شریف ختم ہو گئی تو

گیارہ گیارہ بار سورہ اخلاص پڑھ کر نیاز کی گئی اور شربت بننا شروع ہوا۔ آپ (حاجی صاحب) نے فرمایا کہ نیاز کے دو معنی ہیں ایک عجز و بندگی اور وہ سوائے خدا کے دوسرے کے واسطے نہیں ہے، بلکہ ناجائز، شرک ہے اور دوسرے خدا کی نذر اور ثواب خدا کے بندوں کو پہنچانا یہ جائز ہے۔

حاجی صاحب پر مثنوی کا راز فاش ہونے کی شہرت دور دور تھی، چنانچہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا اور یہ ۱۳۱۳ھ کی بات ہے کہ ایک سال یا دو ہوئے کہ مصر سے ایک پاشا آیا اس کو مجھ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ رات کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تھا صبح کو کئی بار شیخ الحارہ کے ذریعے سے میرے مکان پر دریافت کرایا کہ شیخ بالا خانے سے اترے یا نہیں۔ میرے نیچے آتے ہی وہ بھی بھر کا بی شیخ الحارہ آئے۔ لباس شاہی میں فقیر کامل تھے۔ مجھ سے عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا روم کے خاندان میں بیعت رکھتے تھے۔ چند اشعار مثنوی معنوی کا مطلب مجھ سے دریافت کیا اور بعد دریافت مطلب بہت مسرور ہوئے اور ان کو زیادہ عقیدت ہو گئی۔ (امداد ص ۱۲۷-۱۲۸)

یہاں تک تفصیل سے لکھنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم یہ ظاہر کر دیں کہ مثنوی مولانا روم کی تعلیم حاصل کرنے اور اس کو پڑھانے کا شغف حاجی صاحب کو بہت زیادہ تھا اور مثنوی کے علوم و معارف حاجی صاحب پر منکشف تھے اس لئے آپ نے چھ دفتروں کے حواشی اور فوائد فارسی زبان میں لکھے۔ اپنے مکتوب بنام مولانا رشید احمد صاحب میں حاجی صاحب نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق اس کے حواشی اور فوائد لکھے ہیں۔ اور اس جملے میں حاجی صاحب نے ایک گہرے راز کو کھولا ہے اور وہ یہی ہے کہ ان پر مولانا روم کے معانی فاش ہو گئے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک پہلی عبارت میں یہ بھی پڑھا ہے کہ حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے مثنوی خود مولانا روم سے پڑھی۔

حاجی صاحب نے مثنوی کے سمندر کی گہرائی میں غوطہ مار کر موتی پھنسنے ہیں اور میرے

نزدیک ڈاکٹر اقبال نے بھی مولانا روم سے استفادہ کیا ہے لیکن وہ پانی کی سطح پر تیرتے رہے ہیں۔

غرض کہ حاجی صاحب کی تصانیف میں یہ حاشیہ ایک بڑا کارنامہ ہے جس کی حقیقت اس کے مطالعہ سے اہل باطن پر زیادہ اور اہل ظاہر پر کم منکشف ہو سکتی ہے۔

### تفصیلات حاشیہ پر مزید تحقیقی نظر

اب ہم حاجی صاحب کے حاشیہ کے متعلق تجزیہ اور تحقیق کو کام میں لا کر قاری کے سامنے ایک واضح حقیقت پیش کرنا چاہتے ہیں۔

آپ نے گذشتہ اوراق میں پڑھا ہے کہ حاجی صاحب کو مثنوی کے مطالعہ اور درس و تدریس سے بہت زیادہ شغف تھا۔۔

مکہ معظمہ میں یا قیام ہند میں آپ کا درس مثنوی مشہور تھا۔ اثنائے درس میں حاجی صاحب اپنی یادداشت اور تحقیقات کے طور پر اشعار کا مطلب اپنی اس مثنوی میں تحریر فرماتے جو آپ کے زیر مطالعہ رہتی تھی، ہوتے ہوتے بہت سے اشعار کے مطالب آپ نے اپنی کتاب میں اپنے خیال کے مطابق تحریر فرمائے۔ چونکہ آپ درس دیتے تھے اس لئے مختلف شارحین مثنوی کی شرحیں آپ کے مطالعہ سے گذری ہوں گی لیکن آپ کا ہر شعر کے مطلب سے جو شارحین نے بیان کیا اتفاق ہونا ضروری نہ تھا اس لئے ان سے اختلاف رکھتے ہوئے اپنی یادداشتیں لکھتے چلے گئے اور یہ ایک اچھا خاصہ گاہ گاہ کے حاشیہ نویسی کا کام ایک مختصر شرح کی صورت اختیار کر گیا۔ ان سب حقیقتوں کا انکشاف آپ کے مکتوب بنام مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ پھر اس مکتوب کا مطالعہ کیجئے۔ لکھتے ہیں:

”فقیر کی مثنوی شریف (یعنی وہ نسخہ جو آپ کا مملوکہ تھا) جو بعض حواشی و فوائد

سے اپنی سمجھ کے مطابق محشی ہے، عزیزم مولوی عبداللہ صاحب بواسطہ مولوی

ابوالاحمد صاحب باستبداد و اصرار اشد بغرض طبع لے گئے تھے۔“



اس عبارت سے حاجی صاحب کی زیر مطالعہ مثنوی پر اپنی سمجھ کے مطابق نہ کہ دوسرے شارحین کے بیان کردہ مطالب کے موافق، سب نہیں بلکہ بعض حواشی و فوائد سے کتاب مذکور کا محشی ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ حواشی اتنے درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ ان کو طبع کر دیا جائے۔ لہذا اس مقصد کے پیش نظر مولوی عبداللہ صاحب نے مولوی ابوالاحمد کے ذریعہ حاجی صاحب سے یہ نسخہ حاصل کیا اور اس کو چھپوانے کا ارادہ کیا، لیکن جب بظاہر طبع ہونے میں دیر ہوئی یا حاجی صاحب کو تاخیر کے باعث بے اعتمادی نظر آئی اور محنت کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہوا تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو جن پر آپ کو بہر طور اعتماد تھا آپ نے تحریر فرمایا:

”تاہم آج تک آٹھ دس ماہ سے کچھ اس کا ایک جُز بھی درست نہیں کیا۔ فقیر نے ان کو خط ممانعت کئی بار تحریر کرائے وہ ابھی تک اس کام سے باز نہ آئے۔ آپ کو متصدع ہوں کہ کسی معتبر ذریعہ سے مثنوی شریف محشی فقیر قلمی ہر دو نسخے مولوی عبداللہ صاحب و مولوی ابوالاحمد صاحب سے طلب کرالیں اور بعد میں جیسی رائے آپ کی ہوگی انشاء اللہ دیا ہوگا۔ یہ تحریر فقیر کی دکھا کر مثنوی شریف منگوالی جاوے۔“ فقط از مکہ مکرمہ ۲۳/رمضان شریف ۱۳۱۰ھ (مہر)

خط کی بقیہ عبارت سے مزید معلومات آپ کے سامنے ہیں کہ مولوی عبداللہ صاحب نے آٹھ دس ماہ سے کتاب لے کر کتاب کے کسی جز کی تصحیح میں تغافل شعاری اختیار کی ہے۔ خط کی مزید مذکورہ عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کے پاس ایک مطبوعہ مثنوی تھی جس پر آپ نے اپنے حواشی و فوائد تحریر فرمائے تھے اور دوسری قلمی مثنوی تھی یہ دونوں ہی مولوی عبداللہ صاحب لے گئے تھے۔ مولوی عبداللہ صاحب کہاں چھپوانا چاہتے تھے اس کی مزید تفصیلات ایک دوسرے خط میں جو حاجی صاحب نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو ۱۰/رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ کو مکہ مکرمہ سے تحریر فرمایا ہے، موجود ہیں، لکھتے ہیں:

”مطلب ضروری ہے کہ فقیر کی وہ مثنوی شریف جو ایک زمانہ سے فقیر کے مطالعہ و درس میں تھی اور اپنے خیال کے موافق اس پر کچھ مطالب و فوائد درج کئے تھے اس دفعہ اس مثنوی کو مولوی عبداللہ صاحب انیسٹھوی بوسیلہ مولوی ابوالاحمد صاحب بمبئی کے طبع کرانے کی غرض سے فقیر سے لے گئے۔ ان کی تلون مزاجی و غیر استقامت سے اول ہی سے فقیر کو معلوم تھا کہ اس کا انجام ان کے حوصلہ و حالت سے باہر ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ پانچ چھ مہینے سے حاجی عبدالکریم صاحب سینھ بمبئی کو جو ایک دیندار اور صالح اور معتبر شخص ہیں اس مثنوی کے لا حاصل شغل کی وجہ سے سخت تشویش و زیر باری میں ڈال رکھا ہے۔ وہ تنہا اپنی تجارت کے کام میں مشغول ہیں۔ اس میں مشغول ہونے سے ان کی تجارت کا سخت حرج و نقصان ہے۔ اس لئے فقیر نے سینھ صاحب کو لکھ بھیجا ہے کہ مثنوی کا طبع ہونا قطعاً موقوف کر کے فقیر کی دونوں مثنوی آپ کی خدمت میں مقام گنگوہ پہنچادیں۔ لیکن معلوم یہ ہوا ہے کہ مولوی عبداللہ صاحب و مولوی ابوالاحمد صاحب مقام سہارنپور میں شاید اسی غرض سے قیام پذیر ہیں۔ اسی لئے آپ بذریعہ حافظ قمر الدین صاحب یا کسی اور معتبر شخص کے ذریعہ سے فقیر کی مثنوی کو سہارنپور سے اپنے پاس منگوا کر رکھ لیں۔ اس بارے میں توقف نہ فرمائیں (ایک) خط بنام مولوی عبداللہ صاحب و مولوی ابوالاحمد صاحب بھی جاتا ہے۔ آپ دونوں خط پڑھنے کے مجاز ہیں۔ (مہر) از مکہ معظمہ، دہم

رمضان المبارک روز دوشنبہ ۱۳۱۰ھ (مکاتیب رشیدہ ص: ۹-۱۰)

اس مکتوب سے حاشیہ مثنوی کی تحقیق کا ایک ایک گوشہ اُجاگر ہو جاتا ہے اور حسب ذیل امور کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

اول یہ کہ حاجی صاحب نے اپنی زیر مطالعہ مثنوی پر کچھ مطالب درج کئے تھے اس کو



مولوی عبداللہ صاحب لے گئے۔ یہ صاحب انیٹھ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے حاجی صاحب سے بذریعہ مولوی ابوالاحمد اصرار کر کے محشی مثنوی حاصل کی۔ مولوی ابوالاحمد صاحب بمبئی کے سیٹھ حاجی عبدالکریم کے سرمائے سے حاجی صاحب کی محشی مثنوی چھپوانا چاہتے ہیں۔ چونکہ سیٹھ صاحب کی تجارت کو اس طرف توجہ کرنے سے نقصان پہنچ رہا تھا اس لئے حضرت نے یہ بات گوارا نہ فرمائی۔ غالباً سیٹھ صاحب بھی حاجی صاحب کے مرید معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حق پرست پیروں کی شان یہ ہے کہ وہ خود غرضی سے بالاتر ہوتے ہیں۔

حاجی صاحب نے اپنے اس مکتوب میں مولوی عبداللہ صاحب کی تلون مزا جی غیر استقامت کا شکوہ فرمایا ہے۔ بہر حال ان دونوں خطوط سے مثنوی کے حاشے اور اس کی طباعت میں حاجی صاحب کے متوسلین کی سرگرمیاں ظاہر ہیں اور اشتیاق طباعت واضح ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے مکاتیب میں افسوس کہ کوئی خط ایسا نہیں ملا جس سے معلوم ہو کہ انہوں نے حاجی صاحب کے گرامی نامہ کا کیا جواب دیا۔ اور اس کا کیا ردِ عمل ہوا۔ البتہ حاجی صاحب نے مولانا رشید احمد صاحب کو ۲۳ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ کو جو مکتوب تحریر فرمایا ہے اور جو مکاتیب رشیدیہ میں ساتواں خط ہے اس میں یہ جملہ بھی ہے۔

”آپ کا خط متضمن حالات مولوی عبداللہ صاحب پہنچا تھا۔ اس کا جواب

بسیل ڈاک قبل اس کے بھیج دیا گیا۔ فقط“ (مکتوبات رشیدیہ ص: ۹)

لیکن حضرت گنگوہی نے حاجی صاحب کو مولوی عبداللہ صاحب کے حالات کیا لکھے تھے کہیں درج نہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مولوی عبداللہ وہی زیر بحث شخصیت ہیں۔ یہاں تک حاشے کا حال معلوم ہونے کے بعد مزید حقیقت کا انکشاف نہیں ہوتا کہ مولوی عبداللہ صاحب کی کوششوں نے کیا صورت اختیار کی۔



حاجی صاحبؒ کا خط مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے نام اور مثنوی کی طباعت اور حاشیہ ان تحقیقات کے بعد امداد المشتاق کے اس حصے میں جو مرقومات امدادیہ کے نام سے موسوم ہے اور جس میں حاجی صاحب کے خطوط مختلف حضرات کے نام ہیں، ایک خط مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ کے نام ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

تحریر سے مولوی محمد یعقوب کی معلوم ہوا کہ منشی صاحب نے اس فقیر کی عرض کی سبب مثنوی کے طبع کا قصد کیا ہے۔ چنانچہ مولوی (محمد یعقوب) صاحب نے دفتر ثانی سے اس کا تحشیہ شروع کیا ہے اس وجہ سے بہت خوش ہوا کہ مجھ کو مثنوی شریف سے محبت ہے۔ اگر آنحضریز بھی تحشیہ اور اس کی صحت میں شریک ہوں تو بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آں عزیز کے شریک ہونے کی صورت میں مثنوی بہت اچھی طبع ہوگی۔“ (مرقومات امدادیہ ص: ۲۴۳-۲۴۴)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب نے منشی ممتاز علی صاحب میرٹھی مالک مطبع سے مثنوی چھاپنے کی فرمائش کی تھی اور انہوں نے اس کے طبع کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ نیز مولانا محمد یعقوب صاحب نے مثنوی کے دوسرے دفتر سے حاشیہ کرنا اور لکھنا شروع فرما دیا تھا۔

یہاں صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن حاجی صاحب کے حاشیے کا اس سے کچھ تعلق ہے یا نہیں قابل تحقیق ہے۔ ایسا پتہ چلتا ہے کہ مولوی عبداللہ صاحب کی کوششوں سے پہلی بھی مثنوی کے نسخے کی صحیح طباعت اور حاشیے کے کام کی تحریک حاجی صاحب کی طرف سے اپنے متوسلین کو ہوتی رہی ہے۔ غالباً حاجی صاحب نے اس وقت پہلے دفتر کا حاشیہ لکھا ہوگا اور اس کے پیش نظر مولانا محمد یعقوب صاحب نے دوسرے دفتر سے حاشیہ لکھنے کا خیال ظاہر کیا ہوگا، کیوں کہ پہلے دفتر پر حاجی صاحب کے حاشیے کو کافی سمجھا گیا ہوگا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب دونوں منشی ممتاز علی میرٹھی

کے کتب خانے میں کتابوں کی تصحیح کے کام پر مامور ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب نے اسی خط میں مولانا محمد قاسم صاحب برہنہ کو اپنے بھتیجے احمد حسین کے متعلق لکھا ہے:

”نیز قبول نہ کرنا عزیز حافظ احمد حسین کا مطبع کے تعلق کو سبب قلت تنخواہ کے معلوم ہوا..... اس علاقہ (تعلق مطبع) میں مطبع کے چند فائدے میں نے سمجھے تھے۔ اول یہ کہ صلحا کا مجمع ہے خصوصاً آں عزیز اور عزیزم مولوی محمد یعقوب کی صحبت تھی۔“ (مرقومات ص: ۲۴۳)

### تحمیہ مثنوی از مولانا محمد یعقوب صاحب

ایک اور خط جو حاجی صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب کو لکھا ہے مذکورہ بالا خط کے مضمون کی تائید کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

”بخدمت بابرکت عزیزم مولوی محمد یعقوب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، بعد سلام مسنون شوق مشغون و مواصلت جسمانی واضح باد۔ مکتوب محبت و عقیدت اسلوب مع خط عزیزم حافظ احمد حسین سلمہ مورخہ ۲۷ رذیقعدہ در آخر محرم رسیدہ مسرت ساخت و از حال مندرجہ اش آگاہی بخشید معلوم شد کہ عزیز احمد حسین علاقہ مطبع بہ سبب قلت تنخواہ قبول نہ کر دہتر نہ نمود۔ اگر بر آں قناعت کر دے خدا تعالیٰ در اں برکت وادے۔ خیر اختیار اوست۔ وہم از دریافت قصد طبع قصد طبع مثنوی شریف و کمرہمت بستن آں عزیز در مقدمہ صحت و تحیہ آں ازیں بسیار فرحت روداد۔ اللہ تعالیٰ سعی آں عزیز را مشکور و مقبول کناد و بحسن و خوبی باختتام رساناد آمین۔“

باید کہ دریں امرست نشوند، و ہمت را کار فرمایند، خدائے تعالیٰ حامی و مددگار است، و ایں مدبر را ہم از دُعا شریک دانند۔ و باید دانست کہ بجز حل مطلب از طولانی حاشیہ بہ پرہیزند، و نیز بعض یک لغت را معنی بسیار باشد فقط معنی مراد یہ

مولانا دیگر نہ نویند کہ تحریر طویل خواہد شد، بلکہ لغت را اعراب باید داد و حاجت ترکیب نام نیست۔ ومعنی لغت تحت لغت یا در سفیدی نظم نوشتہ شوند مناسب معلوم شود۔ و دریں دو قاعدہ است، یکی زینت نظم است، دویم آنکہ گنجائش بر حاشیہ برائے تخیل مطالب خواہد شد۔ آئندہ ہرچہ مناسب دانند بعمل آرند مگر بمقدور خود ہیچ دقیقہ فرو نگذارند۔ و نیز اختتام مثنوی شریف تصنیف مولوی مفتی الہی بخش صاحب کاندھلوی مرحوم از نزد مولوی نور الحسن صاحب طلبیدہ ضرور شریک کردہ طبع نمایند، تاکہ کتاب کامل شود۔ و نیز بزبانی مولوی محبت اللہ صاحب معلوم شد کہ عبدالرحمن صاحب مصالحہ مثنوی یعنی شروع وغیرہ بسیار خوب جمع کردہ بودند، و بلکہ دفتر ازل بہ تخیل و صحت کنانیہ اند، بہ سبب بعضی امور در طبع توقف شد اگر ممکن باشد آں مصالح را از مطبع میاں عبدالرحمن طلبیدہ بکار برند و اگر طلبیدہ شد بہتر شد، و فتنیکہ طبع شروع خواہد شد فقیر را ہم اطلاع باید کرد.....“ (موقوفات امدادیہ ص: ۲۳۳-۲۳۵-۲۳۸)

یہ مکتوب واضح کرتا ہے کہ مستقل طور پر مثنوی کی صحت اور حاشیے کا کام مولانا محمد یعقوب صاحب نے سنبھالا معلوم ہوتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب جو مولانا مملوک علی صاحب صدر شعبہ علوم و فنون مشرقیہ دہلی کالج، کے صاحبزادہ تھے خود زبردست عالم و عارف اور حاجی صاحب کے مرید اور خلیفہ مجاز تھے۔ مثنوی کے معارف اور مضامین پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ حاجی صاحب سرور نظر آتے ہیں کہ مثنوی کی طباعت، صحت اور حاشیہ کا کام ایک دانشمند کامل کے ذریعہ انجام پا کر ایک زبردست شاہکار کی شکل میں جلوہ آرا ہوگا۔ اس جذبہ بے اختیار شوق میں حاجی صاحب نے حاشیہ نویسی کے لئے جو ہدایات مولانا کو دی ہیں وہ بجائے خود بصیرت افروز ہیں۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے اس عظیم الشان کام میں ہمت کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ مطالب مثنوی کے حل کرنے میں



طوالت سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ طوالت قاری پر اچھے اثرات پیدا نہیں کرتی، پھر یہ کہ مولانا جلال الدین رومی کے منشا کو حاشیہ نویسی میں پیش نظر رکھا جائے۔ الفاظ پر اعراب (زبر، زیر، پیش) لگا کر مختصر کام کیا جائے اور حرکات و سکنات الفاظ کو بقید عبارت ظاہر نہ کیا جائے کہ اس میں بھی طوالت ہے۔ الفاظ کے نیچے یا سفیدی نظم میں لکھ کر خوبصورتی کا خیال رکھا جائے۔

### مثنوی کی تکمیل اور مفتی الہی بخش کا ندھلوی کا کارنامہ

حاجی صاحب کے مذکورہ بالا خط میں جہاں مثنوی کی طباعت اور حاشیے کا ذکر ہے وہاں ایک اور حقیقت کا بھی انکشاف کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مولانا روم نے مثنوی کا چھٹا دفتر جہاں ختم کیا ہے وہاں مضمون پورا نہیں ہو سکا، بلکہ ادھورا رہ گیا ہے۔ ایک بادشاہ کے تین شہزادوں کا ذکر چل رہا تھا۔ تیسرے شہزادے کا قصہ باقی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کا چھٹا دفتر نامکمل رہ گیا ہے، چنانچہ چھٹے دفتر کا آخری عنوان اور اس کے ماتحت چند اشعار رہنمائی کے لئے حسب ذیل ہیں:

”مثل وصیت کردن آں شخص کہ سہ پر داشت و میراث خود را بہ کامل ترین پر

داد وہ قاضی و نیز بگفت۔“

آں یکے شخصی بوقت مرگ خویش	گفتہ بد اند وصیت بیش بیش
سہ پسر بودش چوسہ سرد رواں	وقف ایثاں کردہ او جان درواں
گفت ہر چہ کالہ و سیم و زر است	آں بروزیں ہر سہ کو کامل تر است
گفت با قاضی و بس اندرز کرد	بعد ازاں جام شراب مرگ خورد

ایک باپ نے اپنے بیٹوں میں سے سب سے زیادہ کامل بیٹے کے لئے اپنی تمام میراث دینے کی وصیت کی اور پھر مر گیا۔ قاضی شہر کو باپ نے فہمائش کر دی تھی۔ اب قاضی کا یہ فرض تھا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ ان بیٹوں میں سے زیادہ کامل کون ہے کیوں کہ باپ

نے اس حقیقت کا انکشاف قاضی کے روبرو نہیں کیا تھا۔ قاضی نے تینوں بیٹوں سے ان کی کاہلی کا حال دریافت کیا۔ مولانا روم لکھتے ہیں:

گفت قاضی ہر یکے با عاقلیش تا بگوید قصہ از کاہلیش  
مہترین را گفت قاضی باز گو قصہ از کاہل ای مال جو  
قاضی نے بڑے بیٹے سے اس کی کاہلی کا حال دریافت کیا۔ بعد ازاں دوسرے بیٹے سے اس کی کاہلی کی حقیقت معلوم کی۔ اس کے بعد پھر ”ماں اور بچے“ کی ایک مثل بیان کرتے کرتے چھٹے دفتر کو حسب ذیل شعر پر ختم کر دیا ہے۔

چوں فدا از روزن دل آفتاب ختم شد واللہ اعلم بالصواب  
مگر تیسرے بیٹے کا کوئی حال اس دفتر میں نہیں ہے جس سے چھٹے دفتر کا مضمون تشنہ تکمیل رہ گیا ہے۔ لیکن چھٹے دفتر کے آخر میں مولانا رومی کے صاحبزادے سلطان ولد مولانا بہاء الدین نے خاتمے کے اشعار لکھ کر چھٹے دفتر کو ختم اور بند کر دیا۔ مثنوی کے چھٹے دفتر کے خاتمہ کا عنوان یہ ہے اور اس کے اشعار حسب ذیل ہیں:

”خاتمہ لولدہ المعارف الکامل المحقق مولانا بہاء الملتہ والدین۔ قدس سرہ

مدتی زیں مثنوی چوں والدہم شد خممش گفتم دراکای زندہ ام  
ازچہ رو دیگر نمی گوئی سخن بہرچہ بستی در علم لدن  
قصہ شہزادگان نامد بسر ماند ناسفہ دُر سو میں پسر

مولانا روم کے صاحبزادے نے والد محترم سے عرض کیا کہ عرصہ سے آپ مثنوی لکھنے سے غموش ہیں۔ آپ نے علم لدنی کے دروازے کو بند کر رکھا ہے۔ ابھی تیسرے شہزادے کا قصہ بھی ختم نہیں ہوا۔ اس کو سن کر مولانا روم نے صاحبزادے سے فرمایا۔

گفت نطقم چوں شتر زیں پس بخت نیمتش باہج کس تا حشر گفت  
ہست باقی شرح ایں لیکن دروں بستہ شد دیگر نمی آید بروں



ہمچو اشتر ناطقہ ایں جا بخت      او بگوید من وہاں بستم زگفت  
وقت رحلت آمد و جستن زجو      کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَہ  
باقی ایں گفتہ آید بی زباں      در دِلِ آنکس کہ دارد زندہ جاں  
گفتگو آخر رسید و عمر ہم      مرثدہ آمد وقت آں کز تن ہم

مولانا روم نے ان اشعار میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اب دِل کا دروازہ بند ہو چکا ہے کچھ آگے کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس نے مجھے زبان بند کرنے کو کہا اور میں نے زبان بند کر لی ہے۔ اب آخری سفر قریب ہے اور خدائے ذوالجلال کے سوا سب کو فنا ہے۔ باقی مثنوی کا مضمون اس بے زبان شخص کے دِل میں آئے گا جو زندہ دِل اور زندہ جان رکھتا ہوگا آگے کے اشعار میں مولانا روم کی گفتگو کو صاحبزادہ صاحب اپنے اشعار میں ذکر کرتے چلے گئے ہیں اور بالآخر والد رومی فرزند عزیز سے کہتے ہیں کہ اب ساتویں دفتر اور خاتمہ کا ذکر چھوڑو البتہ یہ سنو۔

پائے ہمت بر خور و برماہ نہ      سربراں ایوانِ دآں درگاہ نہ  
ایں خودی را خرج کن اندر خدا      تانمانی ہمچو اہلیسے جدا  
آب جاں را ریز اندر بحر جاں      تاشوی دریای بے حد و کراں  
قصہ کو تہ کن کہ رستم در حجاب  
ہیں خمش واللہ اعلم بالصواب

یہ مثنوی کے خاتمے کے اشعار حضرت رومی کے صاحبزادے کی زبانی والد کی ترجمانی میں ہیں جن میں قصہ کوتاہ کر کے مولانا روم نے دُنیا سے حجاب اور روپوشی اختیار کر لی اور صاحبزادہ صاحب نے پھر مثنوی کے متعلق اس طرح فرمایا۔

شکر ایں نامہ بعنوانی رسید      کم نہ شد نقد و باخوانی رسید  
نردبان آسمان است ایں کلام      ہر کہ از ایں بر رود آید بہام

نی بہام چرخ کاں اخضر بود      بل بہامی کز فلک برتر بود  
گام گردوں را از واید نوا  
گردش باشد ہمیشہ زان ہوا

اس شعر پر مثنوی کا خاتمہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مثنوی نامکمل رہ گئی۔ حاجی امداد اللہ صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب کے مذکورہ خط میں مثنوی کی عدم تکمیل کے متعلق لکھ کر اسی حقیقت سے نقاب اٹھایا ہے اور تحریر فرمایا ہے:

”و نیز اختتام مثنوی شریف تصنیف مفتی الہی بخش صاحب کاندھلوی مرحوم از نزد

مولوی نور الحسن صاحب طلبیدہ ضرور شریک کردہ طبع نمایند تا کہ کتاب کامل شود۔“

خدا کی قدرت دیکھئے کہ مثنوی کی تکمیل کا قرعہ فال مولانا مفتی الہی بخش صاحب کاندھلوی ضلع مظفر نگر یو۔ پی کے نام نکلا اور مولانا رومی کے اس شعر کے مطابق۔

باقی ایں گفتہ آید بے زباں

درد دل آنکس کہ دارد زندہ جاں

مفتی صاحب جیسے ”زندہ جاں“ نے مثنوی کا تہ لکھ کر مثنوی کو مکمل کیا۔ یہ مفتی الہی بخش مرحوم کی وفات کے بعد قلمی شکل میں ان کے حفید (پوتے) مولوی نور الحسن کے پاس چلا آرہا تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب کی فرمائش پر کانپور کے مطبع محمود المطالع میں طبع ہوا۔

مثنوی اس کے تتے اور خاتمے کے متعلق ہم کہیں سے کہیں نکل گئے مگر اس وادی سے ہمیں گذرنا ناگزیر تھا۔ مضمون کا سلسلہ یہ تھا کہ حاجی صاحب مولانا محمد یعقوب صاحب کے حاشیہ لکھنے پر بہت مسرور ہیں کیوں کہ مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب تینوں حضرات علمی اور روحانی طور پر حاجی صاحب کو زیادہ عزیز، ان کے زیادہ معتمد اور زیادہ مشاڑ الیہ تھے۔ مگر مولانا محمد یعقوب صاحب نے مثنوی کا حاشیہ شروع کیا یا نہیں اگر کیا تو کتنا لکھا دُر دُر تک اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ بظاہر حوادثِ زمانہ



اور دیگر موانع نے اس عظیم الشان کام سے مولانا کو روک دیا ہوگا تا آنکہ مولانا نو تووی ۱۲۹۷ھ میں اور مولانا محمد یعقوب صاحب ۱۳۰۲ھ میں خدا کو پیارے ہو گئے۔

حاجی صاحب کا درس مثنوی مکہ محترمہ میں برابر جاری رہتا تھا غالباً اس عرصہ میں مثنوی کے دفتروں پر حاشیہ نویسی اور یادداشتوں کا کام بھی مسلسل رہتا ہوگا اور جب یہ حاشیہ اس قابل ہو گیا ہوگا کہ طبع کرایا جائے تو مولوی عبداللہ صاحب نے ابوالحمزہ کے ذریعہ مکہ معظمہ حج کے لئے جا کر حاصل کر لیا ہوگا۔ پھر ہندوستان آ کر سیٹھ عبدالکریم بمبئی والے صاحب کے سرمائے سے چھپوانے کی کوشش کی لیکن حاجی صاحب نے پھر ۱۳۱۰ھ میں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو متعدد بار لکھ کر اپنی مثنویاں مولوی عبداللہ صاحب سے منگوائی ہوں گی۔ اور بعد ازاں یہ مثنویاں انہوں نے حاجی صاحب کو مکہ معظمہ بھیج دی ہوں گی۔ روانگی کس طرح ہوئی اس کی کہیں کوئی تصریح نہیں ملی۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہو سکا کہ محشی مثنوی اور قلمی دونوں حاجی صاحب کے پاس پہنچ چکی ہیں جن کی تفصیلات یہ ہیں۔

مولانا احمد حسن صاحب کانپوری ہندوستان کے مشہور علماء میں سے تھے۔ حاجی صاحب سے مثنوی کی طباعت اور اس کے متعلق عرض کیا۔ چنانچہ حاجی صاحب مولانا اشرف علی صاحب کو اپنے مکتوب ۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ میں جبکہ وہ کانپور میں ملازم ہیں لکھتے ہیں:

”مولانا احمد حسن صاحب نے مثنوی کے طبع کے لئے بہت اشتیاق ظاہر فرمایا۔

دل و جان سے چھپائی کے لئے تیار ہیں۔ میں نے بھی ان کو اجازت دے دی

ہے۔ وہ انشاء اللہ میری مثنوی لادیں گے آپ بھی اس میں سعی فرمائیے گا۔“

سب بھائی مل کر اس کو چھپوائے گا۔ میں نے اس مثنوی پر بہت محنت کی ہے۔

خدا کرے صحت کے ساتھ بایں ہیئت کذائی چھپ جائے تو انشاء اللہ لوگوں

کو بہت نفع ہوگا۔ آپ لوگوں کے لئے باعث ثمرہ اخروی ہوگا۔ مثنوی کے

نئے کل غلط چھپے ہیں جس سے بالکل مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ مقام سمجھنے

سے رہ جاتا ہے۔ اگر میری حیات میں طبع ہوگئی تو میں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا ورنہ مرضی مولیٰ۔ اور یہ اصل نسخہ مثنوی کا میں نے عزیز ی احمد حسن صاحب اور آپ کو دیا ہے۔ آپ دونوں صاحب اپنے پاس رکھے گا خدا برکت دے گا۔“ (مکتوبات امدادیہ ص: ۱۸)

اس خط سے صاف معلوم ہوا کہ حاجی صاحب نے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کو اپنی محشی مثنوی طبع کرنے کے لئے دے دی۔ مولانا تھانوی سے بھی مدد کی خواہش ظاہر کی اور اپنے تمام مریدین سے بھی۔

نیز یہ بھی تحقیق فرمایا کہ مثنوی کے تمام نسخے غلط چھپے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کہ میں نے مثنوی پر بہت محنت اٹھائی ہے اور یہ بھی کہ میں نے اپنی محشی مثنوی آپ دونوں کو دیدی ہے۔ بہر حال اب مثنوی مولانا احمد حسن صاحب خود لے آئے ہیں جیسا کہ اوپر کے خط سے واضح ہے۔ حاجی صاحب ایک اور خط میں مولانا تھانوی کو لکھتے ہیں:

”مثنوی شریف کی نسبت پہلے میں لکھ چکا ہوں۔ اور اب پھر تحریر کرتا ہوں کہ مثنوی شریف عزیز ی مولوی احمد حسن صاحب سلمہ اللہ العزیز، بقصد طبع لے جاتے ہیں۔ آپ بھی اس میں ساعی رہے گا۔ تصحیح اور عمدگی خط کا غذا بہت خیال رکھا جائے۔ بالفعل جتنی مثنوی موجود ہیں یک لخت مسخ ہیں۔ اغلاط کثیرہ کی وجہ سے بالکل مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والا غریب حیران رہ جاتا ہے۔ پہلے بھی بہت لوگوں نے اس کے طبع کی درخواست کی تھی مگر بوجہ عدم وثوق میں نے اس کو منظور نہیں کیا تھا۔ اب انشاء اللہ تعالیٰ امید ہے کہ اس کا انتظام طبع پورا پورا ہو جائے گا۔ خدا ایسا ہی کرے۔ آمین

(مکتوبات امدادیہ ص: ۱۹-۲۰، خط مورخہ ۹ رجب پنجشنبہ ۱۳۱۳ھ از مکہ مکرمہ)

اس خط سے بھی معلوم ہوا کہ مولانا احمد حسن صاحب نے مکہ مکرمہ میں حاجی صاحب کی



حشی مثنوی لے لی ہے۔ نیز یہ بھی کہ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہونا چاہئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس سے پہلے مختلف لوگوں نے اس کے طبع کا ارادہ کیا لیکن عدم اعتماد کے باعث ان کو اجازت نہیں دی گئی۔ اس سے مولوی عبداللہ صاحب کی طرف بھی اشارہ ہے۔

### مولانا احمد حسن صاحب کی کوششیں

بہر حال مولانا احمد حسن صاحب مکہ مکرمہ سے ہندوستان پہنچے اور مثنوی کی طباعت اور اس کے حاشیہ میں مشغول ہو گئے۔ حاجی صاحب کو ان کوششوں کی اطلاع پہنچ رہی ہے چنانچہ اپنے مکتوب مورخہ ۹ محرم ۱۳۱۲ھ میں مولانا اشرف علی صاحب کو کانپور لکھتے ہیں:

”عزیزی مولوی احمد حسن زاد اللہ عرفانہ مثنوی شریف میں بہت کوشش فرما رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی کوشش کو مشکور فرمائے اور اس کی جزا پوری پوری مرحمت فرمائے۔ آپ بھی ان کے شریک حال رہئے حتی المقدور ان کا ساتھ دیجئے۔“ (مکتوبات امدادیہ ص: ۲۱)

ایک اور خط میں مولانا تھانوی کو تحریر کرتے ہیں:

”عزیزی مولوی احمد حسن صاحب زَاذَاللّٰہُ شَوْقَہٗ وَ مَحَبَّۃً کی کارگزاری کی خبریں ہر طرف سے آرہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کوشش و سعی بلخ کو مشکور فرمائے۔ آمین۔“ (مکتوبات ص: ۲۵)

بہر حال مولانا احمد حسن صاحب مثنوی کی طباعت اور حاشیہ کے سلسلے میں سرگرم ہیں اور اس کی خبریں مشہور ہو چکی ہیں۔ ایک اور خط میں مولانا تھانوی کو تحریر فرماتے ہیں:

”دربارہ طبع مثنوی شریف آپ و مولوی احمد حسن و مولوی محمد علی کے مشورے پر ہونا منسب ہے۔“ (مکتوبات ص: ۲۶، مورخہ ۲۵ صفر ۱۳۱۲ھ)

مثنوی شریف کا پہلا دفتر چھپ چکا اور اس کا نسخہ حاجی صاحب کو پہنچ گیا۔ چنانچہ لکھتے

”عزیزی مولوی احمد حسن صاحب زَادَ اللّٰهُ مَحَبَّتَهُ وَ عِرْفَانَهُ اس میں شک نہیں کہ بہت کوشش فرما رہے ہیں، خداوند کریم! آپے فضل و کرم سے ان کی سعی کو مشکور فرمائے۔ اور ان کی ترقی درجات کا مثنوی شریف کو سبب بنائیں آمین۔ پہلا جز اس کا میرے پاس آگیا۔ دیکھ کر نہایت جی خوش ہوا۔ مثنوی شریف جس درجہ کی کتاب تھی عزیزی موصوف نے اس کا پورا حق ادا کیا۔ خداوند کریم اس کو بایں حسن و خوبی تمام کو پہنچائے۔ آمین۔“

(مکتوباتِ امدادیہ ص: ۲۸-۲۹ مورخہ ۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۲ھ)

پہلا دفتر طبع ہونے کے بعد حاجی صاحب کو دوسرے دفتر کا انتظار ہے۔ مولانا احمد حسن صاحب کا خط حاجی صاحب کے پاس دیر تک نہیں پہنچا۔ اس لئے مولانا تھانوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”مولوی احمد حسن صاحب زَادَ اللّٰهُ مَحَبَّتَهُ وَ عِرْفَانَهُ اور ان کے جمیع متعلقین سے بہت دُعا و سلام کہہ دیجئے گا۔ بہت دنوں سے کوئی راحت نامہ ان کا نہیں آیا۔“

(مکتوباتِ امدادیہ ص: ۳۰، مورخہ ۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۲ھ)

ایک اور خط مورخہ ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۱۲ھ روز یکشنبہ میں مکہ مکرمہ سے مولانا تھانوی کو لکھتے ہیں:

”اور در باب مثنوی شریف کے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے اس کو بہت پھیلایا ہے۔ خیر خدا انجام فرمادیں۔“ (مکتوبات ص: ۳۲)

حاجی صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب کو حاشیہ میں طوالت سے بچنے کی تاکید فرمائی تھی۔ مولانا احمد حسن صاحب نے حاشیہ بسط و تفصیل سے لکھنا شروع کیا ہے اس لئے طبع میں دیر ہو رہی ہے۔ حاجی صاحب کو یہ طوالت پسند نہیں۔ تاہم اختتام کے خواہش مند ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ کسی صورت سے زندگی میں جلد چھپ جائے۔



مذکورہ بالا حاجی صاحب کے خطوط مولانا تھانویؒ کو کانپور پہنچتے رہے ہیں جو خط حاجی صاحب کے پاس سے ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ اور اس کے بعد مولانا تھانوی کے پاس پہنچے ہیں وہ تھانہ بھون پہنچے ہیں کیونکہ اس اثنا میں مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کانپور کی ملازمت کا سلسلہ چھوڑ کر مستقل طور پر خانقاہ امدادیہ میں اپنے وطن تھانہ بھون میں مقیم ہو چکے ہیں چنانچہ اپنے مکتوب مورخہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ میں لکھتے ہیں:

”عزیزم مولوی محمد اشرف علی صاحب زاد اللہ عرفانہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ واضح ہو کہ خط آپ کا سنا، احوال سے آگاہی ہوئی۔ بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو از سر نو آباد کریں گے۔“ (مکتوبات ص: ۲۳-۲۴)

یہ وہی مسجد پیر محمد والی ہے جس میں حافظ محمد ضامن صاحب، مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی اور حاجی صاحب رہا کرتے تھے جس کا نہایت تفصیل سے ذکر آچکا ہے۔ اسی مسجد میں مدرسہ بھی تھا، اسی خانقاہ امدادیہ میں مولانا اشرف علی صاحب نے رشد و ہدایت کا نیا باب کھولا ہے۔

حاجی صاحب اپنے ایک اور مکتوب میں ۱۷ ربیع الآخر ۱۳۱۶ھ کا لکھا ہوا ہے مولانا تھانوی کو لکھتے ہیں:

”مولوی احمد حسن صاحب کی سعی حد درجہ کو پہنچ چکی ہے، جلد ثالث کا ابھی تک سامان نہیں ہے۔ پھر پندرہ سو روپیہ قرض بھی ہو گیا ہے۔“ (مکتوبات ص: ۳۸)

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ حاجی صاحب کی زندگی میں اس مکتوب کے لکھنے تک مثنوی کے دو دفتر چھپ چکے ہیں۔ اس خط کے بعد مولانا تھانوی کو جو آخری خط انہوں نے تحریر فرمایا ہے وہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ ایک سال بعد کا ہے، لیکن اس اثنا میں جو خطوط آئے ہیں ان میں مثنوی کا اور مولانا احمد حسن صاحب کانپوری بخشی مثنوی کا کوئی تذکرہ نہیں۔



اس خط کے دو ماہ بعد حاجی صاحب کا ۱۲/۱۳ یا ۱۳/۱۴ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ کو انتقال ہو گیا، لہذا مثنوی کی طباعت کے بقیہ تحقیقی حالات کے لئے ہمیں بھی اب خود اسی مطبوعہ مثنوی کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑا اور مَنْ جَدَّ وَجَدَ (جو کوشش کرتا ہے پاتا ہے) کے مطابق یہ حاجی صاحب کی عزیز از جان وِ دل محشی مثنوی پنجاب پبلک لائبریری لاہور سے مل گئی اور اس وقت ایک ماہ سے زیادہ عرصے سے میری تحقیقات کا نقطہ نگاہ بنی ہوئی ہے۔

اس مثنوی کے پہلے اور چھٹے دفتر کے آخر میں کتاب طبع کرانے والے صاحب کی طرف سے بہت ہی نایاب تحقیقی معلومات حاصل ہوئے۔ حالات اگرچہ ایک ایک صفحے پر ہیں لیکن مجھے جس چیز کی تلاش تھی اس میں مجھے سب کچھ مل گیا۔

میری تحقیق میں یہ بات آگئی کہ دوسرے اور تیسرے دفتر کے درمیان حاجی صاحب کے لئے موت کا پیغام آ گیا۔ چنانچہ ان دونوں دفاتروں میں آپ کے حاشیے کے آخر میں ”مرشدنا قبلہ عالم حاجی امداد اللہ صاحب مدظلہ العالی“ جا بجا لکھا ہوا ہے اور تیسرے دفتر میں ”مرشدنا حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ“ کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

### مثنوی کی طباعت کے منتظمین

اس مثنوی کی طباعت کا انتظام دو صاحبان کی منت کا مرہون ہے یعنی ابتدائی دو تین دفتر تو مولوی رحمت اللہ صاحب رحمہ اللہ کے انتظام سے ”مطبع نامی“ کانپور میں چھپے جیسا کہ پہلے دفتر کے اندر کے نائٹل کی عبارت ہے۔

بہ امداد اللہ

دفترِ اوّل - مثنوی شریف

از رحمت اللہ

در مطبع نامی واقع کانپور مطبوع گردید

اور باہر کے ٹائٹل کی عبارت یہ ہے:

”در مطبع نامی کانپور محمد رحمۃ اللہ علیہ طبع نمود، لیکن چھنے دفتر کے ٹائٹل کی عبارت حسب ذیل ہے:

”در مطبع محمود المطالع باہتمام سید محمود علی واقع کانپور مطبوعہ گردید۔“

بہر حال ان دونوں صاحبان کے مطبعوں میں یہ کتاب طبع ہوئی۔ چھنے دفتر کے آخر کے صفحہ پر طالع صاحب، مثنوی کی طباعت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ابتدائے طبعش در ۱۳۱۴ھ شدہ۔ در اثناے آں میسارے از حوادث روہادہ کہ بیانش طو لے وارد۔ فالحمد للہ کہ از پنجہ پرشورفتن رستگاری یافتہ در ۱۳۱۴ھ ہر شش دفتر تمام و کمال بصرف زر کثیر کہ تعدادش تقریباً چہار و ہزار است باوجود فقدان اسباب ظاہریہ محض بعنایت الہی و تصرف مرشد کامل بزیب اختتام رونق پذیر شد۔“

ترجمہ: اس مثنوی کی طباعت کی ابتدا ۱۳۱۴ھ میں ہوئی اور اس اثنا میں بہت سی مشکلات آڑے آئیں جن کا بیان طوالت سے خالی نہیں۔ سو خدا کا شکر ہے کہ فتنوں کے پرشور پنجے سے نکل کر ۱۳۲۱ھ میں چھ کے چھ دفتر زر کثیر کے صرف کے بعد جو چودہ ہزار کی رقم ہے، تمام و کمال طور پر ظاہری اسباب کے فقدان کے باوجود صرف اللہ تعالیٰ کے کرم اور مرشد کامل (حاجی صاحب) کے تصرف سے ختم ہو کر رونق پذیر ہوئے۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی طباعت کی ابتدا ۱۳۱۴ھ سے ہوئی اور ۱۳۲۱ھ کے سات آٹھ سال کے عرصہ میں یہ کتاب چھپ کر تیار ہوئی۔ مگر اس اثنا میں ۱۳۱۷ھ میں مثنوی کی تکمیل سے چار سال پہلے حاجی صاحب راہی ملک بقا ہو چکے تھے۔ مثنوی پر کل چودہ ہزار کی رقم صرف ہوئی۔ جو اس زمانے کے اعتبار سے بہت بڑی رقم خیال

کی جاتی تھی۔

## مثنوی کی ظاہری خوبصورتی

اس میں شک نہیں کہ راقم الحروف نے اپنی زندگی میں مثنوی کے جتنے دفتر دیکھے ان سب میں حاجی صاحب کے حاشئے والی مثنوی سے زیادہ عمدہ خوبصورت اور صحیح نسخہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ اس کی تمام لکھائی نہایت خوبصورت اور کسی اعلیٰ درجہ کے کاتب کی لکھی ہوئی ہے۔ ٹائٹل چار رنگہ ہے اور سنہرا بھی ہے۔

حاجی صاحب نے جو ہدایت مثنوی کی طباعت اور حاشیہ کے متعلق مولانا محمد یعقوب صاحب کو دی تھیں انہی ہدایات کی روشنی میں جلی قلم سے کتاب لکھی ہوئی ہے۔ چاروں طرف اور حسب ضرورت کتاب کے نچلے حصے میں حاشیہ ہے۔ لغت کے معانی سفیدی میں لکھے گئے ہیں۔ بعض نظموں کی مختصر تشریح بھی بین السطور میں لکھ دی گئی ہے، بلکہ حاجی صاحب کے الفاظ میں کہ عزیز موصوف نے مثنوی کا حق ادا کر دیا۔

## اصل حاشئے پر تحقیقی نظر

حاجی صاحب نے اپنے مریدین کو مثنوی کی طباعت کی طرف جو توجہ دلائی ہے اور مریدین نے بھی جس عقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے تمام کا منشا یہی ہے کہ حاجی صاحب کا مثنوی کا حاشیہ کسی صورت سے چھپ کر معتقدین اور اہل علم کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ اس سلسلے میں بہت سے لوگوں نے اس کی طباعت کا ارادہ کیا لیکن قرعہ قال جیسا کہ راقم الحروف نے پہلے بھی عرض کیا ہے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کے نام نکلا۔ مولانا کانپوری حاجی صاحب قبلہ کے مرید ہیں اور نہایت قابل اور فاضل آدمی ہیں۔ ان کے بعض اور کتابوں پر بھی حاشئے ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب سے مولانا نے دورانِ حج بخشی مثنوی طبع کرنے کے لئے حاصل کر لی اور اس کی طباعت کے لئے کمر ہمت کس لی۔ مگر اس اثنا میں



انہوں نے محسوس کیا کہ مثنوی کے حاشیہ کو پھیلایا جائے چنانچہ حاجی صاحب کے مختصر حواشی کے ساتھ ساتھ انہوں نے دیگر شرحوں سے استفادہ کیا اور ان کا خلاصہ بھی حواشی کے طور پر حاجی صاحب کے حاشیے کے ساتھ ساتھ درج کر دیا۔ اور حسب ضرورت اپنی فراست سے کام لے کر بھی تشریح کی۔ اور جہاں کہیں حاجی صاحب نے اشعار کی تشریح نہیں کی وہاں انہی شرحوں سے حاشیہ کو بھر دیا۔ گویا کتاب کو پھیلادیا۔ اسی طرف حاجی صاحب کے گذشتہ خطوط میں صراحت کی گئی ہے۔ بہر حال مثنوی کی شرح بحر العلوم اور مولانا ولی محمد صاحب کے مطالب کا خلاصہ مولانا رومی کے صاحبزادے سلطان ولد کی تشریحات اور دیگر شارحین کی تشریحات سے کتاب کو بڑھ کر دیا۔ اس سلسلے کی مزید تحقیقات اسی محشی مثنوی کے پہلے دفتر کے آخری صفحے سے حسب ذیل عبارت میں حاصل کیجئے۔ طابع مولوی رحمت اللہ صاحب رعد حمد و ثنا کے بعد لکھتے ہیں:

مثنوی حضرت مولانا روم کے اہل ظاہر بصورتش پویاں و صاحب باطن معنیش را  
جویاں کہ مجمع بحرین است یا مجموع الفائقین والی اللہ المستطیع کہ از دستبرد مطالع  
چہ عارت ہا است کہ برو نناختہ و از لغزش قلم ہا کدام تصرف ہاست کہ برو علم  
تفراختہ۔ پس دریں زماں مصدور البیان حضرت زبدۃ علمائے انا م عمده  
فضلائے عالی مقام جناب مولانا احمد حسن صاحب عم فیضہم حسب ایمائے  
شریف و فرمان مدیف یادگار سلف، یکتائے خلف، آشنائے بحر تہ قیق، دانائے  
رموز تحقیق، آیہ من آیات اللہ حضرت حاجی محمد امداد اللہ صاحب مہاجر کی روحی  
فداہ مطبع ہذا را بطبعش حقا کہ اقیم ہند را ممنون نمودند۔ مساعی جیلہ حضرت  
مدوح در صحیح کتاب موصوف الصدور نہ بمرتبہ ایست کہ صفحہ قرطاس گنجائش او  
دارد یا ناطقہ بیان شمرہ اذال بفعلیت آرد لکن بقول شخصے مالا یدرک کلا لایترک  
کلمہ جملش ایں کہ جناب موصوف در طبعش امور ذیل مرعی داشتہ اند۔

۱..... اول منقش را بمحمد دنجہای مقابل فرمودند کہ ہر کئی را بجای صد کتاب توان گفت۔ نہ نہ کہ صد گوہر از مختلف کانہا بر آوردہ بیک سبک سفند چہ اگر کہ بعضی از مثنوی مولانا جامی علیہ الرحمۃ منقول است و دیگری در کتب نہائے شاہی بگنجینہ بی بہا موصول۔ حتی کہ بعضی تقریباً بصد نسخہ تصحیح کردہ شد و دیگری بدست ہزار علمائے ظاہری و باطنی و شمال ماندہ و علی ہذا النقیس۔

۲..... دوم آن کہ حتی الوسع در موانع اختلاف پیچ نسخہ فرو گذاشت نکشتہ۔ طرفہ ایں کہ ہر جملہ بامناسب خود کما حقہ پیوست نہ آن کہ بر طبق ابنائے زمان از کثرت نسخہا بجز اندراج غرض نہ داشتہ و قشر را از لب نشاختہ۔

۳..... سوم آن کہ در انتخاب حواشی قلیل البانی کثیر المعانی نہایت مسجانی نمودند کہ در حل مطالب نظیرش در چشم فلک نمکدشتہ یعنی اولاً با التزام حواشی حضرت پیر مرشد حقیقی جناب حاجی صاحب را در حوض درج نمودند۔ ثانیاً تحریرات متفرقہ از شروح معتمدہ و مخترعات طبیعت و قاعدہ بر حاشیہ مزید کردند۔ حتی کہ حواشی کتاب مذکورہ خلاصہ بست شرح گفتن رواست و رقم ہائے متعلقہ اور الب لباب صدہا مضامین نوشتن سزا۔

بعد ایں چنین تصحیح بالا کلام و تنقیح حسب مرام کلام مثنوی مطبوعہ یا قلمی را یا را کہ بوصف مجموعی و علوی ہمسریش دارد۔ یا پیچ صحیح و صاحب مطبع بہتائیش لب بکشاید۔ نظر بانصاف توقع از حضرات متوسلین درس تدریس مثنوی مولوی معنوی و مشتقین استفادہ قرآن زبان پہلوی آنست کہ اگر نسخہ ہذا را بتقدیم و تاخیر یا ترک بعض اشعار در بعض مقامات بکسب موجودہ مخالف دانند یقین باید کرد کہ منشا ایں اختلاف غایت تصحیح است و ایں چنین اشعار در ہمیں کتاب بدیگر دفتر ہا بمواقع مناسبہ باشد و الان نسبت تبصرات ملخصین کردہ آید۔

۴..... چہارم آں کہ دفتر اولیٰ و باہتمام مذکورہ بالا ہدیہ ناظرین است انشاء اللہ العزیز بقیہ دفا تر ہم بدو چند رعایت عنقریب حلیہ طبع بیا راید۔ ہر گاہ کہ در طبع کتاب مذکور مصارف جانی و مالی منحصر بذات مقدس مولانا ممدوح است مطبع را بجز خدمت گذاری الطباع استحقاقی نہ پس حضرات کہ ارادہ خریداری ایں گوہر آبدار دارند بخد مت مولانا مبولوی احمد حسن صاحب معزی انجم از شہر کانپور مسجد رنگیاں طلب فرمایند۔

توجہ: مولانا روم کی مثنوی کے ظاہر پر نظر رکھنے والے اس کی صورت کی طرف دوڑتے ہیں اور اہل باطن اس کے معانی کے طلبگار ہیں حقیقت یہ ہے کہ مجمع بحرین ہے یا مجموع الیقین۔ اور اللہ سے ہی فریاد ہے کہ چھاپہ خانوں کی دست اندازی سے اس (مثنوی) پر مصیبتیں نو میں اور لکھنے والوں کی لغزشوں سے اس میں طرح طرح کی تبدیلیاں ہوئیں، پس مذکورہ بالا زمانہ میں حضرت زبدۃ علمائے عمدہ فضلائے عالی مقام جناب مولانا احمد حسن صاحب عم فیضہم نے حسب الحکم یادگار سلف، یکتائے خلف، آشنائے بحر مدقیق، دانائے رموز تحقیق، اللہ کی آیات میں سے ایک آیت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کی روحی فداہ نے اس مطبع کو اس کے چھاپنے کے لئے حکم فرمایا اور خاص طور پر مطبع والوں بلکہ حق یہ ہے کہ اہل ہند کو ممنون فرمایا۔ حضرت ممدوح (مولانا احمد حسن) کی کوششیں مثنوی کی تصحیح میں ناقابل بیان و تحریر ہیں۔ لیکن کسی کے قول کے مطابق کہ

مَا لَا يُدْرِكُ كُنْهَ لَا يُتْرَكُ كُنْهَ

اجمالی کیفیت یہ ہے کہ مولانا احمد حسن صاحب نے اس کے طبع کرانے میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھا ہے۔

۱..... اول یہ کہ مثنوی کے اصل اشعار کو متعدد مثنوی کے نسخوں سے مطابق کیا کہ جن میں سے ہر ایک کو سو کتابیں کی جگہ کہا جاسکتا ہے۔ نہیں نہیں کہ سوموئی مختلف کانوں سے نکال کر ایک ٹری میں پروئے کیوں کہ بعض تو مولانا جامی کی مثنوی سے منقول ہیں اور دوسری شاہی کتب خانہ سے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض تقریباً سو نسخوں سے تصحیح کی گئیں۔ اور دوسری ظاہری ہزاروں عنان کے ہاتھوں میں رہی و علیٰ ہذا القیاس۔

۲..... دوسری یہ کہ حتیٰ المقدور اختلاف کے مواقع میں کوئی بھی نسخہ نہیں چھوڑا گیا۔ عجب یہ کہ تمام کو کا حقہ مناسب جگہ رکھا گیا، ایسا نہیں جیسا کہ دوسرے اہل زمانہ نے بہت سی مثنویوں سے بغیر صحیح و غلط کی تمیز کے نقل کر لیا۔

۳..... تیسرے یہ کہ قلیل الفاظ اور کثیر معانی حواشی کے انتخاب میں کمال کیا ہے یہ ایسے حواشی ہیں کہ اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ سب سے زیادہ ضروری حضرت پیر مرشد حاجی امداد اللہ صاحب کے حواشی کو درج کیا گیا۔ بعد ازاں متفرق شرحوں کی تحریروں کو اور خود اپنی (مولانا احمد حسن صاحب کی) فہم کے مطابق حاشے پر مزید کچھ لکھا گیا، تا آنکہ اس مثنوی کے حاشیوں کو بیس شرحوں کا خلاصہ کہنا درست ہے۔ اور اس سے متعلق تحریروں کو صد ہا مضامین کا خلاصہ لکھنا لائق ہے۔

اس جیسی اجتہاد درجہ کی حسب مناسبت کے بعد کسی مطبوعہ یا قلمی مثنوی کو اس کی ہمسری کا درجہ دینا ٹھیک نہیں، یا کوئی تصحیح کرنے والا اور صاحب مطبع اس کی برابری کا دعویٰ کرے۔ اس لئے مثنوی کے پڑھانے والوں اور زبان پہلوئی کے قرآن یعنی مثنوی سے ذوق و شوق رکھنے والوں سے یہ توقع ہے کہ اس نسخے کو اشعار کی تقدیم و تاخیر یا بعض اشعار کے ترک پر اختلاف پائیں تو اس کو

غایت صحت پر محمول فرمائیں۔ اور اس قسم کے اشعار اسی کتاب میں دوسرے  
دفتروں میں مناسب مواقع پر ہونگے ورنہ اپنی طرف سے لاحقین کا تصرف  
خیال کریں۔

۴..... چوتھے یہ کہ پہلا دفتر مذکورہ بالا انتظام کے بعد ہدیہ ناظرین ہے۔ انشاء  
اللہ مثنوی کے دوسرے دفتر بھی دو چند رعایت سے عنقریب چھپ کر شائع ہوں  
گے۔ ہاں یہ بھی سن لیجئے کہ اس کتاب میں جانی و مالی مصارف مولانا (احمد حسن  
صاحب) کے ہیں۔ مطبع کو صرف طبع کرنے کے سوا کوئی دخل نہیں۔ اس لئے  
جو صاحب اس کو خریدنا چاہیں وہ مولانا مولوی احمد حسن صاحب سے شہر کانپور  
مسجد رنگیاں کے پتہ پر طلب فرمائیں۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کے حاشے کو اصل قرار دیتے ہوئے تقریباً  
بیس شرحوں کا خلاصہ کر کے مولانا احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس مثنوی کے نسخے کو  
شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے یقیناً بڑی محنت اور کاوش و ماغی کے علاوہ مالی  
قربانیاں بھی کی ہیں اور قبلہ مرشد حاجی صاحب کے کارنامے کو اجاگر کرنے اور لوگوں سے  
روشناس کرانے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

چھٹا دفتر جو ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ میں پانچویں دفتر سے دو سال بعد چھپا ہے اس کے آخر میں  
بھی اعلان کے عنوان کے ماتحت ایک صفحے کی فارسی عبارت ہے جس میں پہلے حمد ہے بعد  
ازاں نعت اور اس کے بعد انسان کی پیدائش کا مقصد یعنی حصول معرفت مرشد کامل کی  
رہبری اور تصوف کی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کتابوں میں مثنوی  
کے مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے طالع لکھتے ہیں:

عمدہ ترین وسائل حصولِ این نعمت جزیلہ مزاولت مثنوی مولانا نے روم است۔  
ہر کس از اصحابِ ظاہر و باطن باطن درخور استعداد بہرہ مند فیوض نامتناہی گشتہ۔

بہار عالم حشّشِ دل و جاں تازہ میدارد

برنگ اصحاب صورت را بوار یاب معنی را

صد ہا اولیائے کرام عالی مقام از مطابعتش بحصول مقصود قاتر شدند، و ہزار ہا صلحائے عظام از فہم مضامینش بہرہ یاب گشتند۔ مگر از غار نگر یہائے ناسحقین فغانی بلند با سماء می رسید۔ و از کثرت اغلاط و دو آہ مشاقین بہ سپہری و بسیاری از تصرفات را محزون و اکثری از تحریفات را معدن گشتہ بود تا آنکہ بحر موج عنایت لم یزل بجوش آمدہ و گلابگ شادی بجزوش یعنی مقبول خداوند ذوالمنن سیدنا و مقتدانا مولانا احمد حسن صاحب حسب فرمان واجب الاذعان مقتدائی عازمان پیشوای خدا شناس غواص بحر تجرید، واقف دریائے تفرید عارف کامل، مکمل آیۃ من آیات اللہ صاحب مہاجر مکہ مجلہ نور اللہ مضجیہ در صحیح متن مثنوی شریف و ادراج پنجہائے لطیف بمواقع مناسبہ و تقدیم و تاخیر اشعار بر خبیائے محققہ و ہم در ترجمین کتاب مسطور بدر تحریمات حضرت مرشد کامل ممدوح الصدر و انتخابات بدیعہ و مختصرات غریبہ و تلخیص مضامین شروع متعدّدہ باختصار مرغوب و اقتصار مطلوب سعی تمام و کوشش بلا کلام مبذول فرمودند حق نیست کہ از احاطہ توصیف حسن ظاہر و باطن کتاب مستطاب وسعت میدان تبیان معترف بقصورست، و از اظہار کمالش زبان فصیح البیان مقرب بشور۔ و قاتر سابقہ کہ بعد کمالیہ انطباع ہدیہ ناظرین شدہ بر کمالش شاہد یست کافی و برہان یست وافی۔ بحمد اللہ کہ دفتر ششم کہ از مدت دو سال در خیام عوائق و موانع مقصود و مستور گشتہ بود، و دیدہ مشتاقین جمالی خوش منظرش در رنگ نایابگی شاہد رعنائی تاب بود، ہم لباس فاخرہ طبع آراستہ و پیراستہ گردید۔

ساقی بیا کہ یار زرخ پرده برگرفت

کار چراغ خلوتیاں باز در گرفت

بار غمیکہ خاطر ما خستہ کردہ بود  
عیسیٰ دے خدا بفرستاد و برگرفت

توجہ: اس نعمت (معرفت) کے حاصل کرنے کے لئے مثنوی مولانا روم بہترین وسیلہ ہے۔ اس مثنوی سے ظاہری اور باطنی علماء نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق بے شمار فیض حاصل کئے ہیں۔

اس کے حسن کی بہارِ دل و جان کو تازہ رکھتی ہے  
صورت کے بھوکوں کو رنگ سے اور باطن کے طلبگاروں کو معنی سے

صد ہا عالی مقام اولیائے کرام اس کے مطالعہ سے اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوئے اور ہزار ہا صلحاء اس کے مضامین پا کر فیض ہوئے، لیکن کاتبوں کی حماقتوں سے فریاد ہے جن کی غلطیوں سے کتاب کا ستیاناس ہو گیا۔ چنانچہ یہ مثنوی ان کی تبدیلیوں سے مسخ ہو کر رہ گئی یہاں تک کہ قدرت کا دریائے موجِ جوش میں آیا اور اس نے خوشی کا پیغام دیا یعنی خدا تعالیٰ کے نیک بندے مولانا احمد حسن صاحب نے مقتدائے عارفان، پیشوائے خدا شناسان، غواص بحر تجرید، واقف دریائے تفرید، عارفِ کامل و مکمل، اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی حضرت سیدنا مولانا حاجی شاہ محمد امداد اللہ صاحب مہاجر کی نور اللہ مضجود کے حکم سے مثنوی شریف کے متن کی تصحیح کر کے اور لطیف نسخوں (۱) کو مناسب مقامات پر درج کر کے اور تحقیق شدہ عنوانات کے ماتحت اشعار کو آگے پیچھے کر کے اور کتاب مذکور کو حضرت مرشدِ کامل (حاجی صاحب)

(۱) نسخوں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو مختلف مثنویوں میں مختلف پائے گئے۔ مثلاً مثنویوں میں یک زمانہ صحت با اولیا۔ بہتر از صد سالہ یودن در لقا کی بجائے یک زمانہ صحت با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا۔ گویا صحت اور لقا کی بجائے اور بے ریا پر نہ کا نشان بنا کر حاشیہ پر دوسرے الفاظ لکھ دیئے جاتے ہیں کہ بعض مثنویوں میں ان لفظوں کی بجائے یہ الفاظ ہیں۔ لہذا ان کو نسخہ کہا جاتا ہے۔ منصف

موصوف کے حواشی سے سجا کر اور عمدہ انتخابات اور بہترین طبع زاد معانی و مطالب اور متعدد شرحوں کے مضامین کا خلاصہ کر کے مناسب اختصار کے ساتھ پوری کوشش اور بے حد سعی صرف کی۔ حق یہ ہے کہ اس کا ظاہری و باطنی حسن احاطہ تحریر سے باہر ہے اور اس کے کمالات کا اظہار کرنے سے فصیح فصیح زبان بھی عاجز ہے مثنوی کے پہلے چھپے ہوئے دفتر ہمارے بیان کے شاہد ہیں اور ہمارے قول پر روشن دلیل ہیں۔ الحمد للہ کہ چھدفتر جو دو سال کی مدت سے موانع اور مشکلات کے چکر میں پھنسا ہوا تھا اور دیکھنے والوں کی نگاہیں اس کے حسن و جمال کے دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں وہ دفتر بھی عمدہ چھپائی سے آراستہ ہو کر سامنے آ گیا۔

اے ساقی آ کہ یار نے چہرے سے نقاب اٹھا دی  
اور خلوت میں بیٹھنے والوں کا چراغ گل کر دیا  
اور جس غم کے بوجھ نے ہمیں تباہ کر دیا تھا ایک عیسیٰ نفس کو خدا نے بھیجا اور اس  
نے اس کو اٹھا لیا۔

یہاں تک اعلان کی عبارت کا مقصد یہ نکلا کہ مثنوی معنوی کے مطالعہ سے ہزاروں عارفین اور علماء نے معرفت الہی حاصل کی۔ مگر کاتبوں کی دستبرد سے مولانا روم کی اصل مثنوی میں بہت سی غلطیاں پیدا ہو گئیں نہ صرف غلطیاں، بلکہ بعض غیر محتاط لوگوں نے تو اس میں الحاقی اشعار کا سلسلہ جاری کر دیا جس سے مثنوی میں زبردست تبدیلیاں رونما ہو گئیں اور اصلیت میں مسخ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مولانا احمد حسن صاحب نے یقیناً مختلف مثنویوں سے مقابلہ کر کے کتاب کو درست کیا۔ لیکن حاجی صاحب کی مثنوی کا نسخہ خود ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں بہت صحیح کیا جا چکا تھا۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ اسی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کے نوشتہ



تمام حاشیہ کو اس میں جگہ دی گئی اور خرید براں دوشروں کا خلاصہ مطالب اور خود اپنی فہم سے بھی کافی کام لیا گیا۔

ان حقیقتوں کے علاوہ اس مطبع نے ایک اور زبردست کارنامہ کیا کہ مثنوی کا تتمہ جو مفتی الہی بخش صاحب کاندھلوی مرحوم کا لکھا ہوا تھا اور جس کی طباعت کے لئے حاجی صاحب نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی لکھا تھا اس پر بھی مولانا احمد حسن صاحب نے حاشیہ لکھا اور اس کو بھی ساتویں دفتر کی طرح اسی تقطیع پر نہایت خوبصورت طبع کرایا گیا۔ چنانچہ اعلان کی عبارت یہ ہے۔

تتمہ مثنوی شریف مصنفہ جناب مفتی الہی بخش کاندھلوی قدس سرہ مثل دفاتر مثنوی مزین یہ تصحیح و تحشیہ شدہ بقالب طبع در آمدہ است لیکن از دفتر ششم علیحدہ چاپ نموده آمد تا باعث از دیاد حجم دفتر ششم کہ ہم از اکثر دفاتر کلاں تراست، مگردد، و موجب بدتمائی جلد و سبب زیادت قیمت مستہرہ ہر دفتر نشود۔

توجہ: مثنوی شریف کا تتمہ جس کو مفتی الہی بخش صاحب کاندھلوی قدس سرہ نے تصنیف فرمایا تھا، مثنوی کے دوسرے دفتروں کی طرح تصحیح اور حاشیہ کے بعد چھپ گیا ہے لیکن چھٹے دفتر سے علیحدہ کر کے چھاپا گیا ہے تاکہ دفتر ششم کی ضخامت زیادہ نہ ہو جائے اور جلد کی بدتمائی اور اعلان کردہ قیمت سے زیادہ قیمت کا باعث نہ بن جائے کیوں کہ چھٹا دفتر باقی دفتروں سے زیادہ ضخیم ہے۔

اس تتمہ کے علاوہ ایک اور قابل تحسین امر یہ ہے کہ مولانا احمد حسن صاحب نے چھٹے دفتر کے آخر میں حضرت فریدوں معروف بہ سپہ سالار کا تصنیف کردہ رسالہ جس میں مولانا روم کے مناقب اور ان کے خلفاء کے حالات درج ہیں اور جو سونگوں پر مشتمل ہے طبع کرایا، حضرت سپہ سالار مولانا روم کی خدمت میں چالیس سال رہے ہیں اس لئے مثنوی کا یہ ایڈیشن اپنی نوعیت میں قابل فخر و مسرت ہے۔ یہ رسالہ فارسی میں ہے اور اس میں سلطان

العلماء سید بہاء الدین، سیدنا جلال الدین، سید برہان الدین، حضرت شمس الدین، حضرت زکوب صلاح الدین، سیدنا چلی حسام الدین، سلطان ولد بہاء الدین، حضرت جلال الدین چلی، حضرت عابد شمس الدین چلی، سیدنا چلی صلاح الدین، سیدنا چلی واجد حسام الدین اور حضرت علاء الدین رحمہم اللہ علیہم کے حالات اور مناقب درج ہیں اور ان کے حالات کے ضمن میں مولانا رومی کے مناقب اور صفات کی تفصیلات کا پتہ چلتا ہے جن سے مولانا روم کی شخصیت کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس رسالہ کا اردو زبان میں ترجمہ کر کے اور مولانا روم سے متعلق بہت سے معلومات پیش کر کے قارئین کے لئے دعوت فکر و نظر دوں۔ مثنوی کا یہ ایسا ایڈیشن ہے کہ دوبارہ چھپنا اس کو نصیب نہ ہوا۔ چنانچہ آج کل بالکل نایاب ہے، بلکہ معدودے چند کے سوا کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ حاجی صاحب خود کون تھے اور انہوں نے مثنوی کا کوئی حاشیہ بھی لکھا تھا اور ان کے مرید مولانا احمد حسن صاحب مرحوم نے نہایت تفصیلی اور تحقیقی اضافے کر کے اہل علم کے لئے بیش بہا علمی خدمات انجام دی تھیں۔ یہ امر بھی حیرت سے خالی نہیں کہ اگر یہ اعلانات جو پہلے اور چھٹے دفتر کے آخر میں ہیں نہ ہوتے اور مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات اس سے متعلق تصریحات نہ ہوتیں تو یہ بھی پتہ چلانا بے حد مشکل ہو جاتا کہ اس حاشیہ کی خدمات مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے انجام دی ہیں کیوں کہ کسی دفتر کے اوّل میں یا اور کسی جگہ مولانا احمد حسن صاحب کا نام تک مذکور نہیں۔ اور یہ غالباً اس لئے کہ انہوں نے مائیکل پر اپنا نام لکھوانا اپنے مرشد رحمۃ اللہ علیہ کی جناب میں گستاخی تصور کیا ہوگا۔ اسی لئے مائیکل پر صرف یہ عبارت ہے ”بہ امداد اللہ دفتر اوّل باہتمام مثنوی رحمۃ اللہ مطبع نامی یا نظامی میں باہتمام محمود علی صاحب طبع ہوا۔“

ہم نے یہاں تک تحقیقات میں جس قدر تفصیلات سے کام لیا ہے وہ اس قدر طویل ہو چکی ہیں کہ اس سے زیادہ لکھنا دوسری سے کم نہیں۔ اس لئے اب ہم صرف حاجی صاحب



کے بعض حواشی مزید تحقیقات کے لئے پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین ان کی محنت لیاقت اور مقام معرفت اور ذوق مثنوی کا اندازہ لگاسکیں۔

## حاجی صاحب کے بعض حواشی

### اور مطالب مثنوی

حاجی صاحب نے مثنوی کے اشعار کے جو مطالب بیان کئے ہیں اور جو شرح تحریر فرمائی ہے ان میں سے کچھ حسب ذیل پیش خدمت ہیں۔ اس سلسلہ میں مثنوی کے پہلے دفتر کا پہلا شعر اور اس کا مطلب ملاحظہ فرمائیے۔

بشنو از نی چوں حکایت میکند از جدائی با شکایت می کند

از نی مراد انسان کامل کہ ذات حضرت مولانا جلال الدین رومی است، اگرچہ

ذات مبارک ایشاں در عین وصال است اما مطابق آنکہ۔

گفتش در عین وصل ایں نلہ و فریاد چیست گفت مارا جلوہ معشوق دریں کار داشت

و در مفارقت از عالم قدس احتمال قبض وسط ہم است۔ مشاہدۃ الابرار میں التجلی

والاستتار۔

بہر استبقای ایں جسم چو جاں لجہ در ابر گردو خور نہاں

پس چنانچہ حسن و جلی حق را نہایت نیست ذوق و شوق ایشاں را ہم پایانی نیست

کہ مدام دمسازند و مشتاق اند ۱۲ قبلہ عالم حاجی محمد امداد اللہ صاحب دام ظلہم

العلی۔ (مثنوی دفتر اول ص ۲ حاشیہ نمبر ۱)

سر پہنان است اندر زیر و بم فاش گر گویم جہاں برہم زہم

آنچہ فی می گوید اندر ایں دو باب گر گویم من جہاں گرد و خواب

پہلے شعر میں جو مولانا روم نے، نے کی حکایت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ وہ کیا کہتی ہے

یعنی فراق کی شکایت کرتی ہے۔ مولانا روم اس راز کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ ان دونوں شعروں میں انہوں نے یہ فرمایا کہ بانسری کے زیر و بم میں جو راز پوشیدہ ہے اگر میں اس کو فاش کر دوں تو دُنیا درہم برہم ہو جائے گی۔ ان دونوں اشعار میں سے دوسرے شعر کی شرح میں حاجی صاحب لکھتے ہیں:

قولہ گر گویم الخ اے اگر فاش گویم یعنی فراق کہ نے در زیر و بم میگوید اگر من گویم جہاں خراب شود۔ زیرا کہ گفتار ہر گوندہ را بقدر حال آں گویند و آثار ست و یقین است کہ حالت من بمراتب از حالت نے زیادہ است۔ پس گویا بوجہ خرابی جہاں اشارہ می نماید در آنچہ می فرماید کہ۔

جملہ معشوق است و عاشق پردہ ۱۲۔ مرشدنا قبلہ و عالمِ غم فیضہم (دفترِ اول ص ۵ حاشیہ نمبر ۱۰)

یک زمانہ صحبت با اولیا بہتر از صد سال بودن در تقا  
حضرت مرشدنا (حاجی امداد اللہ صاحب) مد اللہ ظلہ در وقت درسِ مثنوی وغیرہ فرمودند کہ مراد ازیں زمانہ مطلق نیست بلکہ وقتِ خاص است کہ بر اولیائے کرام می آید۔ صحبتِ آں وقت موجبِ ایں جنسِ فضیلت و کرامت ست نہ مطلق صحبت۔ اگرچہ مطلق صحبت خالی از فائدہ نیست ۱۲ (دفترِ اول ص ۶۲ حاشیہ نمبر ۱)

(نوٹ) صاحبِ شائِم امداد یہ لکھتے ہیں کہ حاجی صاحب نے اس شعر کے متعلق فرمایا کہ اس سے زمان عام نہیں بلکہ زمان عام مخصوص ہے جب اَنْ لِسِی مَعَ اللہ وقت میسر ہو۔ وہ وقت مراد ہے۔ اور فرمایا کہ ایک دم میں ولایت حاصل کرنے کے لئے خدمت کرنا چاہئے جیسے کہ حضرت شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ مرید حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سرہ اپنے مرشد کی انواع و اقسام کی خدمت کرتے تھے اور بڑی مشقت کرتے تھے۔ دن کو دن اور رات کو رات نہیں جانتے تھے، ایک دن شاہ صاحب نے نکال دیا، شاہ بھیک صاحب شہر کے ارد گرد

گھومتے پھرتے۔ ایک دن شاہ (ابوالمعالی) صاحب کی اہلیہ نے کہا کہ تم نے ایسے بے حس آدمی کو کیوں نکال دیا اگر وہ ہوتا تو کوئی کام ہی کرتا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے نکال دیا ہے تم نے تو نہیں نکالا تم بلاؤ۔ غرض کہ شاہ بھیک صاحب کو طلب کر کے کوٹھے کی چھت بنانے کا حکم دیا، شاہ بھیک بے تکلف اکیلے بنانے لگے، اور بڑی بڑی لکڑیوں کو کاٹ تراش کر چھت بنانی شروع کی، حضرت کو یہ خدمت پسند آئی۔ چونکہ ان کی مشقتیں انتہا کو پہنچ چکی تھیں اس لئے شاہ ابوالمعالی نے ایک دم میں توجہ باطنی سے کمال کو پہنچا دیا۔

(شام ص ۹۳-۹۴)

ایں نہ جبر ایں معنی جبری ست      ذکر جباری برائے زاری ست  
زاری ما شد دلیل اختیار      خجالت ما شد دلیل اختیار  
یعنی جبر نیست، بلکہ مشاہد و غلبہ قدرت حضرت باری و مطالعہ آثار جباری  
اوست و تفویض و تسلیم جمیع امور بوجود مطلق کہ وجود امکانی در جب آں وجود  
واجبی ابداً مستہلک و متلاشی است، تا دریافت ایں معنی در بحر و تضرع و نالہ و زاری  
بیفزاید مذہب اہلسنت و جماعت جبر متوسط نہ بالکل جبر نہ بالکل اختیار بلکہ  
چیزی میانہ مثل نالیدن بیمار کہ ہم بہ بے اختیاری است و ہم با اختیار و اللہ اعلم۔  
مرشدنا قبلہ عالم جناب حاجی امداد اللہ صاحب علم فیضیم (دفتر ازل ص ۵۴- حاشیہ نمبر ۱)  
من کسے درنا کسے دریافتم      پس کسے درنا کسے در باختم

بموجب ایں تقریر و دریافتن کسے درنا کسی عبارت از حصول مرتبہ فناء الفناست۔  
بایں خطاب مشرف گردیدیم، اما از ایں مقولہ کہ سرالہی بر من مکشوف شد یا نہ شد  
تصریح نفرمودند زیرا کہ حق تعالیٰ کہ در حق بندگاں واقع ست و رضی اللہ عنہم  
و رضوا عنہ و یحبہم و یحبونہ بر سبقت نوازش و برضا و محبت و شاہد عادل  
اند بیان می فرماید تا تراد و وقوع ایں خطاب شبہہ روند ہدو متیقن شود کہ ظہور

کمال در صورت نقصان من حیث المجاز ہم شواہد بسیار دارد، پس بدانی کہ محبت  
درضای، فرغ و نتیجہ محبت و رضای خالق است کما قال۔

جملہ شاہان بندہ بندہ خود اندی گویند۔

چونکہ عاشق اوست تو خاموش باش او چو گوشت می کشد تو گوش باش  
مراد آنست کہ ہر چند سبقت در محبت از حق است بندہ را باید کہ خود را محبوب نداند  
و مغرور نشود و در مقام ادب و فرمانبرداری باشد، مثلاً ہر مرید چون شیخ عاشق شود  
باید کہ مرید لوازم معشوقی را بکند و شرائط مریدی بجا آورد ۱۲ مرشدنا قبلہ عالم عم  
فیضہم (دفتر اول ص: ۱۵۱ حاشیہ ۴)

چون نباشد عشق را پردای او او چو مرغی ماند بی پردائی او  
یعنی چون عشق را کہ مراد از آن معشوق است، خواہ بآن اعتبار کہ نظر بآن اعتبار  
علم و عالم و معلوم یکے می گویند خواہ بآن نظر کہ مصدر بمعنی اسم مفعول است پردای  
آن عاشق نباشد و او را محافظت چنانچہ صاحب پردہ را می نماید این عاشق بچو  
مرغی بی پرماندای افسوس آن عاشق را ۱۲ مرشدنا قبلہ عالم دام ظلہم العالی۔

نے حریف ہر کہ از یاری برید پرداہائش پر دہائے مادرید  
قولہ نے حریف۔ یار و عنخوار۔ پردہ بانش۔ آواز ہا۔ یعنی ما کہ از فرقت دلدار بر وجہ  
اضطراب اصطبار نمودہ ایم چون نے پردہ ہا انداخت ما را غم فراق در جوش آورد و بی  
اختیار کرد۔ پردہ بائے ما کہ در میان محبوب بود درید۔ یعنی حجاب ہستی از پیش نظر  
برداشت و کشف اسرار نمودند۔ مرشدنا قبلہ عالم عم فیضہم۔

ترک استنا مراد مہ قسوتے ست فی ہمیں گفتن کہ عارض حالتیست  
مراد از ترک استنا غفلت قلبیہ است خواہ از زبان متروک باشد و یا بر زبان  
جاری شود ۱۲ (نے ہمیں گفتن کہ عارض حالتیست) گفتن استنا از زبان عارض  
حالتست و از قلب ناشی نیست۔ بالجملہ این گفتن با غفلت نیز داخل ترک استنا

است۔ ۲۔ ارشدنا قبلہ عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (دفترِ اول ص: ۸۰ حاشیہ: ۱) یہ ہیں مثنوی مولانا نے روم حاجی صاحب کے حواشی یا فوائد جن کو ہم نے قارئین کی ضیافت طبع کے لئے محض نمونے کے طور پر پیش کر دیا ہے۔ راقم الحروف کو بہت مسرت ہے کہ اس نے حاجی صاحب کی تصنیفات میں پوری ذمہ داری اور تحقیق سے کام لے کر ان حقیقتوں کو آشکارا کیا ہے جو مدتوں سے گمنامی کے گوشوں میں کسمپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی کراہ رہی تھیں۔

## دفترِ ہفتم مثنوی

### از مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ

حاجی صاحب کے حواشی کے سلسلے میں دو باتیں اس قابل ہیں کہ ان پر بھی ذرا ہم معلومات میں اضافے کے طور پر تفصیلات پیش کر دیں۔ ایک تو یہ جیسا کہ ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ مولانا رومی نے مثنوی کا چھٹا دفتر نامکمل چھوڑا تھا اور جب آپ کو دفتر مکمل کرنے کے لئے یاد دہانی کرائی گئی تو آپ نے فرمایا تھا کہ اس کو اب کوئی اور خدا آگاہ انسان مکمل کرے گا۔ چنانچہ مفتی الہی بخش صاحب کاندھلوی نے چھٹا دفتر تھانہ بھون کی مسجد پیر محمد والی میں مکمل کیا تھا جس کا ذکر حکیم محمد عمر صاحب چر تھاولی نے کیا ہے۔ اور جس کو حاجی صاحب کی فرمائش کے مطابق بطور ضمیمہ مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے علیحدہ چھپوایا تھا۔ افسوس کہ یہ ضمیمہ ہمیں باوجود تلاش بسیار نہ مل سکا۔ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے کتب خانے کی فہرست میں حاجی صاحب کی محشی مثنوی موجود ہے اور مفتی الہی بخش صاحب کا وہ ضمیمہ بھی درج ہے لیکن شمیم صاحب نے اور میں نے بہت تلاش کیا مگر ضمیمہ نہ مل سکا۔ پنجاب پبلک لائبریری میں بھی حاجی صاحب کی محشی مثنوی ہے لیکن مفتی صاحب کا ضمیمہ موجود نہیں۔ مگر دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ مفتی الہی بخش صاحب کے ضمیمے کے تجسس



میں ایک اور کتاب ہمیں ملی جو مثنوی مولانا روم کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور دفتر ہفتم مثنوی کے نام پر مولانا شیخ محمد محدث تھانوی نے تحریر فرمائی ہے۔ اسی دفتر ہفتم کے متعلق مولانا روم کے صاحبزادے نے بھی ان کو توجہ دلائی تھی۔

## ذکر جمیل مولانا محمد محدث تھانوی

مثنوی کے دفتر ہفتم پر تبصرہ کرنے سے پہلے قدرے مولانا محمد محدث کا ذکر بھی زینت تذکرہ بنادیں۔ یہ مولانا شیخ محمد محدث وہی عالم دانشمند ہیں جن کا ذکر جہاد شاہلی کے سلسلے میں کئی جگہ آچکا ہے اور پیر محمد والی مسجد تھانہ بھون میں یہی تین حضرات یعنی حاجی صاحب حافظ محمد ضامن صاحب اور مولانا محمد محدث صاحب شریعت و طریقت کے تین درخشندہ آفتاب تھے جو ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، حاجی صاحب مکہ مکرمہ کو ہجرت کر گئے، حافظ صاحب شہید ہو گئے، محدث صاحب تھانہ بھون میں رہے لیکن پھر تازندگی اطمینان نصیب نہ ہوا، ہم مولانا کے حالات مولانا نسیم احمد صاحب فریدی کے مضمون سے لے رہے ہیں جو تذکرہ دیوبند اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ہے، اور انہوں نے یہ مضمون مولانا محمد صاحب کے مرید حکیم محمد عمر چر تھانوی ضلع مظفر نگر کی کتاب ”حالات محمدیہ“ سے اخذ کیا ہے جو ان کو حکیم عبدالواحد خاں صاحب اور ان کے بڑے بھائی حکیم محمد الیاس صاحب کرپوری، بجنوری کے کتب خانے سے ملی۔

## تاریخ پیدائش اور نام و نسب نیز والد کا نام اور وطن

مولانا شیخ محمد صاحب کے والد کا نام نامی مولانا احمد اللہ تھا۔ آپ تھانہ بھون میں ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۰ھ کو پیر کے دن پیدا ہوئے۔ والد صاحب علاوہ عالم ہونے کے تحصیلداری کے عہدے پر سرفراز رہے۔ مولانا پانچ سال کے تھے کہ آپ کی والدہ اور دس سال کی عمر میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ



عند سے ملتا ہے بڑے بڑے کے محمود صاحب کے نام پر اپنی کنیت ابو محمود رکھی۔  
تعلیم

گیارہ سال کی عمر میں آپ نے قرآن کریم حفظ کیا۔ بعد ازاں فارسی اور پھر مولانا عبدالرحیم صاحب سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں اور مولانا قلندر علی جلال آبادی سے بھی تعلیم حاصل کی۔ مولانا پندرہ سال کے تھے کہ دہلی میں شاہ محمد اسحق صاحب محدث دہلوی سے حدیث پڑھی۔ انیس سال کی عمر میں تمام علوم و فنون مثلاً علم حدیث، فقہ، تفسیر، اصول، فرائض، کلام، منطق، ریاضی اور فلسفہ سے فراغت کی سند حاصل کی۔

### قیام وطن یعنی تھانہ بھون اور گھر کی مالی حالت

حصولِ تعلیم کے بعد آپ نے اپنے وطن تھانہ بھون میں قیام کیا اور اہل وطن کو وعظ و تعلیم درس و تدریس سے فیض پہنچایا۔ آپ کا دولت خانہ پیر والی مسجد کے متصل تھا۔ گھر کے بہت بڑے زمیندار تھے اور کئی گاؤں کے مالک تھے۔ آپ کو باہر معقول ملازمتیں ملتی تھیں لیکن آپ نے ”کون جائے شیخ یہ تھانے کی گلیاں چھوڑ کر“ پر عمل کیا۔ اور باہر جانے سے گریز کیا۔

### منزل فقر و سلوک

پہلے زمانے کے علماء ظاہری علم کے ساتھ روحانی علوم اور تصرف کو ضروری خیال کرتے تھے، چنانچہ آپ نے پہلے حافظ محمد ضامن صاحب شہید سے جو کہ آپ کے رشتے کے ماموں بھی ہوتے تھے روحانی فیض حاصل کیا اور بعد ازاں میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی (جھنجھانہ ضلع مظفر نگر میں ایک مقام ہے لوہارو) سے بیعت کی اور پھر خود بہت بڑے روحانیت کے مالک اور ان کے خلفاء میں سے ایک خاص خلیفہ بن گئے۔ ۱۲۵۹ھ میں میانجی صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔

## حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت

جس زمانے میں حضرت مولانا سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تھانہ بھون اور اس کے اطراف و جوانب کا تبلیغی دورہ ۱۲۳۴ھ میں فرمایا آپ تھانہ بھون پہنچے تو مولانا محمد صاحب بچے تھے۔ آپ کے بزرگوں نے مولانا کو ازراہ برکت بیعت کرادیا ہوگا اس لئے مولانا اپنے رسالے ”الہامات الموجود“ میں لکھتے ہیں:

”فقیر یاد دارد کہ عمر ہفت سال باشد کہ در مسجد پیر محمد والی واقع وطن فقیر قصبہ

تھانہ بھون ضلع سہارنپور بشف بیعت جناب سید صاحب قبلہ مدوح قدس سرہ

مشرف شد۔ اگرچہ درایام طفلی بود، اما پر تو بزرگان کافی است“

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب ۱۲۳۷ھ میں یہاں تشریف لائے ہوں گے جبھی تو مولانا کی عمر سات سال کی ہو سکتی ہے ورنہ اگر سید صاحب کا تبلیغی دورہ ۱۲۳۲ھ کا مانا جائے جیسا کہ مولانا ابوالحسن ندوی نے سیرت سید شہید میں لکھا ہے تو پھر مولانا کی عمر چار سال بنتی ہے۔ اور مولانا بڑے وثوق سے اپنی عمر اس وقت سات سال بتاتے ہیں۔

## سفر حج ۱۲۶۳ھ

۱۲۶۲ھ میں ٹونک کے نواب وزیر الدولہ کی خواہش پر احادیث تہذیب اخلاق کا کام ٹونک میں رہ کر انجام دیا اور بعد ازاں کچھ پایادہ اور کچھ جہاز کے ذریعہ سفر کر کے ۱۲۶۳ھ میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مکہ معظمہ میں حضرت شاہ محمد اہلق صاحب متوفی ۱۲۶۲ھ کے چھوٹے بھائی شاہ محمد یعقوب صاحب مہاجر سے سند علوم اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔

## حج سے واپسی ۱۲۶۴ھ

حج کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور پھر ۱۲۶۴ھ میں حدیدہ وعدن کے راستے بمبئی پہنچے۔ اثنائے راہ میں امام ابوالحسن شاذلی یمنی کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت



حاصل ہوئی۔ واپسی پر آپ نے تھانہ بھون کی پیر والی مسجد میں ہی رہنا اختیار فرمایا، ہزاروں آدمیوں نے بیعت کی اور سینکڑوں نے علم حاصل کیا۔ پیر والی مسجد کا منظر ہم حافظ شہید صاحب کے بیان میں حکیم محمد عمر صاحب چرتھا دلی اور حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری کے الفاظ میں پیش کر چکے ہیں۔ لہذا یہاں اُس کے بیان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

### نکاح اور اولاد

سب سے پہلے قاضی محبوب علی خاں کی بھانجی سے نسبت قرار پائی لیکن وہ چچک میں نابینا ہو گئیں، یہ نسبت ختم ہو گئی۔ بعد ازاں ۱۲۵۳ھ میں غالباً دہلی کی ایک عورت سے شادی ہوئی لیکن ان سے کوئی بچہ نہ ہوا۔ پھر آپ نے مولوی محمد زمان کی بیوہ دختر سے ۱۲۷۲ھ میں نکاح کیا ان سے مولانا محمود اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔ ۱۲۷۷ھ میں مرحومہ دنیا سے رخصت ہوئیں، تو بعد ازاں قاضی عنایت علی خاں تھانوی کی حقیقی ہمشیرہ سے جو بیوہ تھیں نکاح کیا جن سے میاں محمد عمر اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر اس بیوہ بیوی کی سفارش پر چچک سے نابینا ابتدائی مخطوبہ سے شادی کی جن سے حافظ محمد صدیق پیدا ہوئے جو میاں محمد عمر سے صرف ۲۲ روز چھوٹے تھے۔ والدہ محمد عمر کے انتقال کے بعد پھر میرٹھ کی ایک بیوہ سے نکاح کیا لیکن وہ بھی کچھ عرصے کے بعد ماہی ملک عدم ہوئیں۔ پھر ایک اور نکاح کسی بیوہ سے کیا لیکن وہ غیر معمولی طور پر پھوڑ تھیں اس لئے ان کا حق مہر ادا کر کے ان کو طلاق دے دی۔ ان کے علاوہ ایک اور بھی خاتون سے شادی ہوئی تھی۔

### میرٹھ اور ٹونک کا قیام ۱۲۷۴ھ سے ۱۲۸۰ھ تک

۱۲۷۴ھ سے ۱۲۷۷ھ تک آپ میرٹھ میں مسجد خیر المساجد واقع خیر نگر میں مقیم رہے جہاں بہت سے لوگوں نے بیعت کی اور ذکر و فکر اور درس و تدریس کا وہاں شغل جاری رکھ۔ ۱۲۷۸ھ میں نواب وزیر الدولہ مرحوم کے صاحبزادے نواب محمد علی خان کی خواہش پر ٹونک تشریف لے گئے جہاں نواب صاحب نے آپ سے حدیث پڑھی۔ آپ کا قیام ٹونک میں

۱۲۸۰ھ تک رہا۔

## معرکہ جہاد ۱۲۵ھ

جہاد ۱۲۵ھ میں آپ کو اپنے رفقاء حاجی صاحب، حافظ صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے اختلاف تھا۔ لیکن یہ اختلاف ایسا نہ تھا جس سے آپس میں کوئی مخاصمانہ رنگ پیدا ہوتا، نہ آپ نے مجاہدین کی مخالفت کی اور نہ مجاہدین نے آپ کے اختلاف سے نفرت کا اظہار کیا، بلکہ یہ ایک اجتہادی اختلاف تھا جس میں انہوں نے اپنے لئے دوسری راہ اختیار کی اور بس۔

## زمین کی نیلامی

۱۲۵ھ میں آپ کی جائیداد گورنمنٹ برطانیہ نے بغاوت کے جھوٹے الزام میں ضبط کر کے نیلام پر چڑھا دی۔ نواب محمد علی رئیس نوٹک نے جو مولانا کے شاگرد تھے پینتیس ہزار روپیہ پیش کیا کہ آپ اپنی جائیداد نیلام میں خرید لیں، چنانچہ مولانا نے انیس ہزار میں نیلام خرید لیا اور رسید بھی لے لی۔ مگر ضلع مظفر نگر کے کلکٹر نے بددیانتی سے اگلے ہی روز کچھ زیادہ روپیہ کے اضافے سے یہ جائیداد بلدیو سہائے بیوہری کو دے دی، جس پر مولانا نے مقدمہ دائر کیا اور آخر کار مولانا جیت گئے۔ اس سلسلے میں مولانا کے معتقدین نے میرٹھ کے ایک مہاجن سے روپیہ سود پر قرض لے کر خود ہی مقدمہ لڑا تھا۔ مولانا کو جب سود پر روپیہ لینے کا علم ہوا تو آپ کو بہت افسوس ہوا۔ ادھر بیوہری پر جو ڈگری معہ سود ہوئی تو مولانا نے سود واپس کر دیا۔ اس سلسلے میں آپ نے نواب محمود علی خاں چھتاری سے منشی محراب علی کی معرفت ۱۲۸۸ھ میں ۱۶ ہزار روپیہ قرضہ لیا بہر حال یہ سب کچھ ادا ہو گیا۔ مگر اس جائیداد کے باعث مولانا دنیاداری کے چکر میں پھنسے رہے۔ جو ان کی افتاد طبع کے خلاف تھا۔

## اخلاق و عادات

آپ کے اخلاق و عادات کے متعلق حکیم محمد عمر صاحب چرٹھالی آپ کے مرید اپنی

کتاب ”حالاتِ محمدیہ“ میں لکھتے ہیں:

”آپ ہمیشہ پاک و صاف، نفیس و شفاف کپڑے پہنا کرتے تھے۔ لطیف و قلیل کھانا کھاتے۔ دوسرے تیسرے روز جاڑوں میں اور گرمیوں میں اکثر روزانہ نہاتے۔ باوجود موجود ہونے عظمت ہر قسم کی کبھی خود ستائی کی گفتگو نہ کرتے اور کسی حالت میں کسی فرد بشر کی جرمِ مبینی اور نکتہ چینی کی جستجو نہ کرتے کبھی کسی کو برا نہ کہتے۔ کسی وقت بے وضو نہ رہتے۔ آٹھ پہر میں کل چار گھنٹے آرام فرماتے۔ ہر امر میں اتباعِ سنت اسلام فرماتے۔ بعضا ساکلی بڑا کندہ تاثیر ہوتا کہ ایک چھوٹے سے مسئلے کے دریافت کرنے کے واسطے دو دو گھنٹے صبح خراش ہوتا مگر آپ جواب میں ذرا بھی سختی کو کام میں نہ لاتے، نہایت نرمی سے مکرر نہ کر سمجھاتے۔ ہر طرح اطمینان فرماتے، کبھی کسی سے ترش رویا خانہ نہ ہوتے۔ دوست ہو تا یا دشمن تخمِ کدورت سینہ صفا گنجینہ میں نہ ہوتے۔ بلا ضرورت شرعی کہیں نہ جاتے۔ ہر وقت اپنے قیام کی جگہ بیٹھا رہنا پسند فرماتے۔ اور مسکن و مجلس، روشِ اربابِ داد و دہش راتِ دن کھلا رہتا۔ سفر میں باوصف موجود ہونے سواری کے کوسوں پیدل چلتے۔

### قوتِ حافظہ اور علمی مقام

صورتِ آپ کی بہت حسین تھی۔ حافظہ آپ کا بہت اچھا تھا۔ جو کتاب ایک دفعہ دیکھ لی آخر تک از بر تھی۔ تفسیریں سب یاد تھیں۔ اصولِ فقہ تمام منضبط صحاح ستہ بر زبان تھا.....“

### خلفاء، مریدین اور شاگرد

یوں تو آپ کے سینکڑوں شاگرد اور ہزاروں مرید تھے لیکن خصوصیت سے خلفاء میں قاضی محمد اسماعیل صاحب منگھوری، حکیم محمد عمر چہ تھا ولی تھے اور شاگردوں میں نواب محمد علی

خال والی ٹونک، دیوان شمس الدین نائب ریاست ٹونک، قاضی شیخ محمد محدث مچھلی شہری (قاضی بھوپال) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ اپنے زمانے کے زبردست صاحب نسبت بزرگ اور بلند مرتبہ محدث تھے۔

## تصنیفات

آپ نے تصنیفات کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ چھوڑا ہے جو حسب ذیل ہے:

- (۱) دلائل الافکار فی اثبات الجبر والاسرار۔ (۲) مناظرہ محمدیہ فی بحث بعض عقائد دینیہ مصنفہ ۱۲۶۴ھ (جواب مولانا عبدالحق خیر آبادی کہ انہوں نے امام رازی کے بعض اقوال کی تردید میں رسالہ لکھا تھا) (۳) مکاتیب محمدیہ فی جواب اعتراض مولوی بشیر الدین قنوجی۔
- (۴) ارشاد محمدی فی الاشغال والاعمال ۱۲۷۷ھ بقیام میرٹھ۔ (۵) انوار محمدی فی المراقبات والمشاہدات مطبوعہ مطبع ضیائی میرٹھ (۶) رسالہ صلوة۔ (۷) الہامات محمدیہ جس کا پورا نام الہامات الموجود فی تحقیق وحدۃ الوجود والمشہود ہے۔ (۸) قطاس فی موازاتہ اثر ابن عباسؓ یہ کتاب مولانا عبدالحق فرنگی کی کتاب دافع الوسواس کے جواب میں تحریر فرمائی ہے۔
- (۹) بیاض محمدی حصہ اول مجرب اعمال و نقوش میں ہے مسلم پریس دہلی میں چھپی (۱۰) بیاض محمدی حصہ دوم۔ (۱۱) شرح نسائی (۱۲) رسالہ گل دلالہ (تصوف میں میانجی نور محمد صاحب کی زندگی میں لکھا گیا) (۱۳) فتاویٰ محمدی۔ (۱۴) سماع موتی مصنفہ آخر ماہ صفر ۱۲۹۶ھ آخری تصنیف ہے جو بوجہ کمزوری حکیم محمد عمر چر تھادلی کو بول کر لکھائی۔ اور مولانا رحم الہی منگھوری کو جو اس روز اتفاق سے آگئے تھے سنائی۔ یہ رسالہ دراصل سماع موتی کے ایک استفتاء کا جواب ہے۔ (۱۵) مثنوی دفتر ہفتم۔ حکیم محمد عمر صاحب نے مولانا کی بتیں کتابوں کا حوالہ دیا ہے جو انہوں نے تصنیف کیں لیکن بقیہ کا نام نہیں لکھا۔ قاضی محمد اسماعیل صاحب منگھوری نے اپنے رسالے تنبیہ کے حاشے میں ایک اور کتاب کا حوالہ دیا ہے جس کا نام (۱۶) فیضان

محمدی تھا ان کتابوں میں سے اکثر طبع ہو گئی تھیں۔ لیکن رسالہ گلِ ولالہ افتادی محمدی اور بعض نامعلوم کتابیں طبع نہیں ہوئی تھیں۔ البتہ بقیہ مذکورہ کتابیں چھپ چکی تھیں۔

### کتب خانہ

آپ کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جو ورثہ میں منتقل ہوا۔ مولانا کے بڑے صاحبزادے کے چار لڑکے تھے۔ میاں مسعود احمد، میاں محمد احمد، میاں محمد اعلیٰ، حافظ محمد افضل۔ پہلے دونوں صاحبزادے پاکستان میں ہیں۔ آخری دونوں کا انتقال ہو گیا۔ موخر الذکر حافظ محمد افضل کے دولڑکے میاں اسلم اور میاں اکمل مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتہائی دہلی کے نواسے ہوتے ہیں۔ اکمل صاحب کا تو انتقال ہو گیا البتہ اسلم صاحب زندہ ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں یہ کتب خانہ اسلم صاحب کے پاس تھا لیکن جب وہ پاکستان چلے آئے تو ان کے آتے ہی شرنا تھقی قابض ہو گئے اور انہوں نے تمام کتب خانہ ردی میں کسی دوسری جگہ جا کر فروخت کر دیا۔ اسلم صاحب کے مکان کے برابر میں جامعہ اشرفیہ کے مدرس رہتے تھے باقی کتابیں انہوں نے خرید لیں۔ اس طرح یہ نادر کتب خانہ ختم ہو گیا۔ باقی رہے نام اللہ کا۔ (بیان مولانا سید حامد حسین امروہی خلیفہ مجاز مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔ جواب خط مولانا نسیم احمد فریدی رسالہ تذکرہ دیوبند اپریل ۱۹۶۲ء ص ۲۳)

### وفات ۷ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ

رجب ۱۲۹۵ھ میں آپ کو تپ و لرزہ آنے لگا تھا جس سے بہت کمزور ہو گئے تھے مگر پھر حکیم محمد عمر کے علاج سے افاقہ ہوا۔ اس سال کے رمضان میں قرآن کریم سنایا۔ رمضان ہی میں حکیم محمد عمر صاحب اور قاضی محمد اسماعیل صاحب منگھوری سے فرمایا کہ آئندہ رمضان آتے دکھائی نہیں دیتے، کیوں کہ نقابت جاری تھی، مگر اس کے باوجود تلاوت قرآن کریم، اوراد و وظائف، تہجد، اشراق اور دیگر عبادات و وظائف میں فرق نہیں آیا، تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رہا اور درس و تدریس کا بھی، اس عالم میں جندِ جدِ نبوی شریف کا حاشیہ لکھا۔

اسی اثنا میں دوسری مرتبہ چھتاری تشریف لے گئے۔ ضعف تو تھا ہی اور ضعف ہو گیا۔ رات کو بخار ہو گیا۔ وعظ بھی کہنا پڑا اور علاج بھی نہیں کیا۔ وہاں سے لوٹے تو میرٹھ اترے اور طبیعت خراب ہو گئی۔ دوا پی تو قدرے افاقہ ہوا۔ شام کو بخار بڑھ گیا اور ذات الجنب ہو گیا۔ سانس اور کھانسی کی زیادتی ہو گئی۔ تین چار دن میرٹھ میں علاج کیا۔ حکیم عبدالغفور سکندر آبادی آگئے تو ان کا علاج کیا۔ بعد ازاں تھانہ بھون پنچے۔ شب وفات سے پہلے دن پیر کو افاقہ محسوس ہوا۔ یہ سنبھالا تھا۔ صاحبزادہ محمد محمود جو ٹونک میں ناظر تھے وہ بھی آگئے۔ فرمایا بس تو آج تک کا ہی قصہ تھا۔ فقیر کی چار پائی درست کرادو اور بغور قبلے کی جانب کر دو۔ دیکھو میرے سامنے سے کوئی نہ گذرے۔ کوئی شخص جو خلاف ملت حضرت شفیع محشر ہونہ آئے۔ اور تم اور محمود کھانا کھا لو۔ بارہ بجے تک سب مہمانوں نے کھانا کھالیا۔ کمزوری بہت تھی لیکن پاس انفاس جاری تھا۔ فرمایا مجھے ذکر چھوڑنے کی قدرت نہیں۔ جب دن زیادہ چڑھا تو تنفس بڑھ گیا۔ آپ نے کچھ آہستہ آہستہ پڑھا۔ دن کے ایک بجے سلطان الاذکار میں مشغول ہو گئے۔ ہر سانس میں صاف اللہ نکلنے لگا۔ لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ ہر طرف سے اللہ کی آواز آرہی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی آخر جب تک نصف رات گذری تو مغرب کی طرف سے آندھی اٹھی۔ بادل چھا گیا۔ اور آپ آدھی رات کے وقت بارہ بجے دنیا سے رخصت ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ایصالِ ثواب ہوا۔ ۱۲۹۶ھ کو منگل کے دن دس بجے کے قریب عید گاہ کے قریب نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اور الغرض دوپہر سے پہلے یہ نیر شریعت و طریقت زیر زمین دفن ہوا۔ حکیم محمد عمر صاحب نے حسب ذیل تاریخ نکالی۔

اے فکرِ رحلت مغفور ہے گر

کر شمارِ عددِ شیخِ محمدِ مرحوم

۱۲۹۶ھ

الحاصل

یہ ہیں مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کے وہ ضروری حالات جو مولانا رومؒ کی مثنوی



حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حواشی مثنوی، مفتی الہی بخش صاحب کاندھلوی کے دفتر ششم کی تکمیل کے ضمن میں پیش کرنے ضروری تھے جن کا سلسلہ ان کے دفتر ہفتم سے ملتا ہے۔

جیسا کہ مولانا شیخ محمد صاحب کی تصنیفات کے ضمن میں ان کی ایک کتاب ”مثنوی دفتر ہفتم“ کا نام آیا ہے اس مثنوی کے نام کے ساتھ ہفتم کا لفظ خود بتاتا ہے کہ مولانا نے چھٹے دفتر اور مفتی صاحب کے تھے کے علاوہ ساتویں دفتر کی بھی ضرورت محسوس کی۔

### مولانا محمد کی مثنوی پر ایک سرسری نظر

مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ کی یہ مثنوی آپ کی وفات کے بعد حکیم محمد عمر صاحب چرتھاوی کی تصحیح و ترتیب کے بعد ۱۳۰۷ھ میں بنام ”دفتر ہفتم“ مولانا روم میرٹھ کے محبوب المطالع میں چھپی۔ اس مثنوی کو دوسرا تاریخی نام مثنوی ”شورش عشق“ دیا گیا ہے جس کے عدد ۱۲۷۶ نکلتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مثنوی ۱۲۷۶ھ میں لکھی گئی۔ ٹائٹل کی عبارت یہ ہے۔

”مثنوی شورش عشق الموسوم دفتر ہفتم مولانا روم مصنفہ حضرت ابوالحمود مولانا شیخ محمد

تھانوی تصحیح و ترتیب حکیم محمد عمر چرتھاوی بحبوب المطالع واقع میرٹھ طبع گردید۔“

یہ مثنوی ۲۰/۸ × ۲۶ سائز پر ۲۱۹ صفحات تک پھیلی ہوئی ہے اور جو تین ہزار بائیس (۳۰۲۲) اشعار اور ایک سو چوراسی (۱۸۴) عنوانات پر شامل ہے۔ اول میں دو صفحات کا مقدمہ اور آخر میں دو صفحات کا خاتمہ نیز جا بجا مثنوی پر حکیم محمد عمر چرتھاوی کے حواشی ہیں۔ مقدمے میں حکیم محمد عمر صاحب مثنوی کی وجہ تصنیف لکھتے ہیں:

ایں مثنوی کہ حضرت جامع معقول و منقول بقیۃ الحمد ثین سلطان الدرفین

ابوالحمود مرشدنا مولانا شیخ محمد تھانوی ہنگام ذوق و شوق مطالعہ مثنوی معنوی بنام

نہاد دفتر ہفتم مثنوی مسودہ نمودہ۔ بوجہ نامدن نوبت نظر ثانی شائع نفرمودہ بودند

وباعث تصنیفش ایمائے مکرر حضرت جلال الدین رومی وضیائے مستقر حضرت شمس الدین تبریزی بود بر ذیائے معتبر و موجب نہ نمودن نظر ثانیث دیدن اجزائے مسودہ را بعالم خواب در دست مبارک جناب رسالتآب (صلی اللہ علیہ وسلم) و مس فرمودن ہر شعر اورا باگشت شق القمر کہ در بادی النظر خبر از مقبولیتش بحیثیت موجودہ می داد۔ اگر چہ رازے بود مستتر کہ بالآخر بوقت معبود باجہتہاد یکہ شایانش بود در کشاد (دیباچہ مثنوی ص: ۲)

ترجمہ: یہ مثنوی جو کہ جامع معقول و منقول بتیہ المحدثین سلطان العارفین ابوالمحود مرشدنا و مولانا حضرت شیخ محمد تھانوی نے مولانا روم کی مثنوی کے ذوق و شوق سے مطالعہ کرتے وقت ”دفتر ہفتم مثنوی“ کے نام سے لکھی تھی نظر ثانی کی نوبت نہ آنے کے باعث (مولانا محمد صاحب) نے شائع نہیں کی تھی۔ اس کی تصنیف کا سبب مولانا جلال الدین رومی کا بار بار سچے خوابوں میں اشارہ کرنا اور حضرت شمس تبریز (مرشد رومی) کی قلبی نورانیت کا خواب میں پرتو لگن ہونا ہے، اور مولانا محمد صاحب کے نظر ثانی نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے خواب میں مسودے کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں اور مثنوی کے ہر شعر کو شق القمر کی انگلی سے چھوتے دیکھا تھا کہ یہ خواب بحیثیت موجودہ ظاہری نظر میں مثنوی کی مقبولیت کا پتہ دیتا تھا۔ اگرچہ تصنیف مثنوی کا یہ راز کسی کو معلوم نہ تھا لیکن آخر کا ایک مقررہ وقت پر اس اجتہاد کی بنا پر کہ جو اس کے لئے شایاں تھ کھول دیا۔

مولانا شیخ محمد صاحب کی یہ مثنوی انتقال کے بعد ان کے خلیفہ حضرت قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوری کے پاس تھی جو مولانا کے خلیفہ اور زبردست روحانی مرشد تھے۔ آپ کا فیض راقم الحروف کے قصبے یعنی شیرکوٹ کو بھی بہت پہنچا اور میرے دادا شیخ محمد حسن صاحب

مرحوم اور میرے نانا شیخ غلام مرتضیٰ صاحب مرحوم اور ان کے علاوہ شیرکوٹ کے سینکڑوں حضرات ان کے مرید تھے۔ بہر حال قاضی صاحب سے یہ مثنوی نظر ثانی اور ترتیب کے لئے حکیم محمد عمر کے ہاتھوں میں پہنچی جیسا کہ وہ مقدمے میں لکھتے ہیں:

وبعد انتقال مصنف مسودہ مذکور رازید قاضی محمد اسماعیل منگلوری بایں احقر محمد عمر  
بمراد تکمیل جلی در رسید

ترجمہ: مصنف کے انتقال کے بعد مذکورہ مسودہ قاضی محمد اسماعیل صاحب  
منگلوری سے موٹی موٹی باتوں کی تکمیل کے لئے احقر محمد عمر (چرتھالی) کو ملا۔

ایک سال تک حکیم صاحب نے اس کی ترتیب و تصحیح کا کچھ کام نہ کیا۔ ناگاہ خواب میں  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ”لبانم را بلعل لبہائے مبارک خود بوسہ دادند“ اسکے بعد  
سے کام شروع کیا۔ محمد عمر صاحب لکھتے ہیں:

ازاں روز فیروز در شب و روز و قتیکہ یا فتم بہ نصیحہ حش پر داختم درستی کہ مقدر  
بود تکمیل کہ شدنی بکمال افضال الہی در ساختم۔ تا بہرہ جہت مرتب و مکمل شد۔“  
(مقدمہ: ص ۳)

توجہ: خواب کے دن سے رات دن جو وقت بھی ملا اس کی تصحیح میں مشغول  
رہا۔ جو درستی مقدر میں تھی اور جو تکمیل کہ ہونے والی تھی اللہ تعالیٰ کی بیحد  
مہربانیوں سے میں نے کی۔ تا آنکہ ہر حیثیت سے مرتب اور مکمل ہو گئی۔

### افتتاحِ مثنوی

مولانا شیخ محمد صاحبؒ نے مثنوی کو حسب ذیل اشعار سے شروع کر کے واقعی اپنی اس  
مثنوی کو مولانا روم کی مثنوی کا ساتواں دفتر بنا دیا ہے اور اسی طرز میں شروع کیا ہے جس طرز  
میں مولانا روم نے اپنے ہر شش دفتر کو اپنے خاص خلیفہ و مرید حسام الدین چلی کو مخاطب  
کر کے کیا ہے، کیوں کہ مولانا روم سے مثنوی لکھانے کے باعث اور محرک مولانا حسام

الدین چلی ہی تھے۔ بہر حال مولانا شیخ محمد اس طرح مثنوی کا آغاز کرتے ہیں۔

اے محمد دیر شد جذبِ حسام	ہچو مصمام تو ہست اندر نیام
خوش بیاواز میانش کش چونور	تا شود تاریکی احوال دُور
یا الہی بخش الہی بخش را	کز جلالت بود ذکرے در ورا
دفتر سادس مکمل کرد و رفت	عقدہ کان بود ہم حل کرد و رفت
لیکن چوں ہر دفتر است از مثنوی	کعبہ دل را طواف معنوی
پس ز ایمائے جلال پاک دیں	وز ضیائے آں خور بُرج یقین
بہر شوط سابعہ جاں چست شد	چستیم در کار دُنیا ست شد
خواہد از آں خالق انوار شمس	گیر دازد زہ بـغـبر ا کار شمس
ایں شرہا چوں بجانم ریختند	شعلہ با در سینہ بر انگشتند
اندریں بودم کہ تیغ آں حسام	مثل برق آمد بروں زابر نیام

ان اشعار میں مولانا شیخ محمد اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئے مولانا حسام الدین چلی کی کشش اور جذب کا ذکر کر رہے ہیں۔ چونکہ مولانا رومی کی مثنوی کا مطالعہ کرتے تھے اس لئے ایک رات خواب میں شمس تبریز اور مولانا جلال رومی کو دیکھا کہ دونوں تشریف رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تم بھی کوئی ایک مثنوی لکھو، جیسا کہ محمد عمر پہلے شعر کے حاشیہ نمبر ایک میں لکھتے ہیں کہ مولانا شیخ محمد صاحب شاعری کا ذوق بالکل نہیں رکھتے تھے اس لئے مثنوی لکھنے کا خیال بھی نہیں کیا۔ پھر تقریباً بائیس تیس مرتبہ ان بزرگوں کو خواب میں دیکھا جن میں حسام الدین چلی بھی تھے، چنانچہ مولانا محمد صاحب نے مثنوی لکھنی شروع کی۔ آپ نے پہلے شعر میں جذبِ حسام الدین کے ماند ہو جانے اور اس کو بیدار کرنے کا ذکر کیا ہے۔ پھر مفتی الہی بخش صاحب کے دفتر سادس کے مکمل کرنے کا ذکر ہے۔ بعد ازاں اپنے ساتویں دفتر لکھنے کی وجہ بیان کی ہے کہ چونکہ مثنوی کے چھ دفتر عاشقانِ خدا کے دل کے لئے کعبہ

معنوی ہیں اور خانہ کعبہ کے سات طواف ہوتے ہیں جن کے بغیر طواف مکمل نہیں ہوتا، اس لئے ساتویں دفتر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مولانا محمد میں خود مثنوی کا یہ دفتر لکھنے کا جذبہ نہ تھا لیکن جیسا کہ انہوں نے دسویں شعر میں کہا ہے کہ غیبی قوتوں اور منشیان قضا قدر نے میری روح میں دفتر ہفتم کے معانی بھر دیئے اور میرے سینے میں جذب و شوق کے شعلے روشن کر دیئے اور مزید برآں خود حسام الدین چلبی کی تیغ برق کی مانند نیام کے بادل سے نلگی جس کی چمک نے مجھے مثنوی لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اور یوں تو ساتویں دفتر کا لکھا جانا مولانا روم کے خیال میں بھی تھا جیسا کہ ان کے فرزند نے ان کو یاد دلایا تھا۔

ہمارا مقصد مثنوی پر تبصرہ کرنا نہیں یہ تو مستقل مضمون چاہتا ہے، بلکہ ایک تسلی بخش تعارف ہے۔ بہر حال مولانا محمد نے مذکورہ بالا اشعار سے مثنوی کا آغاز کیا اور بعد ازاں مولانا روم کے طرز میں کہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم، کہیں حضرت ابوبکر، پھر حضرت عمر، بعد ازاں حضرت عثمان و علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عنوانات کے ماتحت ان کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ کہیں ”خوبی صحبت شیخ“ کا عنوان ہے اور کہیں ”کیفیات امراض روحانی و علاج آں“ کی سرخی، کہیں ”در فوائد ادب و انکساری“ پر اشعار میں مضمون لکھے ہیں اور کہیں ”شب بیداری اختیار کردن حضرت امام اعظم“ پر اشعار ہیں۔ کہیں ”در مذمت بے حیائی و حرص“ پر خیال آرائی کی ہے اور کہیں ”در مذمت دنیا و بے شرمی“ غرض اسی طرح تمام مثنوی نہایت پر شکوہ، برجستہ، چست الفاظ میں عمدہ پیرائے کے ساتھ تحریر فرمائی ہے کہ کہیں بھی بندش میں جھول نظر نہیں آتا۔ ہم مختلف جگہ سے نمونے کے طور پر چند اشعار لکھ کر مولانا شیخ محمد محدث تھانوی کا ذکر جمیل ختم کرتے ہیں اور ان کی روح کو خوش کر کے سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا عشق کے متعلق لکھتے ہیں۔

چیت عشق اے عاشق شوریدہ کیش      داربند مر ترا از غیر دغولیش

عشق آں کام و زباں را سوختہ      عشق آں باب دہاں را سوختہ

عشقِ آں خواب و خورش کم می کند      دیده بُ تم سینہ بُ خم می کند  
کیس حدیث قدسی از مصطفیٰ است      منزل حق در ضمیر باصفا است  
معجزہ مصطفیٰ ﷺ در جنگِ اُحد

بر سر کفار زو چوں مشت خاک      شد قبای حال ایثاں چاک چاک  
ری آں ہم او بخود منسوب کرد      تا نماند بر رخ کار تو گرد  
فعل نائب هست بل فعلِ مینب      از حبیب آید چه بے اذن حبیب  
از دل و جاں ہر کہ محو یار شد      صورت آہن فتا در نار شد  
کرد قوے جبر زینجا اختیار      گشت قوے مالک و مختار کار  
رمز اللہ معی را اے جواں      شاہد تفسیر ایں معنی بداں

### سبب مقبول نشدن ایمان فرعون بوقتِ غرق

دانکہ در ایمان فرعون پلید      رد و نا معقولیت آمد پدید  
باشش تنہا نہ وقتِ باس بود      نے ہر اس غرق و مرگ یاس بود  
بلکہ چوں آمنت باللہ صرف گفت      شد بعبودش کہ شیطان بود جفت  
گفتے آمنت بر پے موسیٰ ار      یافتے از آتش دوزخ مفر

### پند

اصل دُنیا ئے دنی چوں در جہاں      زن، زمین و زور سہ چیز انداے جواں  
تا توانی چشمِ دل بر شاں منہ      خار آہن در رہ ایماں منہ  
چوں نمی پائے طلب در راہِ حق      گیر باخود ہمت آگاہ حق

ذکرِ پیر و مرشد نور محمد صاحب جہنمجانوی حافظ محمد ضامن و حاجی امداد اللہ صاحبان

چوں بغیر او دی ناسودہ ایم      نور از نور محمد بودہ ایم

نیک می نہد چونازم از طرب      مرشد کامل عنایت کرد رب  
 اے جواں بخت ارتو داری فکر بیر      دامن نور محمد خوش بگیر  
 گر نہ از قسمت رسد دست باد      در حضور نایبانش آر رد  
 یعنی الفت گیر باضامن علی      تا شوی روشن ز انوار جلی  
 در میسر ناید از صہبائے وے      خیزد گیر از جام امداد اللہ مے

### پھر حاجی امداد اللہ صاحب کی تصنیفات کی طرف

یہ چند اشعار تبرک اور نمونے کے طور پر ہم نے پیش کئے ہیں تاکہ آپ مولانا محمد صاحب کی مثنوی کا معنوی اور ادبی جائزہ لے سکیں۔ اب ہم پھر حاجی امداد اللہ صاحب کے ذکر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہم ان کی تصنیفات کے سلسلے میں ان کے مثنوی مولانا روم کے حواشی کا آپ سے تعارف کر رہے تھے جن پر ہم سیر حاصل تاریخی تبصرہ کر چکے ہیں اب ان کی بقیہ تصنیفات کی طرف آپ کو لئے چلتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تصنیف کا دوسرا نمبر پیش کرتے ہیں۔

### (۲) غذائے رُوح ۱۲۶۳ھ

یہ ایک مثنوی ہے جو حاجی صاحب نے ۱۲۶۳ھ میں لکھی۔ تحریر فرماتے ہیں:

سال ہجری بھی ہوا جب ختم یار      یک ہزار دو صد و شصت و چہار  
 جب ہوئی یہ مثنوی یارو تمام      رکھ دیا اس کا غذائے رُوح نام

ان دونوں شعروں سے مثنوی کا ہونا، غذائے رُوح نام رکھنا اور ۱۲۶۳ھ میں تحریر کرنا صاف ظاہر ہوتا ہے۔ حاجی صاحب نے تحقیق کرنے والے کے لئے یہ کام نہایت ہی خوش کن کیا ہے کہ اپنی ہر تصنیف کا سن، نثر کی کتاب کا نثر میں اور نظم کی کتاب کا نظم میں ضبط کر دیا ہے۔ اس مثنوی میں جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے رُوح کی غذا فراہم کی گئی ہے۔ اس میں عجیب و غریب قصوں اور حکایات کے پیرائے میں شیطان کے دوسوے، نفس کے مغالطے

اور جہالت کے نتیجے بیان کئے ہیں اور عاشقانِ صادق کے ولولے اور جوش کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شروع میں حمد و نعت، خلفائے اربعہ کی مدح ہے پھر میانجی نور محمد جھنجھانویؒ کا ذکر ہے بعد ازاں پھر ایک مناجات ہے، اس کے بعد پھر اپنے پیر و مرشد کے احسانات کا ذکر کیا گیا ہے پھر ذوق و شوقِ محبتِ الہی کے اشعار ہیں، بعد ازاں کتابِ نان و حلہ از تصنیف بہاؤ الدین عالی کا ذکر کر کے اس کے مضامین سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں تاسف و ندامت و ضیاعِ عمر، گوشہ نشینی اور قطعِ علائقِ دُنیا، حکایتِ عابدِ جاہل، مذمتِ علمائے نفور از فقر و محبینِ امراء، حب الوطن من الایمان، عشق میں مصائب، ریاکاروں کی مذمت غرض کہ اسی قسم کے معرفت اور طریقت کے مضامین اس مثنوی میں بیان کئے گئے ہیں۔

### صفحات اور اشعار

یہ مثنوی چھپاسی صفحوں اور سولہ سو پچاس اشعار پر مشتمل ہے، ایک مقام پر لکھتے ہیں:

گوشِ جاں سے سُن تو بلبل سے ذرا	یار کی باتوں سے یہ کہتی ہے کیا
ہے یہ بلبل یار کے گلزار کی	پوچھ باتیں اس سے اس دلدار کی
قاصدا جلدی خبر مجھ کو سُنا	کہتا ہے حق میں مرے کیا دل رُبا
مجھ سے راضی بھی ہے وہ دلبر بتا	اور مائل بھی ہے کچھ سوئے وفا
یا ہمیشہ ہجر پر مسرور ہے	سچ بتا جو کچھ اسے منظور ہے
آفریں اے بلبل خوش خواں تجھے	ماسوا سے کر دیا فارغ مجھے

غرض کہ اسی طرح عنوانات کے ماتحت یہ تمام مثنوی منظوم ہے۔

### ۳۔ جہاد اکبر ۱۲۶۸ھ

یہ بھی حاجی صاحب کا منظوم اردو رسالہ ہے جو ۱۲۶۸ھ میں لکھا گیا ہے۔ حاجی صاحب فرماتے ہیں۔

غرض جب بوا یہ رسالہ تمام جہاد اکبر اس کا رُھا میں نے نام





یہ مضمون تھا فارسی میں لکھا کسی مردِ حق نے بصد پر ضیا  
کیا میں نے ہندی ملا کر کچھ اور کہ تا خاص اور عام سمجھیں بغور  
سن و سال ہجری خیر الانام تھے بارہ سو اڑسٹھ ہوا جب تمام  
ان اشعار سے کتاب کا نام، سن تالیف ظاہر ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حاجی  
صاحب نے کسی شخص کے فارسی قصے کو اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے اور اپنی طرف سے بھی اس  
میں مضمون کا اضافہ کیا ہے۔

### اردو کا نام ہندی

ان امور کے علاوہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت معلوم ہوئی کہ ۱۲۶۸ھ میں حاجی صاحب  
نے اب سے ایک سو نو سال پہلے اردو کو ہندی کے نام سے یاد کیا ہے۔ گویا اردو کو اس دور میں  
ہندی کہتے تھے۔ ملاحظہ ہو یہ شعر۔

کیا میں نے ہندی ملا کر کچھ اور کہ تا خاص اور عام سمجھیں بغور

### آغاز

کتاب کا آغاز عہدِ خدا سے کیا گیا ہے۔

الہی تو ہے وحدہ لا شریک بتایا ہے تو نے ہر ایک شے کو ٹھیک

بعد ازاں حسب ذیل عنوانات کے ماتحت اشعار تحریر فرماتے چلے گئے ہیں۔

۱..... حمد و نعت، مناجات، غفلت میں عمر بسر ہونا، نفس کو ڈانٹنا، نفس کا جواب، نفس سے  
عاجزی اور سلطانِ روح سے امداد، جسم میں نفس و سواں کا جاسوسی کرنا، نفس کے مقابلے میں  
روح کا وزیرِ عقل کو بھیجنا، وزیرِ عقل کا امیرِ تقویٰ کو مقابلے کے لئے بھیجنا غرض کہ نفس اور روح  
کا مقابلہ کر کے نفس پر کنٹرول کرنے کو حاجی صاحب نے جہادِ کبر کہا ہے۔ لکھتے ہیں۔

کہا نفس کو آخرش میں نے رات کہ کیا ہو گیا تجھ کو اے بد صفات

خبر حال کی اپنے تجھ کو نہیں کہ آیا تھا یاں کس لئے اے لعین

بتا تجھ سے کیا حق کو منظور تھا یہاں آ کے کیا کام تو نے کیا

### تعداد اشعار و صفات

اسی طرح تمام رسالہ منظوم ہے اور جو تیس ۲۳ صفات اور چھ سو اسی اشعار پر مشتمل ہے۔

### مثنوی تحفۃ العشاق ۱۲۸ھ

یہ رسالہ بھی تمام کا تمام منظوم ہے جس کا نام مثنوی تحفۃ العشاق ہے۔ یعنی عاشقانِ خدا کے لئے اس میں معرفت کے مضامین ہیں۔ حاجی صاحب نے اس کو ۱۲۸ھ میں تصنیف فرمایا۔ رسالے کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

بارہ سو تھے اور اسی سال ہجر ہو چکا جب حضرت تحفہ کا ذکر  
ہو چکی جب مثنوی تحفہ تمام تحفۃ العشاق رکھا اس کا نام  
ان دونوں اشعار سے رسالے کا نام اور تصنیف کا سال صاف ظاہر ہے۔

### آغازِ کتاب

اس مثنوی کو حسب دستور و عادت حاجی صاحب نے حمدِ خدا مناجات اور نعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے آغاز کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

حمد بے حد ہے سزاوار احد ہیں احد میں نحو سب محدود وحد

حمد ہے اس کو جو خود موجود ہے اور سوا اس کے جو ہے نابود ہے

حمدِ خدا، مناجات، نعتِ پیغمبر کے بعد خلفائے اربعہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کی مدح ہے۔ اس کے بعد اصل قصہ شروع کیا گیا ہے۔

حاجی صاحب نے اس مثنوی کی تصنیف کا ذکر خود آغاز کتاب میں حسب ذیل عنوان میں کیا ہے:

”در بیانِ باعثِ نظم و تصنیفِ اس مثنوی مسکن بہ تحفۃ العشاق و مدحِ عقل

جزوی۔“ (تحفہ ص: ۶)

اشعار باعث نظم کتاب کا تحریر کرنا یہاں طوالت سے خالی نہیں۔ البتہ مختصر طور پر منتخب کر کے لکھتا ہوں۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں:

ہو گیا اے دوستو یوں اتفاق	باعث تحریر نظم پر مذاق
رہتا تھا مسجد میں اپنے متصل	مجمع علماء و صلحاء اہلِ دل
ایک دن پڑھتا تھا میں فحاشِ انس	لے رہے تھے حق سے سب نجاتِ انس
جوش پر تھا بحرِ علمِ عارفان	ہو رہے تھے گوہرِ معنی عیاں
رفتہ رفتہ حضرت تحفہ کا ذکر	آگیا اس عاشقِ خستہ کا ذکر
سُن کے ان کی شان و شوکت جاؤ عشق	ہمتِ مردانہ اندر راؤ عشق
بول اٹھا ہر اک بصد ذوق و سرور	ہے یہ قصہ حمد کے لائقِ ضرور
خاص کر قطبِ زماں شاہِ وفا	آفتابِ معرفت بحرِ صفا
کامل اکمل دلی بے بدل	عاشقِ ذاتِ خدائے لم یزل
برگزیدہ دو جہان مقبول رب	مشرَبِ چشتی و فاروقی نسب
یعنی شیخِ حافظ محمد ضامن آپ	مجھ کو فرمانے لگے کر کے خطاب
نظم کر اس قصہ پُر درد کو	گرم کر اک بار ہر دلِ سرد کو
مثنویاں ہیں مجازی عشق میں	پر بہت کم ہیں حقیقی عشق میں
قصہ تحفہ اگر منظوم ہو	رحمۂ عشاق حق معلوم ہو
ریختہ میں نظم کر اس کو خام	تا کہ سمجھیں اس کو سارے خاص و عام

ان اشعار سے مثنوی کے نظم کرنے کا سبب ظاہر ہوتا ہے۔ حافظ ضامن حسن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ جن کی فرمائش پر یہ مثنوی حاجی صاحب نے تحریر فرمائی، آپ کے زمانہ کے وہی صاحبِ نسبت دلی اور بزرگ تھے جو قصبہ شاملی ضلع مظفر نگر کے جہادِ حریت ۱۸۵۷ء



میں شہید ہوئے خود حاجی صاحب اپنے ایک مکتوب میں حافظ محمد ضامن صاحب شہید کے فرزند حافظ محمد یوسف صاحب کو مکہ مکرمہ سے خط لکھتے ہیں:

مثنوی تحفۃ العشاق کہ بموجب ارشاد حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمہ اللہ  
 علیہ منقول کردہ ام ہم میرسد قبول نمایند زیرا کہ آں عزیز را بجائے موصوف  
 میدانم اترتوانند یک نسخہ نقل کنند نزد فقیر بفریستند کہ نزد مہجڑ مسودہ او نمائند  
 است۔

اسبابِ نظم کے بعد حاجی صاحب نے حضرت بی بی تحفۃ مغنیہ کا ذکر شروع کیا ہے بعد  
 ازاں تمیز عشق حقیقی و مجازی اور عشق مجازی کی مذمت کا ذکر فرما کر حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ  
 علیہ کی داستان لکھی ہے، پھر سری سقطی کی ملاقات حضرت بی بی تحفہ سے اور ان بی بی کے غلبہ  
 عشق کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں موسیٰ علیہ السلام اور چرواہے کا ذکر ہے۔ حضرت سری سقطی  
 نے بی بی تحفہ کو زنجیر و سلاسل میں بند دیکھا تو داروغہ سے پوچھا کہ اس حسینہ کو بزنجیر کیوں رکھا  
 ہے، داروغہ نے کہا یہ ہمارے آقا کی باندی ہے، اس کا علاج مقصود ہے، اس بات پر حضرت  
 بی بی تحفہ جو خدا کی سچی عاشقہ تھیں رو پڑیں۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں:

جب یہ داروغہ سے لوٹدی نے سنا      رو پڑی اک بار اور سر کو دھنا  
 دردناک اک کھینچ کر کے دل سے آہ      بولی، ہوں میں اے عزیزو بے گناہ  
 اے مسلمانو! نہیں مجنون میں      اپنے دل برکی ہوں پر مفتون میں  
 سمجھو تم موسیٰ کا چرواہا مجھے      جس کے دل سے بے خبر موسیٰ رہے

الغرض حاجی صاحب نے اس عورت کا جو اپنے موسیٰ کے عشق میں جل چکی تھی اس  
 مثنوی میں قصہ بیان کیا ہے اور جا بجا تمثیلوں سے عشق حقیقی کا نقشہ کھینچا ہے۔ بعد ازاں  
 حضرت سری سقطی کی بی بی تحفہ کے مالک سے ملاقات اور تحفہ کا بدن عشق الہی میں جلنے کا  
 ذکر کیا ہے۔ آخر کار سری سقطی نے تحفہ کو مالک سے خریدنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پاس ایک پائی



نہ تھی۔ بارگاہِ خداوندی میں سر بسجود ہو کر دعا کی کہ بارالہا میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ مجھے اتنی دولت دے کہ میں تحفہ کو خرید لوں، آخر ایک امیر احمد بن ثنی اپنے غلاموں کے ہمراہ در پر آیا اور دروازہ کھٹکھٹا کر کہنے لگا کہ مجھے ہاتفِ غیبی نے ندا دی کہ سری کے پاس سونے کی چند تھیلیاں لے کر پہنچو اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ یہ تھیلیاں لے کر سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ مالک کے پاس پہنچے اور کہا کہ تحفہ کو میرے ہاتھوں پہنچ دے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ انہوں نے چالیس ہزار درہم تک قیمت لگا دی لیکن حضرت بی بی تحفہ کے مالک نے کہا کہ اگر ساری دنیا بھی اس کے عوض میں کوئی دے تو نہ لوں گا۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں۔

میں نہیں دیتا ہوں اس تحفہ کو اب	قیمت اس کی دے سکے گا کوئی کب
قیمت تحفہ ہے بس اس سے سوا	اس سے اس کو کب کروں دل سے جدا
پھر بڑھائے اور درہم چند بار	بڑھتے بڑھتے پہنچے تا چالیس ہزار
رو کے تاجر نے کہی آخر یہ بات	خواب میں حق نے کہا مجھ کو یہ رات
یعنی ہے مقبول حق ”تحفہ“ ضرور	پاس میرے، خویش و بیگانہ سے دُور
جان سے میرے طرف مائل ہے یہ	ہے نہ دیوانی بہت عاقل ہے یہ
ہو گیا جب ظاہر اس کا مرتبا	کر سکے کون اس کی اب بیع و شرا

آخر کار حضرت بی بی تحفہ کا اثر تاجر پر ہوا اور وہ خود فقیر بن گیا اور تمام مال خدا کی راہ میں لٹا دیا اور حضرت تحفہ کو آزاد کر دیا۔ آزاد ہو کر بی بی تحفہ خلق سے کنارہ کش ہو گئیں۔ آزادی کے بعد بے تحاشا روتی تھیں اور عشقِ خداوندی میں جان کھوتی تھیں۔ دل میں آگ لگی تھی اس کا بھجنا بغیر وصل یا رناما ممکن تھا۔ حضرت سری سقطی نے فرمایا اب تم آزاد ہو چکی ہو رونے کی بجائے خوش ہونے کا مقام ہے انہوں نے جواب دیا۔ حاجی صاحب اس کی ترجمانی میں لکھتے ہیں۔

اس سے اس پر ہنستی یا روتی ہوں میں واسطے اس کے ہی جاں کھوتی ہوں میں

ماہی بے آب کو کب ہو قرار      ہو نہ جب تک بحر تک اس کا گزار  
کہہ کے یہ اور اٹھ کے بازاری دآہ      چھوڑ کر ان سب کو لی جنگل کی راہ  
شیخ اور تاجر وغیرہ بعد ازیں      باہر آئے دیکھا تحفہ کے تئیں  
ڈھونڈ اس کو گرچہ سب نے جا بجا      پر نہ تحفہ کا پتہ ان کو ملا  
جب نہ تحفہ کا پتہ ان کو ملا      کر دیا پھر عزم بیت اللہ کا

الغرض شیخ سری سقطیؒ، امیر احمد شہی جنہوں نے حضرت سری کو سونے کی تھیلیاں لا کر دی  
تھیں اور حضرت تحفہ کا سابق آقا تئیں نے مکہ معظمہ کی راہ لی۔ راستے میں امیر احمد انتقال  
کر گئے۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں۔

مر گیا ان میں سے رستے میں امیر      حسرت و درد و الم کا کھا کے تیر  
لیکن حضرت سری سقطیؒ اور تاجر دونوں بیت اللہ پہنچے۔ ایک روز جب کہ دونوں بیت  
اللہ کا طواف کر رہے تھے کہ ایک پُر درد آواز کان میں آئی کہ کوئی یہ کہہ رہا ہے۔

اے مرے معبود اے محبوب دل      اے میرے مقصود اے مطلوب دل  
ہے چراغ شب، سیہ روز و نکا تو      شادی دل ہے غم اندوزوں کا تو  
پیاں تیرے شوق کی رکھتا ہے جو      تیرے آب و صل سے کب سیر ہو  
جو کہ ہو غم سے ترے پُر اظطرار      بن ترے دیکھے اے کب ہو قرار  
سن کے اس سے شیخ، مضمون دُعا      مثل سیل اشک اس جانب چلا  
جا کے دیکھا اک طرف اک خستہ تن      سر بجدہ خاک میں ہے نعرہ زن  
سُن کے اسدؒ شیخ کی آواز پا      چونک اٹھی یک بارگی وہ پارسا

شیخ سری سقطیؒ نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ اس نے جواب دیا۔ حاجی صاحب  
لکھتے ہیں۔

تم گئے کیا بھول اے سری مجھے      میں ہوں تحفہ مول لیتے تھے جے



شیخ نے اس کو غور سے دیکھا تو تنکے کی مانند تھی کہ جسم پر گوشت کا نام نہ تھا اور ایک گڑھے میں پڑی تھی اور جسم پر اتنی خاک تھی کہ مٹی ہو گیا تھا۔ حضرت سقطی نے پھر بی بی تحفہ سے دریافت فرمایا کہ تم اب کس مقام پر ہو اور دربارِ حبیب سے تمہیں کیا ملا ہے اس پر تحفہ نے جواب دیا۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں۔

خلق سے جسم ہوتی ہوں میں نہاں جو نہاں تھا ہو گیا مجھ پر عیاں  
سری سقطی نے فرمایا کہ جس امیر احمد شہی نے تمہارے خریدنے کے لئے مجھے روپیہ دیا  
تھا وہ محبت میں راستے میں ہی مر گیا۔ تحفہ نے جواب دیا۔

یوں کہا تحفہ نے اے نیکو سرشت ہے وہ ہمایہ مرا اندر بہشت  
حق نے بخشا ہے اسے وہ مرتبا آنکھ نے دیکھا نہ کانوں نے سنا  
سری سقطی نے فرمایا اور وہ تاجر جس نے تمہیں آزاد کیا وہ تمہاری ملاقات کا حد سے  
زیادہ دلدادہ ہے۔ اس پر تحفہ نے کہا۔

سُن کے تحفہ نے دُعا اکِ دل سے کر مر گئی رکھ کر در کعبہ پر سر  
دَم میں بھر کر سانس ٹھنڈا مر گئی عشق کے سب کام پورے کر گئی  
عمر طاعت میں گزاری یار کی مرد دار آخر کو جاں بھی دار کی  
چھوڑ کر اے دل یہ رو بہ شاگئی سیکھ لے اس زن سے تو مرداگئی

حاجی صاحب نے اس آخری شعر کے دوسرے مصرع میں اپنی مثنوی کا نقطہ خیال پیش  
کر دیا ہے کہ کس طرح ایک ولیہ کاملہ کے باعث ایک تاجر اور ایک امیر خدا رسیدہ بن گئے۔

آخر کار حضرت بی بی تحفہ جب در کعبہ پر سر رکھ کر خدا سے جا ملیں اور بقولِ شاعر  
سر ہو قدموں پہ ترے اور اجل آئی ہو

اپنے حبیب کے قدموں میں جاں نثار کر دی تو تاجر وہاں پہنچ گیا اب اس پر تحفہ کو مردہ  
دیکھ کر کیا گذری، حاجی صاحب لکھتے ہیں۔



آگیا تاجر بھی ناگہ اس گھڑی دیکھا تحفہ کو کہ ہے مردہ پڑی  
 بے وی سے وہ بھی گر کر خاک پر مر گیا تحفہ کے رکھ پاؤں پہ سر  
 دیکھ کر یہ حائل بولے شیخ یوں انا اللہ وانا الیہ راجعون  
 بعد ازاں تجہیز اور تکفین کر خاک میں دونوں کو سو نپا سر بسر  
 دونوں کو دفن کرنے کے بعد شیخ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ حج کے بعد وطن کو واپس تشریف  
 لائے۔

خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک طینت پر  
 یہ ہے حضرت حاجی صاحب کی مثنوی کا خلاصہ جس مضمون پر ان کی یہ مثنوی گردش  
 کر رہی ہے۔

تعداد صفحات و اشعار  
 اس مثنوی کے بتیس صفحے ہیں اور اشعار کی کل تعداد تیرہ سو چوبیس (۱۳۲۴) ہے جس  
 میں وہ مناجات بھی شامل ہے جو اس مثنوی کے آخر میں حاجی صاحب نے لکھ کر شامل فرمائی  
 ہے۔

دردنامہ غمناک  
 یہ رسالہ مختصر سی آٹھ صفحوں کی نظم ہے جس میں شاعر نے اپنے عشقِ حقیقی اور جذبہ بے  
 خودی کی ترجمانی کی ہے۔ اس رسالے کے نام سے ہی اس کی دردمندی اور غمناکی کا پتہ  
 چلتا ہے۔ ابتدا سے آخر تک اس مثنوی میں شعلہٴ عشق بھڑکتا نظر آتا ہے جو عاشقِ شاعر کو  
 جلا رہا ہے۔ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ لگتی ہے اور دل پر شدید اثر پڑتا ہے۔ بعض لوگ  
 اس کو پڑھ پڑھ کر سر دھنتے ہیں اور اپنے اوپر کیفیت طاری کرتے ہیں۔ امداد المصنوع میں  
 مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی روایت ہے کہ حاجی صاحب ایک دفعہ کہیں سے  
 گزر رہے تھے کہ ایک شخص دردنامہ غمناک پڑھ رہا تھا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا



پڑھ رہے ہو وہ اپنی پڑھائی میں مست تھا حاجی صاحب سے بے رخی سے پیش آیا لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کتاب کے ناظم یہی ہیں تو بہت شرمندہ ہوا اور احترام سے پیش آیا۔

### تعداد اشعار

اس نظم کو مختلف عنوانات کے ماتحت ناظم نے نظم کیا ہے اور اس میں کل اشعار ایک سو پچھتر ہیں۔

### ارشاد مرشد ۱۲۹۳ھ

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو سولہ صفحات پر ختم ہو جاتا ہے اس میں نمازوں کے بعد کے وظائف از کار و اشغال اور مراقبات، طریق اثباتِ مجرد، طریق اسم ذات، طریق ذکر پاس انفاس، ذکر اسم ذات ربانی، اور لطائف ستہ کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ کے شجرے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ آخر میں شجرہٴ پیران چشت کو ایک مثلث میں بیان کیا ہے۔ جس کا آغاز اس طرح ہے۔

تو اگر چاہے قبولیت دعا کے واسطے عرض کرنا شاہ یوں ازل خدا کے واسطے

حمد ہے سب تیری ذات کبریا کے واسطے

ہے درود و نعت ختم انبیاء کے واسطے اور سب اصحاب آلِ مصطفیٰ کے واسطے

فضل کر ہم پر الہی مجتبیٰ کے واسطے

سب سے آخر میں نصابِ متفرقہ کے عنوان کے ماتحت مختلف اقوال پیش کئے ہیں جن

میں سبق آموز نصیحتیں ہیں، مثلاً

”اے پرہیزگار آدم! از فکر من ایمن مباش، مادام کہ از صراطِ مگذشتہ باشی“ اے

پرہیزگار آدم! ترسی از قوت و رزق، مادام کہ خزائن من پر یابی خزائن من ہرگز فانی و تہی

نمی شود۔“

## تاریخ تصنیف

یہ رسالہ جیسا کہ حاجی صاحب نے اس کے آخر میں تاریخ درج فرمائی ہے ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ میں پایہ اختتام کو پہنچا ہے اور میرے پیش نظر مطبع مجیدی کا پور کا دسمبر ۱۹۲۱ء محرم ۱۳۴۰ھ کا چھپا ہوا ہے مگر اس سے پہلے بھی مختلف جگہ اس کے ایڈیشن چھپے ہیں۔

## ضیاء القلوب ۱۲۸۲ھ

یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ حاجی صاحب نے اس کو حافظ محمد یوسف صاحب صاحبزادہ جناب حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر مکہ مکرمہ میں ۱۲۸۲ھ میں لکھ کر ختم فرمائی۔ اس کتاب کا تاریخی نام رسالہ ”مرغوب دل“ ہے جس کے عدد میں نے تو نہیں نکالے البتہ حاشیہ پر محشی نے یہ تاریخی نام لکھ کر ۱۲۸۲ھ عدد لکھے ہیں۔ حاجی صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں:

بعضے از یاران طریقت خصوصاً عزیزم، سعید کونین، پسندیدہ اخلاق، حافظ محمد یوسف فرزند رشید امام العاشقین عارف باللہ کامل اکمل حافظ محمد ضامن شہید فاروقی چشتی رحمۃ اللہ علیہ ملتسم شدند و باعث بریں گردیدند کہ آنچہ اذکار و اشغال و مراقبات خاندان عالیہ چشتیہ صابریہ قدوسیہ معمول اند، برائے مایاں بقلم آرد، تا در مفارقت بعیدہ کہ تو خدمت حرمین شریفین اختیار کردہ و مایاں دور دراز دروہندوستان افتادہ ایم بر آں عمل کردہ آید، و آئندہ را ہم بکار آید۔

بعض درویش مشریوں نے خاص طور پر عزیزم، سعید کونین، خوش اخلاق، حافظ محمد یوسف نے جو کہ امام العاشقین عارف باللہ کامل اکمل حافظ محمد ضامن شہید فاروقی چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ ہیں، انہوں نے مجھ سے التماس کیا اور اس رسالے کے لکھنے کے باعث ہوئے، جو کچھ عالیہ خاندان چشتیہ صابریہ قدوسیہ کے اذکار و اشغال ہیں ہمارے لئے جو کہ آپ کی جائے قیام حرمین

شریفین سے دور ہندوستان میں پڑے ہوئے ہیں تحریر فرمائیں تاکہ ان پر عمل کر سکیں اور آئندہ کے لئے بھی یہ کتاب مفید و کارآمد ہو۔

مثنوی شریف کے حواشی اور فوائد کے بعد حاجی صاحب کی یہ تصنیف تصوف کا خلاصہ اور جوہر ہے جس میں ہر قسم کے اذکار و اشغال و وظائف اور عبادات کے ماتحت بیان کئے گئے ہیں، اس کتاب کی وقعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حاجی صاحب لکھتے ہیں:

از فوہ التماس عزیزاں چارہ ندیدہ ملتجی بجناب قدس حق تعالیٰ گردیدم پس بدغم القا شد کہ بنویس۔

دوستوں کی کثرت خواہش پر کوئی چارہ نہ دیکھ کر خدائے قدوس کی بارگاہ میں ملتجی ہوا اور میرے دل میں القا ہوا کہ لکھ۔

تو جس کتاب کے لکھنے کے لئے بارگاہ قدس کی طرف سے القا ہوا اس کتاب کی توصیف اور کوئی کیا بیان کرے، اس کتاب کی حقیقت کا اندازہ اہل دل اور عاشق نور حقیقت ہی کر سکتے ہیں۔ البتہ مجھے جو اس کتاب کے پڑھنے سے فائدہ ہوا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ مجھے تصوف کی حقیقت کا نور اس میں چمکتا نظر آیا۔ اور اسی کتاب سے مجھے ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (نماز بے حیائیوں اور بری بات سے روکتی ہے) کی حقیقت کا پتہ چلا اور اسی کتاب سے مجھے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تلاوت کس طرح کرنی چاہئے اور نماز کس طرح پڑھنی چاہئے۔

وحدة الوجود ۲۱ رذی الحجہ ۱۲۹۹ھ

یہ دراصل ایک طویل خط ہے جو مضمون کی صورت اختیار کر گیا ہے اور جو سات صفحات پر فارسی زبان میں ہے۔

ایک صاحب مولوی محمد عبدالعزیز صاحب نے حاجی صاحب کو خط لکھا تھا کہ آپ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اور آپ کے مریدین میں مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند اور

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی اور مولانا احمد حسن رحمہم اللہ علیہم وحدۃ الوجود کے مخالف ہیں بلکہ ایسے شخص کو زندیق کہتے ہیں۔ اس تحریر کے جواب میں حاجی صاحب نے مسئلہ وحدۃ الوجود کی حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب وغیرہ اس مسئلہ کے مخالف نہیں ہیں۔

### فیصلہ ہفت مسئلہ

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو بارہ صفات پر مشتمل ہے۔ اس میں ان مسائل پر روشنی ڈالکر فیصلہ کیا گیا ہے جو ہندوستان کے علما میں اختلاف کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً (۱) مولود شریف، (۲) فاتحہ، (۳) عرس و سامع، (۴) ندائے غیر اللہ، (۵) جماعت ثانیہ، (۶) امکان نظیر، (۷) امکان کذب۔

اس رسالے کے دیباچے میں مصنف کی طرف سے لکھا ہوا ہے:

”فقیر امداد اللہ الحنفی اچھٹی عموماً سب مسلمانوں کی خدمت میں اور خصوصاً جو

اس فقیر سے ربط و تعلق رکھتے ہیں عرض کرتا ہے (فیصلہ ہفت ص: ۲)

اس رسالے کی تصنیف کے متعلق حاجی صاحب کی زندگی ہی میں شور تھا کہ یہ حاجی صاحب کا لکھا ہوا نہیں ہے بلکہ زبانوں پر مولانا اشرف علی صاحب کا نام آتا رہا اور انہی کی کتابوں کی فہرست میں یہ رسالہ درج بھی ہے اس کو حاجی صاحب کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں امداد المشتاق کی حسب ذیل عبارت جو حاجی سید نور الحسن صاحب ساکن دتہری کی روایت سے ہے ملاحظہ کیجئے۔ سید نور الحسن صاحب اپنے دوسرے سفر حج کے واقعات کے ماتحت روایت کرتے ہیں:

”ہندوستان میں بمقام قصبہ خورجہ (ضلع بلند شہر) ایک خان صاحب مرحوم خور

جوی نے بسبیل تذکرہ مجھ سے ”فیصلہ ہفت مسئلہ“ کی نسبت کہا کہ یہ رسالہ

حضرت حاجی صاحب کا لکھا ہوا نہیں ہے، بلکہ کسی اور نے لکھ کر حضرت کی طرف

منسوب کر دیا ہے، اس روایت پر قلب میں ایک شبہ اور وسوسہ پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ اس سفر میں ایک نسخہ ”فیصلہ ہفت مسئلہ“ کا اس نیت سے ساتھ لیا کہ حضرت (حاجی) صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر حرف بحرف سنا کر اس کی تصدیق کروں گا کہ یہ سب حضرت ہی کا لکھا ہوا ہے یا اس میں کچھ تحریف ہوئی۔ چنانچہ آگیوٹ میں مولوی محمد سابق انیٹھوی سے میں نے اس کا تذکرہ کیا کہ میرا ایسا ارادہ ہے، مولوی صاحب بھی میرے ہم خیال ہوئے۔ جب مکہ معظمہ پہنچے تو میں اور مولوی محمد سابق حضرت اقدس کے آستانے پر حاضر ہوئے اور رسالہ میرے پاس تھا، جس وقت قدم بوس ہوئے تو حضرت قبلہ نے اوّل ہی مولوی سابق صاحب کی طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ ”میاں محمد سابق ہندوستان میں لوگوں میں عجیب طرح کے نزاعات واقع ہو رہے ہیں۔ سنا ہے کہ فیصلہ ہفت مسئلہ کے اوپر بھی اکثر لوگ اشتباہ کرتے ہیں کہ وہ فقیر کا لکھا ہوا نہیں ہے مگر افسوس ہے کہ یہ نہیں دیکھتے کہ خواہ کسی کا لکھا ہوا ہو حق بات کو سمجھیں اور وہ رسالہ فقیر نے ہی لکھا ہے۔ اس کا اوّل مسئلہ یہ ہے اور دوسرا یہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ساتوں مسئلوں کو بالتفصیل چند الفاظ میں ایسا بیان فرمائے کہ مجھے حرفاً حرفاً اس کو سننے یا تصدیق کی حاجت باقی نہ رہی اور خاموش سن کر جب وہاں سے واپس ہوا تو مولوی محمد سابق سے کہا کہ لیجئے کیا اطمینان منجانب اللہ ہو گیا

کہ سوال کی بھی ضرورت نہ رہی فالحمد للہ۔“ (امداد المشتاق ص ۱۷۹-۱۸۰)

اس تحریر کے بعد میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ امداد المشتاق کی یہ روایت زیادہ قابل سند ہے جبکہ خود مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

ف: فیصلہ ہفت مسئلہ کی یہ تو حسّی تحقیق تھی کہ اس کا وجود کس طرح ہو باقی اس سے زیادہ ضروری شرعی تحقیق رسالہ ”تنبیہات وصیت“ کے آخر میں ملاحظہ فرمائی جاوے۔“ (امداد ص: ۱۸۰)

قبروں کے عرس اور سماع کے سلسلے میں حاجی صاحب کی حسب ذیل عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ ہفت مسئلہ حاجی صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

”مشرّب فقیر کا اس امر (سماع) میں یہ ہے کہ ہر سال اپنے پیر مرشد کی روح مبارک کو ایصالِ ثواب کرتا ہوں۔ اول قرآن خوانی ہوتی ہے..... ماحضر کھانا کھلایا جاتا ہے اور اس کا ثواب بخشہ یا جاتا ہے اور زوائد امور فقیر کی عادت نہیں، نہ کبھی سماع کا اتفاق ہوا۔“ (فیصلہ ہفت مسئلہ ص: ۹)

مذکورہ بالا اور حسب ذیل عبارت بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ یہ کتاب حاجی صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔ یادِ رسول اللہ یا اور کسی کو ندا کرنے کی بحث میں موصوف لکھتے ہیں:

”مشرّب اس فقیر کا یہ ہے کہ ایسی ندا میرا معمول نہیں۔ ہاں بعض اشعار میں ذوق و شوق سے صیغہ ندا برتا گیا۔“ (فیصلہ ص: ۱۰)

کتاب کے آخر میں مسئلہ امکانِ کذب پر تحقیق کر کے ہوتے حاجی صاحب لکھتے ہیں:

”اسی مضمون کا خواب فقیر کے ایک متعلق نے دیکھا۔“ (فیصلہ ص: ۱۲)

ان سب عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب حاجی صاحب ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اس کتاب کی اشاعت کے بعد لوگوں میں بحثوں کا بازار گرم ہو گیا، حالانکہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رفع اختلاف کے لئے اس مضمون کو تحریر فرمایا تھا یا اپنے خیالات مولانا اشرف علی صاحب پر واضح کر کے ان سے لکھائے تھے۔

### حاجی صاحب کا اضطراب

دراصل حاجی صاحب کے مریدین کا حلقہ وسیع ہونے کے علاوہ ایسے حضرات پر مشتمل تھا جن میں دیوبندی عقائد کے حضرات بھی تھے جو دوسرے عقائد کے حامل تھے۔ اس لئے حاجی صاحب دونوں کو اتفاق سے رہنے اور اختلاف سے بچنے اور فساد کو ہوا دینے سے روکنے کے خواہشمند تھے، لیکن اس کے باوجود یہ اختلاف رفع نہ ہو سکا۔ مولانا عاشق الہی

صاحب تذکرۃ الرشید میں تحریر فرماتے ہیں:

”جس زمانے میں فیصلہ ہفت مسئلہ کا ہنگامہ پایا تھا (حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے ارشاد فرمایا کہ ہندوستان میں تو کوئی بات بھی نہیں تھی عرب سے تو اب عجیب عجیب خبریں آتی ہیں۔ (تذکرۃ الرشید ص: ۲۸۶ حصہ دوم)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ ہفت مسئلہ کا ہنگامہ ضرور پایا ہوا تھا۔ اور حاجی صاحب کے مریدین میں اختلاف ہوا تھا۔ ایک طرف حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس دارالعلوم، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، حکیم ضیاء الدین صاحب رائیں رام پور منہیاراں وغیرہ وغیرہ تھے، اور دوسری طرف حاجی عابد حسین صاحب دیوبندی، مولوی عبدالسمیع صاحب رامپوری منہیاراں اور دیگر صاحبان تھے مگر اس کتاب کے آخر میں حاجی صاحب نے جو وصیت کے عنوان کے ماتحت عبارت لکھی ہے وہ حسب ذیل ہے جس سے حاجی صاحب کی صلح پسندی اور حق جوئی کا پتہ چلتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

اور اس تمام تحقیق کے بعد بھی فقیر کی یہ وصیت ہے کہ ظلیات میں اپنے علم تحقیق پر وثوق نہ کریں۔ سورۃ فاتحہ اھدنا الصراط المستقیم بہت خشوع سے پڑھا کریں اور ہر نماز کے بعد رہنا پڑھ کر دُعا کیا کریں اور اپنے اوقات معاش و معاد کے ضروری کاموں میں، خصوصاً تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن میں صرف کریں اور اہل اللہ کی صحبت و خدمت اختیار کریں خصوصاً عزیز بجناب مولوی محمد رشید احمد صاحب (گنگوہی) کے وجود بابرکت کو ہندوستان میں غنیمت کہہ کر نعمت عظمیٰ سمجھ کر ان سے فیوض و برکات حاصل کریں۔“ (فیصلہ ہفت مسئلہ ص: ۱۲)

اس عبارت اور بعض دیگر عبارتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب کے



روحانات مولانا گنگوہی اور مولانا نونو تو کی طرف تھے۔

ہم نے بحیثیت مصنف اس کتاب کے تاریخی اور تحقیقی پس منظر بحث کی ہے جو ایک تذکرہ نویس کے لئے ناگزیر ہے۔ کتاب میں مندرجہ مسائل سے ہم نے قطعاً بحث کرنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ لیکن اتنا کہنے کو ضرور دل چاہتا ہے کہ حاجی صاحب کا مقصد اس کتاب سے معتقدین کے آپس میں اختلاف کو روکنا ہے اور فساد کو ہوا دینے سے بچانا ہے، مسائل کی تحقیق فقہی میں دونوں جماعتیں اپنے اپنے حق میں کھینچا تانی کر سکتی ہیں۔ مگر حاجی صاحب کی نیت صلح کل، مصلحت اندیشی، خلوص اور للہیت پر مبنی تھی۔

### سن تصنیف

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس رسالہ کا سن تصنیف خلاف عادت حاجی صاحب نے تحریر نہیں فرمایا۔ تاہم یہ کتاب ہی نہیں دیگر کتب بھی تصنیف سے کئی کئی سال بعد چھپی رہی ہیں۔ یہ رسالہ جو اس وقت میرے پیش نظر ہے محرم ۱۳۳۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۱ء میں مطبع مجیدی کانپور میں چھپا ہے۔

### گلزارِ معرفت

یہ حاجی صاحب کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے جس کو آپ کے مرید عقیدت کیش میاں نیاز احمد صاحب نے جمع کر کے مرتب کیا ہے۔ اس میں حمد، نعت، عشق حقیقی سے متعلق غزلیات، شوق قیام مدینہ وغیرہ مضامین پر مشتمل اشعار ہیں۔ جن میں تین سوانیس (۳۱۹) اردو کے اشعار ہیں اور ترانوے (۹۳) فارسی کے ہیں۔ یہ مجموعہ بلالی و خانی پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ میں غالباً پہلی مرتبہ شائع ہوا لیکن طباعت کا سال، ماہ وغیرہ کچھ درج نہیں۔

### خطوط

ان تصانیف کے علاوہ حاجی صاحب کے مکتوبات ہیں جو علم تصوف اور پند و نصائح کی





جان ہیں۔

## مرقومات امدادیہ

ان مکتوبات میں اکٹھ (۶۱) خطوط تو وہ ہیں جو امداد المشتاق کے آخری حصہ میں مرقومات امدادیہ کے نام سے موسوم ہو کر چھپے ہیں اور جن کو مولانا وحید الدین رام پوری نے جمع کیا تھا، یہ مکتوبات فارسی میں ہیں لیکن ان کا ترجمہ مولانا عبدالحی صاحب سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے اردو میں کیا ہے اور وہ ترجمہ بھی خطوط کے ساتھ اسی کتاب میں چھاپ دیا گیا ہے۔ یہ خطوط مولانا رشید احمد صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری، حاجی عابد حسین صاحب وغیرہم کے نام ہیں۔

## مکتوبات امدادیہ

مذکورہ خطوط کے علاوہ پچاس وہ خطوط ہیں جو مولانا اشرف علی صاحب کے نام مکہ معظمہ سے روانہ فرمائے ہیں۔ یہ مکتوبات اردو زبان میں ہیں اور آخری دور کے ہیں۔ آخری خط ۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے تقریباً دو ماہ بعد حاجی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ بہر حال یہ خطوط پہلی مرتبہ مطبع احمدی لکھنؤ میں نومبر ۱۹۱۵ء میں طبع ہوئے۔

## بنام حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

حاجی صاحب نے جو خطوط قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو تحریر فرمائے ہیں ان کی تعداد بارہ ہے، جن میں صرف ایک خط فارسی زبان میں مرقومات امدادیہ میں درج ہے۔

ایک خط مسئلہ وحدۃ الوجود کے بارے میں مولوی عبدالعزیز امر وہوی کے نام ہے، جو علیحدہ ایک پمفلٹ کی شکل میں فارسی زبان میں ہے۔ گویا کل ایک سو چوبیس خطوط ہیں جو اس وقت مجھے معلوم ہو سکے، اور کتنے خطوط ہوں گے جو چھپ نہ سکے ہوں گے۔

# حاجی صاحب کی شاعری

اور

اردو فارسی نثر و نظم

شعراے اردو کے مشہور تذکرہ نویس محمد حسین آزاد نے ولی دکنی کو شعر اکا باوا آدم کہا ہے۔ اس کا خیال اس نظریے کا غماز ہے کہ ولی پہلا صاحب دیوان ہے۔ ورنہ گو لکنڈے اور بیجاپور میں ولی سے پہلے قطب قلی وغیرہ بہت سے شاعر گذرے ہیں۔ آزاد کا تذکرہ ”آب حیات“ اپنے دور کی تحقیقات میں اب بہت سی ترمیم کا محتاج ہے۔ شبلی کی شعراء العجم یقیناً اس زمانے میں شعراے فارسی پر بہترین ریسرچ تھی لیکن حافظ محمود شیرانی کی تنقید نے اس میں نقد و نظر کے نشتر سے بہت کچھ عمل جراثیم کیا ہے۔ بہر حال سب سے پہلے صاحب دیوان ہونے کے باعث ولی کے سر پر اولیت کا تاج رکھ دیا گیا۔

حاجی امداد اللہ صاحب بھی شعرا و علمائے دارالعلوم دیوبند کے ولی یا باوا آدم تھے۔ ان کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری سے دلچسپی اور ذوق تھا۔

تخلص

حاجی صاحب نے اپنا تخلص امداد اختیار کیا تھا۔ گویا اپنے نام کا ایک جز استعمال کر کے علیحدہ کسی اور تخلص کا تکلف کرنا پسند نہیں فرمایا۔

سلسلہ تلمذ

راقم الحروف پوری تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ آپ کا شاعری میں کوئی استاد نہ

تھا۔ طبیعت میں شاعری کا چشمہ اُبلا اور بہ پڑا۔ جس طرف کو بہا اسی رخ بہنے دیا اور جس طرح بہا اس کو اسی طرح چلنے دیا۔ کسی سے اصلاح لینے کی اپنے خیال میں ضرورت نہ سمجھی کیوں کہ کچھ کہنے سے انکامد شاعری نہ تھی، بلکہ دل کے جذبات کی کیف مالتق ترجمانی تھی۔ البتہ 'جائے استاد خالیست' کا نظریہ اگر درست ہے اور یقیناً درست ہے تو استاد کی رہبری سے شاعری کے خط و خال سنور جاتے ہیں، بشرطیکہ کسی کامدعا اس کے چہرے کو نکھارنا ہو۔ بسا اوقات فطری طور پر ایسے شاعر بھی گذرے ہیں کہ جنہوں نے زندگی بھر کسی کو استاد نہیں بنایا، لیکن چونکہ وہ اسی زندگی کا مشغلہ بنائے رہے اس لئے وہ ہمہ وجود آسمان شعر و سخن کے آفتاب بن کر چمکے۔ آخر غالب کا بھی تو کوئی استاد نہ تھا جس سے شعر و سخن میں انہوں نے اصلاح لی ہو لیکن اس کا مقام اتنا بلندی پر پہنچا کہ اس فن کا امام بن گیا۔

در حقیقت شاعری کے جوہر کے ساتھ اگر قدماء کے اشعار پر عبور ہو اور ان کی تراکیب و لوازم، جذبات لطیفہ، سادگی، جوش اور تخیل کی گھاٹیوں سے انسان خود عہد ابراہونے کی اہلیت رکھتا ہو تو پھر خود رہبر کے بغیر اچھا شاعر بن سکتا ہے۔

### شاعری کے لئے داخلی یا خارجی جذبے کی ضرورت

حاجی صاحب کی شاعری ان کے فطری ذوق کی غماز ہے۔ شاعری کے لئے کسی داخلی یا خارجی آتشگیر مادے کی ضرورت ہے۔ اُن کے دل میں اٹھارہ برس کی عمر سے عشق حقیقی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس نے اندرونی جذبات کو ریاضت و عبادت، ذکر و فکر اور اشغال کے علاوہ شاعری کے رنگ میں بھی جلوہ گر ہونے کی صورت اختیار کر لی، اسی عشق حقیقی کے نتیجے میں ان کی تمام تر شاعری عشقِ ازلی، عشقِ رسالت، معرفت، نعت اور منقبت سے لبریز ہے۔ مجاز کو کہیں دخل نہیں۔

### شعر و سخن سے دلچسپی

کسی شخص کی شاعری کا اندازہ بسا اوقات شعر و سخن سے اس کی دلچسپی سے بھی ہوتا ہے۔



حاجی صاحب کے ملفوظات، ان کی مجالس، خطوط اور تصنیفات میں جا بجا دلچسپ اشعار آپ کو ملیں گے۔ مثلاً ایک خط میں انہوں نے حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری (ضلع سہارنپور) کو مکہ معظمہ سے فارسی میں لکھا ہے، اس میں اردو کے حسب ذیل اشعار لکھتے ہیں:

”ای عزیز مایاں بمصیبت خود مبتلا نیم غیری را چہ گفتہ آید: شعر۔

روتی ہے خلق میری خرابی کو دیکھ کر      روتا ہوں میں کہ ہائے مری چشمِ غم نہیں  
غمگین ہمارے غم سے ہے عالمِ نگر ہمیں      غم ہے تو بس یہ غم ہے کہ کچھ بھی تو غم نہیں  
ہم پر جفا و جور جو کچھ ہے نصیب ہے      ورنہ طریق یار کا جور و ستم نہیں  
پھولا نہ ختم عشق مرا ورنہ چشمِ وِیل      گرمی مہر وابر بہاری سے کم نہیں

ایک اور خط میں حکیم ضیاء الدین صاحب کو لکھتے ہیں:

”عزیز من، عاشقانِ حق در قبض و جبرائِل لذت وصال می پشند۔

جو مزا انتظار میں دیکھا      نہ کبھی وصل یار میں دیکھا  
یہی حال بلکہ اس سے زیادہ فارسی اشعار سے دلچسپی اور یادداشت کا ہے۔ ملفوظات اور مکتوبات میں جا بجا فارسی کے اشعار ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں اور کیا پیاری فارسی میں لکھتے ہیں:

”بہر صورت، بحال خستہ و شکستہ و بقصور خود معترف گشتہ بر در گاہ کریم کار ساز  
پیوستہ افتادہ ماند ماند، و نہ فہمد کہ لائق دربار حضرت سبحانہ تعالیٰ نیست۔“ (بیت)  
تو مگو مارا بدایاں شہ بار نیست      بر کریمیاں کار ہا دشوار نیست  
بلکہ بدست ہمت دامنِ رحمت گرفتہ نگذارد و امیدوار ماند، اگر ایں چنین کند  
امید قوی است کہ ارحم الراحمین بندہ شکستہ خود را نخواہد گذاشت، زیرا کہ اول تعالیٰ  
از عبد خود بجز شکستگی و خستگی نمی خواہد چنانچہ (ابیات)

من نہ گروم پاک از تسبیح شان      پاک ہم ایشاں شوند و در فشاں

چند ازیں الفاظ واضع و بجا سوز خواہم سوز با آں سوز و ساز  
غرض کہ علم و فن کے تمام شعبوں میں حاجی صاحب کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ لہذا  
ایسا شخص فطرت کی طرف سے شاعری کا ملکہ لے کر آتا ہے۔

### حاجی صاحب کے کلام کا ذخیرہ

آپ کے کلام کا مجموعہ کس قدر ہے اس کا اندازہ آپ اس عبارت سے کر سکتے ہیں جو  
نیاز احمد صاحب نے ”گلزارِ معرفت“ کے اوّل میں لکھی ہے۔ نیاز احمد صاحب حاجی  
صاحب کے کوئی مرید ہیں انہوں نے آپ کا کچھ کلام یک جا جمع کر کے اس کا نام گلزارِ  
معرفت رکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”بعد حمد و صلوة یہ نیاز احمد..... خدمت میں اخوان طریقت و خلائان الحقیقت کے  
عرض رساں ہے کہ حضرت پیر و مرشد دایم ظہیم کا کلام منظوم ہدایت مفہوم اس  
کثرت سے ہے کہ اس کا احصا و ضبط دشوار ہے۔ مگر احقر کو کچھ متفرق و منتشر  
اوراق اتفاقاً ہاتھ لگ گئے۔ بغرض انتفاع..... دوسرے پیر بھائیوں وغیرہ کے  
جی میں آیا کہ اوراق کو جمع کر کے ان کی خدمت میں پیش کروں اور نام اس  
مجموعہ طیبہ کا گلزارِ معرفت رکھا۔ (گلزارِ معرفت ص ۲)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب کا کلام بکثرت ہے لیکن نیاز احمد  
صاحب نے اس کی تفصیل یا جو کچھ ان کے علم میں آسکتا تھا اس کا اظہار نہیں کیا۔ تاہم میری  
تحقیق کی جہاں تک رسائی ہے ان کے مجموعہ کلام کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

### تفصیل کلام

۱..... دردنامہ غمناک :- مختصر سا اردو منظوم رسالہ ہے جس میں ایک سو پچھتر (۱۷۵) اشعار ہیں۔

۲..... غذائے روح :- اردو مثنوی ہے جس میں سولہ سو پچاس (۱۶۵۰) اشعار ہیں۔

۳..... جہاد اکبر:- اردو منظوم رسالہ ہے جس میں چھ سو اُناسی (۶۷۹) اشعار ہیں۔

۴..... نالہ امداد غریب:- جہاد اکبر کے آخر میں نالہ امداد غریب کے عنوان سے چھ صفحات کا تتمہ ہے جس میں پہلے ایک رباعی ہے اور بعد ازاں اکیاسی مناجاتیہ اشعار ہیں اور اس کے بعد ایک خمسہ ہے جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشہور مناجات پر بطورِ تضمین لکھا ہے اور جس کے ۳۳ اشعار ہیں۔ پھر شوقِ مدینہ میں ۱۹ شعر ہیں۔ بعد ازاں ایک مناجات ہے جس کے ۸ اشعار ہیں۔ ایک اور مناجات ہے جس کے ۸ اشعار ہیں۔ آخر میں دو اور مناجاتیں ہیں جن کے ۱۵ شعر ہیں۔ اس طرح نالہ امداد غریب کے کل ۱۷۸ شعر ہوتے ہیں۔

۵..... مثنوی تحفۃ العشاق:- اردو کلام ہے جس میں تیرہ سو چوبیس (۱۳۲۴) اشعار ہیں۔

۶..... گلزارِ معرفت:- اردو غزلیات، حمد و نعت وغیرہ۔ جس میں اردو کے تین سوانیس (۳۱۹) اشعار ہیں۔

مذکورہ بالا تمام تصنیفات کے کلام یعنی اردو اشعار کا مجموعہ پانچ ہزار نو سو دس اشعار ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کے مصنفہ رسالے میں جو ”ارشادِ مرشد“ کے نام سے موسوم ہے ایک مثلث شجرہ اردو زبان میں پیرانِ چشت کا ہے جس کے اُناسی اشعار ہیں اور ایک مصرع مزید مثلث کی بنیاد پر ہے۔ اس کے علاوہ ایک مخمس کا پتہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی کتاب ”امداد المشتاق“ سے چلا ہے۔ وہ حاجی صاحب کی زبانی روایت کرتے ہیں جو حسب ذیل ہے:

(حاجی صاحب نے) فرمایا کہ میں نے ایک بار حضرت پیر و مرشد (میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی) کی شان میں ایک مخمس کہا۔ چونکہ مجھ میں تابِ سنانے کی نہ تھی کسی اور کی معرفت حضرت کو سنوایا..... تیسرے روز حضرت (میانجی صاحب) نے فرمایا کہ شاہ

عبدالرحیم صاحب (میانجی صاحب کے پیر) نے تم کو سُرخ رنگ کا جوڑا عنایت کیا ہے۔  
گویا وہ خلعتِ صلا اس مخمس کا تھا..... اس مخمس کے چند اشعار یہ ہیں۔

تم ہو اے نور محمد خاص محبوبِ خدا      ہند میں ہونا ب حضرت محمد مصطفیٰ  
تم مدد گار مدد، امداد کو پھر خوف کیا      عشق کی پرستگے باتیں کانپتے ہیں دست و پا  
اے شہ نور محمد وقت ہے امداد کا

جامِ آفت سے ترے میں ہی نہیں اک جرءِ نوش      سینکڑوں در پر ترے مدہوش ہیں اے مے فروش  
دل میں ہے ان کے بھرا اک بادہ وحدت کا جوش      پر یہی کہہ کر اٹھے ہیں جب ہے آیا ان کو ہوش  
اے شہ نور محمد وقت ہے امداد کا

آسرا دُنیا میں ہے از بس تمہاری ذلت کا      تم سوا اوروں سے ہر گز کچھ نہیں ہے التجا  
بلکہ دُن محشر کے بھی جس وقت قاضی ہو خدا      آپ کا دامن پکڑ کر یہ کہوں گا برملا  
اے شہ نور محمد وقت ہے امداد کا

(امداد المشاق ص: ۱۱۵-۱۱۶)

لیکن افسوس یہ ہے کہ حضرت راوی نے اس مخمس کے صرف تین بند لکھے ہیں باقی کا  
کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کسی اور کتاب میں یہ پورا مخمس موجود ہے یا نہیں۔ البتہ حاجی صاحب  
کے مجموعہ کلام میں یہ مخمس کہیں موجود نہیں ہے۔

### اردو اشعار کا کل مجموعہ

مذکورہ تفصیل کے بعد جس قدر اردو اشعار میری تحقیق میں آ سکے ان کا مجموعہ مذکورہ بالا  
شجرہ چشتیہ منظوم اور نامکمل مخمس کو شامل کر کے پانچ ہزار نو سو پچانوے (۵۹۹۵) اردو اشعار  
ہوتے ہیں۔

### فارسی کلام

مذکورہ اردو کلام کے علاوہ آپ کے فارسی اشعار صرف گلزار معرفت میں موجود ہیں جن

کی کل تعداد تیرانوے (۹۳) ہے۔

## کل اردو اور فارسی اشعار

اس مقام پر پہنچ کر ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ اپنی تلاش و جستجو اور اپنی کاوش و محنت کا نتیجہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیں کہ حاجی امداد اللہ صاحب کے کل اردو اور فارسی اشعار کی تعداد جو ہمیں مل سکی چھ ہزار اٹھاسی (۶۰۸۸) ہے۔ اگر کسی اور صاحب کے علم میں مزید برآں اشعار یا کلام ہو تو شکریہ کے ساتھ معلومات میں اضافے کا باعث ہوگا۔ بہر حال چھ ہزار اٹھاسی اشعار کی تعداد کوئی معمولی تعداد نہیں ہے۔ ایسے شخص کا نام نامی اگر شعرا کے تذکرے کی زینت نہ بنے تو اور کسی کا بن سکے گا۔ اس سے فراغت کے بعد ہم قارئین کو ان کے اصناف شعر کی طرف لئے چلتے ہیں کہ انہوں نے شعر کی کس کس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

## اصنافِ کلام

ہم نے گذشتہ صفحات میں آپ کے مجموعہ کلام کو پیش کیا ہے لیکن ہم نے یہ تفصیل مذکورہ بالا عنوان کے لئے مخصوص کر رکھی تھی کہ ہم یہ بتائیں کہ ان کی شاعری کا تمام مجموعہ کن کن اصناف شاعری پر شامل ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک تحقیق کی گئی اس کا تجزیہ یہ ہے کہ آپ کے کلام میں شعر کی حسب ذیل اصناف موجود ہیں جن پر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ (۱) مثنوی، (۲) غزل، (۳) مخمس، (۴) مثلث، (۵) قصائد، (۶) نعت، (۷) رباعیات، (۸) تاریخی مادے۔ اس تجزیے کے بعد سب سے پہلے ہم ان کے منظوم رسالے پر جو ”دردنامہ غمناک“ کے نام سے موسوم ہے سیر حاصل تبصرہ کرتے ہیں اور اس میں سے انتخاب پیش کر کے ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔



## دردنامہِ غمناک پر ایک نظر

یہ رسالہ آٹھ صفحات پر ہے جس میں مثنوی کے طرز پر ایک سو پچھتر اشعار ہیں۔ اس رسالے کا آغاز حسب ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

سنو یارو عجب قصہ ہمارا بیان کرتا ہوں میں جو غم کا مارا  
سناتا ہوں تمہیں اس کو سراسر گذرتا ہے جو کچھ اب میری جان پر

آغاز سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر مجازی عشق کا شکار ہوا ہے۔ اور معشوق کے ہجر کی سختیاں اس کی جان کو پگھلائے ڈالتی ہیں، چنانچہ اس کے آنکھوں میں شعر سے مجاز کا صاف دھوکا ہوتا ہے۔ شاعر لکھتا ہے۔

مرا اک دل رُبا سے دل گیا مل ہوا، تیغ نگہ سے اس کی بسمل  
اٹھا کر زلف، رُخ اپنا دکھایا بلا میں عشق کی مجھ کو پھنسیا  
مرا اک کھیل خلقت نے بنایا تماشے کو بھی تو لیکن نہ آیا

ایک سو پانچ اشعار تک مسلسل غم و اندوہ، سوز، اضطراب و بے قراری، خواہش و بیدار اور شکوہ و شکایت کا سلسلہ چلا گیا ہے اور قاری دور تک عشق مجازی کے دھوکے میں منہ لیس طے کرتا چلا جاتا ہے۔ تا آنکہ ایک سو پانچ اشعار کے بعد ایک سو چھٹا شعر آیا اور اس کو پڑھ کر قاری کے انتظار کا اضطراب، سکون میں تبدیل ہوا۔ جس شعر نے حقیقت سے نقاب الٹی وہ یہ ہے۔

یہ پردہ دور نکالے اللہ کر تو مجھے اس بھید سے آگاہ کر تو  
کہیں ہو کر کے بے پردہ پیارے ذرا تو روبرو ہو جا ہمارے

اسی طرح شاعر عشقِ خداوندی میں بے تاب نظر آ رہا ہے اور آخر میں جب اپنی بے دست و پائی پہ نظر ڈالتا ہے تو رضائے الہی میں گم ہو جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔  
رضام اپنی کر اس کی رضا میں نہ پڑ ہرگز خودی کی تو بلا میں



بس اب اللہ، بس اللہ، بس ہے سوا حق کے جو ہے باقی ہوس ہے  
 دردنامہ غمناک کے یہ دونوں آخری اشعار ہیں جن پر یہ نظم ختم ہوتی ہے۔ اس سے  
 عشقِ حقیقی کا مطلع بالکل صاف ہو گیا ہے۔ مذکورہ بالا اشعار مضمون کی نوعیت کے لئے پیش  
 کئے گئے ہیں۔ جو دردنامہ غمناک کی معنوی پوزیشن واضح کرتے ہیں۔ جہاں تک شاعرانہ  
 خصوصیت کا تعلق ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں دردنامہ غمناک حاجی صاحب کی  
 شاعری کی ابتدائی منزل کا پتہ دیتا ہے۔ اس رسالہ پر تنقید کے لئے حاجی صاحب کے دور کو  
 متعین کیجئے۔ حاجی صاحب کا زمانہ زندگی ۱۲۳۳ھ سے ۱۳۱۱ھ تک ہے۔ جو چوراسی سال  
 تک پھیلا چلا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں آپ نے انگریزوں کے خلاف جہادِ حریت میں حصہ لیا اس  
 وقت آپ کی عمر چوالیس (۴۴) سال تھی۔ اسی زمانہ میں آپ نے مکہ معظمہ کو ہجرت فرمائی  
 ہے اس وقت اردو شاعری ترقی میں کہیں سے کہیں جا پہنچی تھی، لیکن ترقی کا یہ دور اُن شعرا  
 کے لیے ہے جنہوں نے اپنی زندگی کا روشن مقصد شاعری کو بنالیا ہے۔ حاجی صاحب اس  
 طرح کے شاعر نہیں ہیں کہ شاعری کے تمام اصول و ضوابط کو پیش نظر رکھیں گے، خاص خاص  
 کو چھوڑ کر عموماً اس دور کی نثر و نظم پڑانے ڈھنک کی سی بے تکلف ہوتی تھی۔ چنانچہ پہلے اور  
 دوسرے دور میں بلکہ میر تقی اور درد کے زمانے کے وہ الفاظ جو پانچویں دور میں متروک  
 ہو چکے تھے۔ سادگی سے حاجی صاحب کے کلام میں موجود ہیں۔ مثلاً تک کا لفظ دردنامہ میں  
 ملاحظہ ہو۔

نک اپنے حسن کا جلوہ دکھا دے کہ اب بخود مجھے مجھ سے بنا دے  
 یہ پردہ دور نک اللہ کر تو مجھے اس بھید سے آگاہ کر تو  
 میر تقی کہتے ہیں۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی نک روتے روتے سو گیا  
 ایسے اشعار بھی حاجی صاحب کے کلام میں ملیں گے جنہیں ذرا سی ترمیم سے بالکل

صاف اور سیدھا بنایا جاسکتا ہے، لیکن وہی فقیرانہ سادگی میں جو قلم پر ایک دفعہ آگیا، لکھتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً دردنامہ، غمناک کا یہ شعر:

مرا اک دل رُبا سے دل گیا مل ہوا تج نگہ سے اس کی بسمل  
اس شعر کو ادنیٰ تا مل سے اگر یوں بدل دیا جائے:

”مرا اک دل رُبا سے مل گیا دل“ تو مصرع بالکل صاف اور سیدھا ہو جاتا ہے۔

حاجی صاحب کے کلام میں بعض ساکن حرفوں کا متحرک ہونا متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں حسب ذیل اشعار۔

تڑپ کر غم میں شب کو صبح کرنا صبح سے شام تک رو رو کے مرنا

غرض دیوانہ مجھ کو جان کر کے ہوئے گرد آمرے لڑکے شہر کے

پہلے شعر میں لفظ (صبح) بروزن لطف صحیح استعمال کیا ہے۔ لیکن دوسرے مصرع میں صبح

کی (ب) پر زبر ہے۔ اس طرح دوسرے شعر کے مصرع میں شہر کے لفظ میں (ہ) پر زبر

ہے۔ علاوہ ازیں شعر کے دوسرے مصرع میں تعقید لفظی بھی موجود ہے۔ شہر کی غلطی کو باقی

رکھتے ہوئے اس مصرع کو یوں کہا جاسکتا تھا۔

”مرے گرد آمرے لڑکے شہر کے“ مگر کلام میں پستی اور بلندی کا معاملہ شاعر کے

ساتھ ہے۔ میر تقی میر جس کو اردو شاعری اور بالخصوص غزل میں اولیت کا مرتبہ حاصل ہے

اس کے متعلق شیفتہ کا یہ مشہور فیصلہ پیش نظر رکھئے۔

”پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند“ اسی طرح حاجی صاحب کے اشعار میں

پستی بھی ہے اور بلندی بھی۔ اسی دردنامہ کے حسب ذیل معیاری اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرا اک کھیل خلقت نے بنایا تماشے کو بھی تو میرے نہ آیا

کہاں جاؤں کہوں کس سے حقیقت کوئی بہم نہیں جو دردِ فرقت

جو میں ظاہر کروں سو ز جگر کو کروں شرمندہ دوزخ کے شر کو

حقیقت دل کی گر اپنے دکھاؤں      ہنسوں میں اور عام کو رلاؤں  
 ہوا ہے ہاتھ سے عاجز گریاں      ہے گریاں سیل اشک غم سے داماں  
 خدا کے واسطے جلدی خبر لے      کہیں یہ آپ خون اپنا نہ کرے  
 جو تھی منظور کرنی بے وفائی      تو کی تھی مجھ سے پھر کیوں آشنائی  
 جو یا آئے گی وہ زلف پریشاں      تو بیچ دتاب کھائے گی مری جاں  
 اگر پوچھے کوئی یہ مجھ سے آکر      کہ کیا گذری ہے اے دیوانے مجھ پر  
 نہ ہرگز حال دل اپنا کہوں گا      ہنسوں گا اور رو کر چپ رہوں گا  
 رہو غیروں میں تم خوشیاں مناتے      ہم اس حسرت میں خون دل ہیں کھاتے  
 یہی بہتر ہے اب رویا کریں ہم      سر شک غم سے منہ دھویا کریں ہم

تمام امداد کر یہ درد نامہ

کہیں ایسا نہ ہو پھٹ جائے خامہ

مذکورہ بالا اشعار میں صفائی، سلاست، تسلسل اور سادگی کا پورا پورا عمل کار فرما ہے۔ از  
 ابتدا تا انتہا کلام میں سوز اور درد ہے۔ روانی کا یہ عالم ہے کہ کلام میں کہیں رکاوٹ نظر نہیں آتا۔  
 جس سے پتہ چلتا ہے کہ حاجی صاحب کو شاعری میں ایسا ملکہ ہے کہ وہ نثر کی طرح نظم لکھتے  
 جاتے ہیں، مذکورہ بالا اشعار میں پانچویں شعر تو خوب ہے۔

ہوا ہے ہاتھ سے عاجز گریاں

ہے گریاں سیل اشک غم سے داماں

سیل اشک نے دامن کو اتار کر دیا ہے کہ پھر داماں بھی اشک برسانے لگا ہے اور  
 آنسوؤں کے جذب کی اس میں طاقت نہیں رہی۔ یا یہ کہ سیل اشک غم سے داماں بھی نالاں  
 ہیں۔ غرض کہ دونوں معنی خوب ہیں۔ اسی طرح دسواں شعر اپنی فصاحت، سلاست اور سوز  
 دروں کی بہترین ترجمانی کر رہا ہے۔

نہ ہرگز حالِ دل اپنا کہوں گا

ہنسوں گا اور رو کر چپ رہوں گا

شاعر کو مایوسی میں ہنسی بھی آتی ہے۔ اور جب مجبور ہو جاتا ہے تو روتا بھی ہے اور جب ہنسے اور رونے سے بھی کام نہیں بنتا تو چپ ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اشعار عام نظم میں جذبات نیز نیچرل شاعری کا بہترین نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ گیارہواں شعر رشک کے مضمون میں خوب نکالا ہے۔ بارہویں شعر میں رونے کی تدبیر سے وصل کی التجا ہے۔ سرشک غم سے منہ دھونے کا لسانی چٹخارہ خوب ہے۔

اردو مثنویوں میں میر حسن کی مثنوی کو سب سے اوّل درجہ دیا گیا ہے۔ اور دوسرے نمبر پر دیا شکر نسیم کی گل بگاؤلی کو اور اس میں بھی شک کیا ہے۔ لیکن حاجی صاحب کے مذکورہ بالا اشعار بلا مقابلہ اپنی جگہ پر اچھی نظم کا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ دردنامہ غمناک کے متعلق اس قدر ہی لکھنا کافی ہے اس کے بعد ہم ان کے دوسرے منظوم کلام میں سے رسالہ ”جہادِ اکبر“ کی طرف قلم کی باگ موڑتے ہیں۔

### جہادِ اکبر پر تبصرہ

حاجی صاحب کی دوسری نظم ”جہادِ اکبر“ ہے۔ اس مختصر سے منظوم رسالے میں مثنوی کے وزن میں نفس کی غفلت دُنیا میں مشغولیت کا ذکر کیا ہے اور بالآخر نفس کو غفلت سے جگانے اور عشقِ حقیقی کی طرف دل لگانے کو جہادِ اکبر کہا ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک یہ نظم دردنامہ سے ترقی یافتہ معلوم ہوتی ہے، چونکہ دردنامہ کیفیتِ عشق، دردِ جدائی اور شکوہ و شکایت کا انداز رکھتا ہے اس لئے اس میں سوز و اضطراب ہے اور ”جہادِ اکبر“ میں نفس کو تنبیہ ہے اس لئے نظم کے لب و لہجہ میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہوں حسب ذیل اشعار۔

بیاں حال اب اپنا کرتا ہوں میں      کہ جس فکر میں روز مرتا ہوں میں

مجھے آگیا جو خیال ایک رات لگا سوچنے اپنے دل میں یہ بات  
 کہ افسوس غفلت میں جاتی ہے عمر سدا کوس رحلت بجاتی ہے عمر  
 مجھے فکر کل کی ہوئی آج یوں کہ کی دولت عمر برباد کیوں  
 نہ سویا شب اس فکر میں ایک دم رہا رات بھر اس سے میں چشم نم  
 اسی میں گئی رات ساری گذر شش و پنج کرتا رہا تا سحر

کہا نفس کو آخرش میں نے رات کہ کیا ہو گیا تجھ کو اے بد صفات  
 خبر حال کی تجھ کو اپنے نہیں کہ آیا تھا یاں کس لئے اے لعین  
 بتا تجھ سے کیا حق کو منظور تھا یہاں آ کے کیا کام تو نے کیا  
 حاجی صاحب مذکورہ اشعار میں غفلت میں عمر بسر کرنے پر نفس کو تنبیہ کر رہے ہیں جس  
 کو سادہ طور پر ہم پسند و نصیحت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایسے اشعار شعریت سے ہٹ کر شعرا  
 کے نزدیک صرف نصیحت بن جاتے ہیں۔ مثلاً غالب کے حسب ذیل اشعار۔  
 نہ سنو گر بُرا کہے کوئی نہ کہو گر بُرا کرے کوئی  
 روک لو گر غلط چلے کوئی بخشد و گر خطا کرے کوئی  
 ان اشعار کو حکیمانہ یا داعظانہ خیال کہا جاسکتا ہے جو اپنی بجائے شعریت سے کہیں بلند  
 ہے۔ بقول اقبال۔

حق اگر سوزی ندارد حکمت است شعری گردد چو سوز از دل گرفت  
 سوز کی مثال اس طرح سمجھئے جیسے کہ میر صاحب کہتے ہیں۔

ہمارے آگے ترا جس کسی نے نام لیا دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا  
 جہاد اکبر کی نظرم مثنوی نامہ فردوسی کے فعلون فو لعن فعلون فعلول کے وزن پر ہے۔ اس  
 مثنوی میں ایک قسم کا مد و جزر ہے اور الفاظ میں شان و شکوہ پایا جاتا ہے جو نفس کے لئے

تازیانہ عبرت ہے اور تنبیہ کے لئے مناسب لب و لہجہ ہے۔ الفاظ سادہ اور بندش اکثر چست ہے۔ مضمون میں بھی تسلسل ہے۔

### غذائے روح ایک نظر میں

اس مثنوی کے مضامین کے متعلق تصنیفات کے سلسلے میں اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ جہاں تک اس تصنیف کی معنویت کا تعلق ہے یہ مثنوی بلند پایہ ہے جس میں عشق حقیقی اور معرفت نورانی کا ذکر ہے اور اس کے ماتحت مختلف قسم کی تمثیلوں اور حکایات سے ترک دنیا اور اختیار آخرت کی تلقین کی گئی ہے، لیکن جہاں تک اس کی نظم کا تعلق ہے وہ دوسری مثنویوں کی برابری نہیں کرتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ قلم پر آ گیا بغیر غور و فکر لکھتے چلے گئے ہیں۔ لیکن اس میں ایسے بھی اشعار ہیں جن کو ہم بغایت بلند کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ حسب ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں انسان کی بوالہوسی کا ذکر کس عمدہ پیرائے میں کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

تھی اک عورت خوبصورت نازنین	سیم تن نازک بدن اور مہ جبین
زلف و رخسار و لب اس کے رشک خور	جس کی الفت میں دل اک عالم کا پور
ایک دن باناز و باصد کبر و فر	ایک کوچے میں ہوا اس کا گذر
اتفاقاً سوختہ دل اک جواں	دیکھ اس کو ہو گیا عاشق بجاں
اس پری کا دیکھ کر حسن و جمال	ہو گیا وہ مثل تصویر خیال
اڑ گئے سب ہوش اور صبر و قرار	ہو گیا وہ محو اندر روئے یار
اس کو یوں مجنون و شیدا دیکھ کر	عشق کا اس کے ہوا زن پر اثر
یوں کہا زن نے اسے اے سادہ رو	حال اپنے کو بیاں کر مجھ سے تو
کیوں کھڑا ہے کس کا تجھ کو دھیان ہے	کس لئے آئینہ ساں حیران ہے

جا یہاں سے دیکھ اپنا کام کر  
کیوں بلا میں پڑتا ہے اے خیرہ سر  
اس جواں نے یوں کہا جان جہاں  
چھوڑ تجھ کو اب بھلا جاؤں کہاں  
عشق تیرا لے گیا اے میری جاں  
ہوش و عقل و صبر اور تاب و تواں  
یہ کہا زن نے اے اے بے خبر  
ہے مری ہمیشہ مجھ سے خوب تر  
حسن میں بہتر ہے مجھ سے لاکھ بار  
جس پہ ہیں شمس و قمر دونوں نثار  
سن کے یہ اور چھوڑ کر اس کو وہ خام  
ہٹ کے پیچھے کو چلا چند ایک گام  
جب لگا جانے تو زن نے دوڑ کر  
دھول ایک منہ پر لگائی جلد تر  
اک طمانچہ اس کے منہ پر مار کر  
یہ لگی کہنے اے اے خیرہ سر  
میری صورت پر اگر عاشق ہے تو  
اپنے اس دعوے میں گر صادق ہے تو  
غیر پر کی کیوں نظر میرے سوا  
ہے یہ دعویٰ عشق کا اے بے حیا  
جو کہ ڈالے غیر پر اپنی نظر  
ہے حقیقت میں وہ مشرک سر بسر  
عاشق حق ہو کے دیکھے غیر کو  
کعبہ میں چاہے بنانا دیر کو  
غیر کو نظروں سے تو اپنی نکال  
چشم دل سے دیکھ پھر حق کا جمال  
جو سوا حق کے ہے دے سب کو جلا  
ایک دلبر سے تو دل اپنا لگا

ان اشعار میں کچھ ایسے ہیں جو صاف، سادہ اور رواں ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جن میں ترتیب الفاظ کے اعتبار سے تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے مثلاً چوتھے شعر کے مصرعے کو ملاحظہ فرمائیے :

یہ مصرع ادنیٰ تأمل اور ترمیم کے اس طرح ہو سکتا تھا :

دیکھ کر اس کو ہوا عاشق بجاں

اسی طرح آٹھویں شعر کا دوسرا مصرع

حال اپنے کو بیاں کر مجھ سے تو





معمولی سی ترمیم کے ساتھ اس طرح ہو سکتا تھا ع  
اپنا حال دل بیاں کر مجھ سے تو  
اسی طرح گیارہویں شعر کا یہ مصرع  
چھوڑ تجھ کو اب چلا جاؤں کہاں  
اس طرح کہا جاسکتا تھا ع

میں تجھے اب چھوڑ کر جاؤں کہاں

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ حاجی صاحب ایسا صاف اور سادہ لکھنے سے عاجز تھے، نہیں ہرگز نہیں، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ وہ شاعری میں کانٹ چھانٹ، خاک دھک اور غور و فکر سے شعر کو صاف اور پاکیزہ بنانے کے تکلفات میں نہ پڑتے تھے۔ ہاں پہلی ہی مرتبہ جو شعر عمدہ سانچے میں ڈھل کر آجائے وہ خوش قسمت ہے۔ مذکورہ بالا مصرعوں کے علاوہ کتنے ایک اشعار ان میں سلیس مربوط اور دلکش ہیں جو صاحبانِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ مثلاً

کیوں کھڑا ہے کس کا تجھ کو دھیان ہے      کس لئے آئینہ ساں حیراں ہے  
جو سوا حق کے ہے، دے سب کو جلا      ایک دلبر سے تو دل اپنا لگا

فارسی شعروں کا اردو اشعار میں ترجمہ

اس مثنوی میں بعض مقامات پر حاجی صاحب نے مولانا روم کی مثنوی کے اشعار درج کئے ہیں اور ان کا اردو ترجمہ اسی وزن میں کیا ہے جس سے ان کی بدیہ گوئی اور بے ساختہ ترجمے کے کمال کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مقام پر دُنیا دار اور طالبِ دُنیا کی مذمت میں مثنوی مولانا روم کے اشعار پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مثنوی میں مولوی معنوی	نکتہ اک فرماتے ہیں سُن اے انی
ترک دُنیا گیر تا سلطان شوی	ورنہ بھجو چرخ سرگرداں شوی
زہر دارد در دروں دُنیا چومار	گرچہ دارد از بروں نقش و نگار



زہرائیں مارِ متش قاتل است      می گریزد ز دہر آں کو عاقل است  
 حبِ دُنیا راسِ کلِ خطیمنہ      ترکِ دُنیا راسِ کلِ عبادۃ  
 اب حاجی صاحب نے مولانا رومی کے مذکورہ اشعار کا جو ترجمہ کیا ہے وہ بھی ملاحظہ کیجئے:

چھوڑ دُنیا کو کہ تا سلطان ہو تو      ورنہ مثلِ چرخِ سرگرداں ہو تو  
 زہرِ قاتل ہے یہ مارِ نقشِ دار      بھاگتے ہیں اس سے جو ہیں ہوشیار  
 حبِ دُنیا سب خطاؤں کا ہے سر      ترکِ دُنیا ہے ہر طاعت کا پر  
 یہ ہے مثنویِ غذائے روح کے متعلق ہماری ذاتی رائے جس کو ہم نے بے لاگ عرض کر دیا ہے، اگرچہ اس مقدس ہستی کے متعلق ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کی ذات شاعرانہ تکلفات سے بلند تھی لیکن کوئی صاحب یہ جواب دینے کی کوشش نہ فرمائیں کہ پھر شعر گفتن چہ ضرور کیوں کہ انہوں نے اپنی شاعری میں بہت سے اچھے اچھے اشعار نکالے ہیں اور اس قسم کی رکاکت سے سودا اور میر کی مثنوی بھری پڑی ہیں۔

### مثنوی تحفۃ العشاق پر ایک نظر

حاجی صاحب کی مثنوی ”تحفۃ العشاق“ ”دردنامہ غمناک“ کی طرح سوز و سازِ عشق سے سوختہ ہے اور اس میں جذبات ابھرا بھر کر عاشق کو جلانے کا کام کرتے ہیں۔ اس مثنوی کے کتنے ایک اشعار ہم نے تصنیفات حاجی صاحب کے عنوان کے ذیل میں درج کئے ہیں جو تمام مثنوی کا خلاصہ ہیں۔ یہاں پر ہم تنقیدی حیثیت سے کچھ کچھ اشعار منتخب کر کے پیش کرتے ہیں جن سے آپ کو اس مثنوی کا شعری مقام معلوم کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

### فراق ضامن شہید

حافظ محمد ضامن علی صاحب کی شہادت کے بعد حاجی صاحب نے ان کی جدائی پر جو نقشہ اشعار میں کھینچا ہے وہ حسب ذیل ہے۔ لکھتے ہیں:



پر نہ دیتا تھا مجھے فرصت زماں      تا لکھوں اس نظم کو باشوق جاں  
لایا اتنے میں زمانہ اور رنگ      ہو گیا کچھ اور ہی عالم کا ڈھنک  
دوسرے شعر میں شاعر نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز زمانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر  
لکھتے ہیں۔

ہو گئے بس حضرت حافظ شہید      شام غم ہم کو ہوا نوروز عید  
خوش نہ آئی اس جہاں کی رنگ و بو      چل دیئے بس جنت الفردوس کو  
ہم بچاروں کو تڑپتا چھوڑ کر      سوئے حق راہی ہوئے منہ موڑ کر  
وصل سے حق کے ہوئے وہ بہرہ ور      پیتے ہیں حسرت سے ہم خونِ جگر  
ناز و نعمت میں ہیں وہ مشغولِ داں      خاک و خون میں لوٹتے ہیں ہم یہاں  
جام کوثر سے ہوئے وہ لب بلب      چانتے ہیں پیاس سے ہم اپنے لب  
آپ تو راحت کے سماں لے گئے      اور ہمیں رنجِ دالم یاں دے گئے  
عیش میں ہم کو دیا بالکل بھلا      حق قربت اور اُلفت سب گیا  
بے خبر ہم سے اگر رہنا تھا یوں      ساتھ اپنے لے گئے ہم کو نہ کیوں  
اور کس قدر حافظ صاحب کے مقام کے سامنے اپنے آپ کو عاجز بنا کر ظاہر کیا ہے اور  
اسی کو ہم ولایت کی نشانی سمجھتے ہیں، لکھتے ہیں۔

گرچہ ہم لائق نہ تھے درگاہ کے      کفشِ برادری میں رہتے شاہ کے  
شاہ کو زیبا ہے کب تنہا روی      گو بہت خادم نہ ہوں تھوڑے سہی

اظہارِ مسرت

ان کے مقامِ شہادت اور اپنی نامرادی پر خیال کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:  
آہِ داویلا درینِ حسرتا      ساتھ والے چل دئے میں رہ گیا  
ساتھ کا اپنے ہر اکِ واصل ہوا      دعا دل کا اسے حاصل ہوا

پہنچا ہر اک منزل مقصود پر      رہ گیا میں ہی پڑا بس دور تر  
صاف تھے جو چل دیئے صاف اور پاک      مثل تلچھٹ رہ گیا میں زیر خاک  
جو کہ نوری تھے گئے افلاک پر      رہ گیا سایہ کی جوں میں خاک پر  
گھر کیا قمری نے شاخ سرو پر      جھاڑ میں لگی ہے چمگادڑ مگر  
ماہی حق نے تولی دریا کی راہ      موش سوراخ زمیں میں ہے تباہ  
مرغ آبی نے کیا دریا میں گھر      مرغ خاکی لوٹتا ہے خاک پر

غرض کہ اسی طرح فی البدیہ اور بے تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار میں حافظ صاحب کے مقام شہادت نے محبت اور جدائی نیز اپنی حرماں نصیبی کا شاعر نے قلق کے ساتھ مگر سادگی میں اظہار کیا ہے۔ اگرچہ ان اشعار کا ایک خاص شہید ہستی کے مقام اور تاریخی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لئے ہم نے انتخاب کیا ہے، لیکن حاجی صاحب کے مذکورہ اشعار اپنی جگہ نہایت صاف اور شستہ ہیں اور بے ساختہ پن لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً

ع      پیتے ہیں حسرت سے ہم خونِ جگر

ع      خاک و خون میں لوٹتے ہیں ہم یہاں

ع      آپ تو راحت کے سماں لے گئے

ع      ساتھ والے چل دئے میں رہ گیا

یا حسب ذیل اشعار۔

جام کوثر سے ہوئے وہ لب لب      چاٹتے ہیں پیاس سے ہم اپنے لب

مرغ آبی نے کیا دریا میں گھر      مرغ خاکی لوٹتا ہے خاک پر

حضرت تحفہ رحمۃ اللہ علیہا کا سراپا

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ اولیائے کرام میں سے ہیں ایک بیمار خانے میں تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں مختلف قسم کے مریض ہیں، ان مریضوں کو دیکھتے دیکھتے ان کی

نظر حضرت تحفہ پر پڑی جو عشقِ حقیقی میں جل کر کباب ہو رہی ہیں۔ ان کی صورت کو دیکھ کر سری سقطیؒ نے جواثر لیا اس کا نقشہ اور سراپا حاجی صاحب اس طرح کھینچتے ہیں۔

تھا اسی میں جو گئی اک سو نظر	دیکھتا کیا ہوں کہ اک رشکِ قمر
تازہ و پاکیزہ رو صاحبِ تمیز	بالباس خوب و زیبا ، اک کنیر
چہرہ اس کا گویا ہے شمعِ حرم	قامت اس کا گلبنِ باغِ ارم
زلف اس کی دامِ راہِ سالکان	لعل لب اس کا ہے جانِ تشنگان
چشم اس کی چشمہ ہے فتنے کا باز	خال اس کا تخمِ شوقِ پاکِ باز
اک طرف بیٹھی ہے جیسے شیر مست	دیکھ کر اس کو ہوئے غم میرے پست
قید میں بھی تھی وہ با صد آب و تاب	کوہ کے اندر ہو جیسے لعلِ ناب
تھیں دو آنکھیں اس کی جوں روشن چراغ	ذوقِ مستی سے کہ تھے اندر دماغ
اس کے رخ کی دیکھ کر یہ آب و تاب	کھاتا تھا تارِ نظر سو بیچ و تاب
اس کو دیکھا میں نے جب با ذوق و شوق	مثلِ قمری ہے گلے میں اس کے طوق
اور بندھے ہیں ہاتھ زنجیروں سے یوں	شاخِ طوبیٰ سے ہو پلٹا سانپ جوں
اور دو مضبوط لوہے کے کڑے	موٹے موٹے اس کے پاؤں میں پڑے
دستِ بریلِ نعمہ خوشِ برزباں	عاشقانہ تھی غزلِ منہ سے عیاں
مجھ کو جب دیکھا تو اس نے اس گھڑی	دی لگا آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی
مثلِ خالہ اشکِ برسانے لگی	روئے گل کو لالہ دکھلانے لگی
پوچھا داروغہ سے جا کر اس کے گھر	کیوں کیا ہے قید یہ یکتا گھر
بولا داروغہ یہ سُن کر اے عزیز	تھی یہ اک مولیٰ کی شائستہ کنیر
ہو گیا اس کو جنوںِ تقدیر سے	اس لئے ہے بند یہ زنجیر سے
اس کے مالک نے کیا بند اس لئے	تاکہ عقل و ہوش آجائے اسے

جب یہ داروغہ سے لوٹتی نے سنا      روپڑی اک بار اور سر کو دھنا  
دردناک اک کھینچ کر کے دل سے آہ      بولی میں ہوں اے عزیز دبے گناہ  
اے مسلمانو! نہیں مجنون میں      اپنے دلبر کی ہوں پر مفتون میں

مذکورہ بالا اشعار ہمیں ایک ایسی وادی کی طرف لے جاتے ہیں جہاں پھول بھی ہیں  
اور کانٹے بھی، جہاں صاف و شفاف پانی بھی ہے اور کہیں گدلا بھی، جہاں نرم نرم سبزہ بھی  
ہے اور خشک تنکے بھی۔ جہاں بہت اچھی اچھی تشبیہات بھی ہیں اور عمدہ استعارے بھی۔  
الحاصل ان کے مذکورہ اشعار میں جوش اور ولولہ بھی پایا جاتا ہے۔ اور کلام میں روانی اور  
قدرت شعری پائی جاتی ہے۔ ہم نے حاجی صاحب کی صنفِ مثنوی پر بقدر ضرورت سب  
کچھ لکھ دیا ہے اس لئے اب ہم ان کے دوسرے اصنافِ سخن کی طرف قارئین کو لئے چلتے  
ہیں۔

## رباعی

رباعی شعری مشہور صنف ہے جس میں کثیر مضامین کو چار مصرعوں میں دریا کو کوزے کی  
طرح بند کر دیا جاتا ہے، حاجی صاحب کے تمام کلام میں ہمیں صرف دو رباعیاں ملی ہیں جن  
میں سے ایک اردو میں ہے اور دوسری فارسی زبان میں۔ اردو کی رباعی گلزارِ معرفت کے  
آخری صفحہ پر درج ہے جو یہ ہے۔

ہے برا اچھا جو سمجھے آپ کو      اور بالا سب سے پہ پہنچے آپ کو  
مردم دیدہ سے سیکھ امداد تو      سب کو دیکھے اور نہ دیکھے آپ کو

بلاشبہ یہ رباعی شیخ عبداللہ انصاری درویشِ کامل کی حسب ذیل رباعی کا کامیاب ترجمہ  
ہے۔ رباعی یہ ہے۔

عیب است بزرگ بر کشیدن خود را      وز جملہ خلق برگزیدن خود را  
از مردم دیدہ باید آموخت      دیدن ہمہ کس را و ندیدن خود را

دوسری رباعی فارسی زبان میں نالہ امداد غریب کے اول میں جہادِ اکبر کے آخر میں درج ہے جو یہ ہے۔

اے ذات تو بارِ رحمت والِ طافِ قریب دے رحمت و لطف بمناجات مجیب  
اکنوں بطفیل احمد دیارِ انش مقبول شود نالہ امداد غریب

### مثلث و مخمس

مثلث و مخمس کا نمونہ اس سے پہلے دیا جا چکا ہے مثلث میں شجرہ چشتیہ ہے اور مخمس میانجی نور محمد صاحب کی شان میں لکھا گیا ہے۔

### تضمین

حاجی صاحب نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشہور مناجات پر جو جوڑ لگا کر مخمس بنا دیا ہے اس کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

کر سکے گا کیا کوئی وحدت میں تیری قیل و قال عقل و بحث و علت و معلول ہیں زار و علیل  
انت کافی فی مهمات و فی رزقِ کفیل خذ بلفطک یا الہی من لہ زادِ قلیل

مفلس بالصّدقِ یاتی عند بابک یا جلیل

خود بخود ہو جائیگے یہ درد سارے دل سے دور جتنے مقصد ہیں بر آئیں گے الہی بالضرور  
یہ تڑپ یہ بے قراری، فکر بے جا ہے قصور انت شافی انت کافی فی مهمات الامور

انت حسبی انت ربی انت لی نعم الوکیل

مذکورہ بالا تضمین سے حاجی صاحب کی قوت شعری اور قدرتِ سخن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دوسروں کے اشعار اور مطالب کے ساتھ جوڑ لگانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پہلی رباعی کا تیسرا مصرعہ عربی زبانی میں ہے جس سے ان کی شاعری کا ایک نمونہ مل گیا ہے۔

## نعت و حمد اور مناجات

حاجی صاحب کے کلام میں حمد، نعت اور مناجات کے اشعار ان کی ہر ایک منظوم تصنیف میں پائے جاتے ہیں گویا ان کی شاعری کا ایک خاص حصہ حمد و نعت اور مناجات سے مزین ہے۔ حمد و نعت صنف شعر میں کوئی صنف تو نہیں البتہ ایسی شاعری اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔ ہم نے ابتدائے کتاب میں موصوف کی حمد و نعت پیش کی ہیں وہاں آپ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

## تاریخی مادے

حاجی صاحب کو تاریخی مادوں میں بھی اچھا خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ مجھے اس سلسلے میں ان کے لکھے ہوئے دو تاریخی مادے دستیاب ہو سکے۔ ایک شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اور دوسرا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا، شاہ عبدالغنی صاحب کا مادہ تاریخی یہ ہے۔

عالم و عارف شہ عبدالغنی کرد چوں جملہ مراتب عمر طے  
ایں ندا آمد زہر سو غم فزا داد جاں عبدالغنی با جلوہ حے  
دوسرا مادہ تاریخ مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی کا یہ ہے۔

بست و ہشتم ذیقعدہ کو چل دیئے جنت کو یعقوب  
روکے کہا سب نے کہ جہاں سے ماہ ہدیٰ ہوا آہ غروب

## غزل

صنف شعر میں دراصل غزل سب سے زیادہ اہم صنف ہے اس میں شاعر کا کامیاب ہو کر نکلنا اس کی شاعری کا خاص معیار ہے۔ ہمارے خیال میں غزل میں حاجی صاحب دیگر اصناف کی بہ نسبت زیادہ کمال رکھتے ہیں۔ ان کی چند ایک غزلیں اور نعتیہ کلام گلزارِ معرفت میں موجود ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کی شاعری کا مقام معلوم کرنے کے لئے ان کی ان



غزلوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور پھر ان کی شاعری کا اندازہ لگانا چاہئے۔ لہذا ہم ان کی غزلوں کا انتخاب گلزارِ معرفت سے پیش کرتے ہیں:-

## غزل

عرش بریں پہ آپ ہیں زیرِ زمین ہوں میں      ملنا کہاں سے ہو کہ کہیں تم کہیں ہوں میں  
گر تحت حسن و ناز پہ ہیں آپ جلوہ گر      اقلیمِ عشق میں شہِ مسند نشین ہوں میں  
مثلِ نظر ہے آپ کا آنکھوں میں میر گھر      باوصف ایسے قرب کے بس دور ہیں ہوں میں  
اے دوائے بد نصیبی کہ ملنا نہیں نصیب      سائے کی طرح گرچہ جہاں تم وہیں ہوں میں  
رہ تیری تکتے تکتے دم آنکھوں میں آگیا      آجا نظر کہیں کہ دم واپس ہوں میں

دامِ بلا میں کس کے تو امداد جا پھنسا

مدت سے جو پتہ ترا پاتا نہیں ہوں میں

یہ غزل فنِ شاعری کے معیار پر حاجی صاحب کی بہترین غزل قرار دی جاسکتی ہے جس میں درد و سوز، پُختی، برجستگی و تخیل سب ہی کچھ موجود ہے۔ ایک اور غزل ملاحظہ فرمائیے۔

رخ سے کا کُل اٹھا دیا کس نے      رات میں دِن دکھا دیا کس نے  
نغمہٴ سرمدی سنا کے ہمیں      مست بے خود بنا دیا کس نے  
شعلہٴ رُخ دکھا کے اپنا ہمیں      سر سے پا تک جلادیا کس نے  
میں تو نام و نشان مٹا بیٹھا      میرا چرچا اڑا دیا کس نے  
ہنستے ہنستے جو دم میں رونے لگی      شمع تجھ کو جلادیا کس نے

خُسن لیلیٰ دکھا کے اے امداد

تجھ کو مجنون بنا دیا کس نے

اس غزل کے اشعار کس قدر رواں، پر شکوہ، مربوط اور فصیح ہیں کہ صاف ذوق کو پڑھ کر

لطف محسوس ہوتا ہے۔

## متقابل اور متضاد الخیالی

ایک غزل میں آپ نے اقبال کی طرح متضاد صفات کا نقشہ اپنی ذات میں کھینچا ہے۔  
اقبال صاحب تو لکھتے ہیں۔

ہے عجب مجموعہٴ اضداد اے اقبال تو رونق ہنگامہٴ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے  
تیرے ہنگاموں کے دیوانہ رنگیں بیاں زینت گلشن بھی ہے آراکش صحرا بھی ہے  
غرض کہ ”عاشق ہر جاتی“ کے عنوان کے ماتحت بانگ درا میں اقبال نے اپنے اندر  
بہت سی متضاد صفتیں جمع کی ہیں۔ حاجی صاحب کے متضاد الصفات ہونے کا رنگ بھی  
دیکھیے:

## غزل

باغ عالم میں ہیں باہ و فغاں آزاد ہم      آپ ہی قمری ہیں اور ہیں آپ ہی شمشاد ہم  
داغِ دل گلشن ہے اپنا مرغِ دل سے نالہ گیر      آپ ہی ہم گل ہیں اور ہیں بلبلِ ناشاد ہم  
عشق کے صحرا میں آپنا آپ کرتے ہیں شکار      آپ ہی ہم صید ہیں اور آپ ہی صیاد ہم  
ہو گئے جب محوِ دلبر عشق پھر کس کا رہا      آپ ہی شیریں ہوئے اور آپ ہی فرہار ہم  
قتل اپنے آپ کو کرتے ہیں بے تیغ و تبر      آپ ہی مقتول ہیں اور آپ ہی جلاذ ہم  
آپ ہی اچھے ہیں اور ہیں آپ ہی سب سے برے      الغرض جو کچھ ہیں پر ہیں جامعِ اضداد ہم  
بے نشان نام ہیں، دیشاں ہیں اور ہیں نامور      جو کہو سب کچھ ہیں پھر ناچیز بے بنیاد ہم  
علم اپنا جہل ہے اور جہل اپنا علم ہے      ہیں اسی دانش سے یارو صاحب ارشاد ہم  
اپنے دشمن آپ ہیں اور آپ ہی اپنے دوست      آپ کو کرتے ہیں : بیاں تاکہ ہوں آباد ہم

ہے بہار ہم کو خزاں میں اور خزاں اندر بہار

غم ہے شادی میں ہمیں اور غم میں ہیں بس شاد ہم

مذکورہ غزل میں قمری و شمشاد، گل و بلبل، صید اور صیاد، شیریں فرہاد، مقتول و جلاد، دشمن و دوست، آباد و ویران متقابل صفات و کیفیات کو اس طرح جمع کیا ہے کہ ہر ایک شان، تقابل کے باوجود شاعر نے حسن اسلوب سے اپنے اندر پیدا کر کے ثابت کی ہے۔

اب ایک دو غزلیں جن میں سے ایک حمدیہ اور دوسری مختلف خیالات کا مجموعہ ہے اور ملاحظہ کیجئے:

## حمدیہ غزل

الہی یہ عالم ہے گلزار تیرا      عجب نقش قدرت نمودار تیرا  
خوشی غم میں رکھی ہے اور غم خوشی میں      عجب تیری قدرت عجب کار تیرا  
الہی عطا ذرہ دردِ دل ہو      کہ مرتا ہے بے درد بیمار تیرا  
کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ چاہتا ہے      میں تجھ سے ہوں یارب طلبگار تیرا  
نہیں دونوں عالم سے کچھ مجھ کو مطلب      تو مطلوب میں ہوں طلبگار تیرا

اٹھا غم، رکھ امید، امداد حق سے  
تجھے غم ہے کیا رب ہے غم خوار تیرا

## غزل

نہ دیکھا داغِ دل گلزار کو دیکھا تو کیا دیکھا      نہ دیکھا خار میں گل، خار کو دیکھا تو کیا دیکھا  
تماشائے دو عالم ہے مرے دلدار کا کوچہ      جہاں کے گلشن و بازار کو دیکھا تو کیا دیکھا  
نہ دیکھا برشِ تیغِ نگاہ یار کو تم نے      اگر شمشیر کی اک دھار کو دیکھا تو کیا دیکھا  
نہ دیکھا ایک بھی تم نے اگر داغِ جدائی کو      فلک سے گرچہ لاکھ آزاد کو دیکھا تو کیا دیکھا  
نظر جب کھل گئی اپنی جسے دیکھا اسے دیکھا      نہ دیکھا آپ میں دلدار کو دیکھا تو کیا دیکھا  
اسے دیکھا اُسے دیکھا نہ یہ دیکھا نہ وہ دیکھا      نہ دیکھا ایک کو اغیار کو دیکھا تو کیا دیکھا

ہمارے شعر امدادِ الہی سے ہیں نک دیکھو

اگرچہ دفتر اشعار کو دیکھا تو کیا دیکھا

حاجی صاحب کی مذکورہ غزلوں کو پڑھئے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان غزلوں کو پڑھ کر آپ بھی اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان غزلوں کا انتخاب جس شاعر کا کلام ہو اس میں شاعرانہ استعداد کتنی پختہ اور رواں ہے، حاجی صاحب کی مذکورہ غزلیں ہمارے خیال میں زبان کی صفائی، بندش کی چستی، خیال کی بلندی اور جذبات کی پاکیزگی کا اچھا خاصہ نمونہ ہیں۔ اور سب غزلوں اور مثنویوں میں معرفت کا رنگ ہے۔ حاجی صاحب اپنے اشعار پر خود بھی ناز کرتے نظر آتے ہیں، چنانچہ آخری غزل کا مقطع ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں۔

ہمارے شعر امدادِ الہی سے ہیں نک دیکھو      اگرچہ دفتر اشعار کو دیکھا تو کیا دیکھا

اسی قدر تبصرے پر ہم ان کی اردو شاعری کی بحث ختم کرتے ہیں اور ان کی اردو نثر کی طرف چلتے ہیں۔



## اُردو نثر

آپ کی اُردو نثر کا جو کچھ ذخیرہ ہمارے سامنے ہے وہ لے دے کر ایک رسالہ ارشادِ مرشد اکیس صفحوں کا ہے یا خطوط ہیں جو مختلف دوستوں اور مریدوں کے نام ہیں یا ”فیصلہ ہفت مسئلہ“ ہے جو بارہ صفحات کا ہے۔ اسی مختصر سامان نثر سے اردو کے کچھ نمونے پیش کئے جاسکیں گیں۔ اور ان میں سے بھی خاص طور پر اُردو خطوط کے۔

### خط نویسی

خط نویسی اپنی جگہ اُردو نثر کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ غالب کو اردو نثر نگاری میں اس کے خطوط نے وہ مقام بخشا ہے جو اس کے منتخبہ دیوان اردو نے اسے شاعری میں عطا کیا ہے۔ خط نویسی کسی ادیب اور شاعر کی نثر کا اصلی نمونہ اس لئے بھی ہوتا ہے کہ وہ ان خطوط میں اپنی سادگی کو پیش نظر رکھتا ہے اور اپنے پرائیویٹ معاملات کو بے تکلفی سے لکھتا ہے۔ وہاں تکلف اور بناوٹ کا دخل نہیں ہوتا اس لئے اگر کسی کے ادبی نمونوں کو دیکھنا ہو تو اس کے پرائیویٹ خطوط کو دیکھنا چاہئے۔

ایک مضمون نگار جب کسی مضمون کو لکھتا ہے تو اس کو یہ پورا احساس ہوتا ہے کہ اس کا یہ مضمون دوسروں کی نظروں کے سامنے سے بھی گزرے گا اس لئے حتی المقدور وہ اس کو عمدہ اور اچھا بنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن پرائیویٹ خطوط میں وہ اس قسم کی احتیاط پر کبھی دھیان نہیں دیتا، لہذا اصلیت کے ساتھ جو کچھ خطوط میں لکھتا ہے وہ اس کی زبان اور بیان کا صحیح مرقع ہوتا ہے، ان امور کے پیش نظر ہم پہلے حاجی صاحب کے بعض اردو خطوط پیش کرتے

مکتوبات حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ  
بنام: حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

از فقیر امداد اللہ عنہ

بخدمت فیہد رجت سراپا خیر و برکت عارف باللہ جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب زاد عرفانہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ فقیر خیریت سے ہے اور آپ کی صحت و سلامتی خدا تعالیٰ کی جناب سے مطلوب۔  
قبل ازیں آپ کی خدمت میں اپنی خیریت و کیفیت تحریر ہو چکی۔ ان شاء اللہ خط پہنچا ہوگا۔  
روز بروز ضعف زیادہ ہوتا جاتا ہے اور دل بہت گھبراتا رہتا ہے۔ آپ دُعا ئے حسن خاتمہ  
فرمائیں۔

عزیزم مولوی قاری حافظ احمد صاحب مکی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے، آپ  
اپنی جماعت سے خیال کر کے دُعا فرمادیں، یہ قاری صاحب آپ سے طالب دُعا ہیں، آپ  
دُعا فرمائیں اللہ تعالیٰ ہمارا آپ کا حسن خاتمہ فرمادے۔ آمین

(مہر) از مکہ مکرمہ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ

(مکاتیب رشیدیہ ۵)

مجی و مخلصی عزیزم مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہ!

بعد سلام سنت الاسلام آنکہ خط آپ کا پہنچا۔ جواب پہلے خط کا ارسال کر دیا گیا

تھا۔ فقیر کو ضعف و نقاہت بہت ہے، نگاہ بھی بہت کم ہو گئی ہے، خط کے لکھنے پڑھنے سے معذور ہے، چارپائی پر نماز پڑھتا ہے، پیروں سے کھڑا نہیں ہوا جاتا ہے، غرض پابرکاب ہے، سب وجہ سے دُعا کا محتاج ہے کہ اللہ تعالیٰ خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین

بابت مسافر خانے کے جو قریب پانچ سو اشرفی کے جمع تھیں مولوی بدرالاسلام کے سپرد کئے گئے ہیں، باغوائے مخالفین کے حکام نے ضبط کر لیں، فقیر تو پہلے ہی ایسے معاملات سے دست بردار تھا، حافظ صاحب مرحوم کے انتقال سے اچانک یہ معاملہ آن پڑا، پھر بھی فقیر نے اُس کی طرف التفات نہیں کیا، جو کچھ اُن کا روپیہ تھا اُن کے سالے احمد گاما کے حوالے کیا گیا، مسافر خانہ کے ساتھ بھی علاقہ نہ رکھا، اُس کا ناظر مولوی بدرالاسلام صاحب کو کر دیا گیا تھا، یہ سب منجانب اللہ ہے۔ فقیر دونوں حال میں خوش ہے، ایسے امورات کے سننے سے بھی دل کو پریشانی بعض اوقات ہو جاتی ہے، لہذا ایسے امور کے تذکرہ سے یہاں احباب کو منع کر دیا ہے کہ فقیر سیئہ ذکر نہ ہوا کرے۔<sup>(۱)</sup>

الْعبد الضعیف فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ

(مکاتیب رشیدیہ ص: ۸)

ہم نے اردو نثر کے نمونے میں یہ دو خط پیش کئے ہیں جن سے قاری صاحب کے نثری انداز کا جائزہ لے سکتا ہے، لیکن خطوط اور تصنیف یا مضمون کی عبارت میں فرق ضرور ہوتا ہے اس لئے ارشادِ مرشد سے ایک قطعہ نثر پیش کرتے ہیں۔

مراقبہ کا طریقہ

طریقہ مراقبہ کا یہ ہے کہ دوزانو نمازی کی طرح سر جھکا کے بیٹھے اور دل کو غیر اللہ سے خالی کر کے حق سبحانہ تعالیٰ کی حضوری میں حاضر رکھے۔ اول اَعُوذُ بِاللّٰہِ اور بِسْمِ اللّٰہِ پڑھ کے

(۱) حاجی صاحب کے بھتیجے حافظ احمد حسن تھے، جن کی شادی انبالے کے گاما والوں میں ہوئی تھی۔ حافظ صاحب کے انتقال کے بعد ان کی متروکہ جائیداد کے متعلق ارشاد ہے۔

تین بار اَللّٰهُ حَاضِرِی، اَللّٰهُ نَاضِرِی، اَللّٰهُ مَعِی یعنی زبان سے تکرار کر کے پھر مراقب ہو کے ان کے معنوں کا دل میں ملاحظہ کرے اور تصور کرے۔ یعنی جانے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ حاضر ناظر میرے پاس ہے۔ اس جاننے میں اس قدر خوض کرے اور مستغرق ہو کہ شعور غیر حق کا نہ رہے۔ یہاں تک کہ اپنی بھی خبر نہ رہے۔ اگر ایک آن بھی اس سے غافل ہو تو مراقبہ نہ ہوگا۔ (ارشادِ مرشد ص: ۷)

خطوط کی نثر اور اس قطعہ نثر میں آپ نمایاں فرق محسوس کریں گے۔ ہمارے خیال میں حاجی صاحب کے خطوط کی نثر ان کی تصنیفی نثر سے زیادہ صاف معلوم ہوتی ہے۔ اردو نثر پر قدرے تبصرے کے بعد ہم فارسی کی طرف قارئین کو لئے چلتے ہیں۔

## فارسی ادب

حاجی صاحب نے جس دور میں زندگی کے سانس لئے ہیں وہ سلطنتِ مغلیہ کا آخری دور تھا۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفر کا عہد اچھی طرح دیکھا ہے۔ دہلی اکثر آنا جانا رہا ہے۔ اگرچہ عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سلطنتِ مغلیہ زوال کی طرف جا رہی تھی، اسی طرح حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کو بھی انحطاط ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود پوری انیسویں صدی پر فارسی چھائی رہی۔ نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو اور سکھوں کی علمی زبان فارسی تھی۔ خاص طور پر کاسیتھوں کے یہاں تو فارسی کی کافی قدر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ الناس علی دینِ ملوکھم (لوگ بادشاہوں کے طور طریق پر ہوا کرتے ہیں) کے مطابق ہندوستان میں تمام قومیں فارسی لگھتی اور پڑھتی تھیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اگرچہ فارسی دم توڑ رہی تھی لیکن پھر بھی گلستان، بوستان اور سکندر نامہ کا پڑھا ہوا شخص معیاری قابلیت کا نمونہ سمجھا جاتا تھا۔

غالب جس نے اردو خطوط کے باعث انشا نگاری میں امامت کا مقام حاصل کیا





۱۸۵۷ء سے پہلے اردو میں خط لکھنا کسر شان سمجھتا تھا۔ اسی طرح فارسی میں شعرو سخن کو علمی درجہ حاصل تھا۔ حاجی صاحب کا دور خواہ کچھ بھی ہو فارسی کا ہی دور تھا اس لئے ان کے زیادہ تر خطوط فارسی میں آج بھی موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی نظموں کا ذخیرہ اردو میں ہے لیکن نثر کا زیادہ تر حصہ فارسی کا ہے۔ ان کی نثری تصانیف میں جو معرکہ آراء کتاب ہے وہ ضیاء القلوب ہے جو فارسی زبان میں ہے اور جس میں تصوف کے اعلیٰ مضامین کو مختصر عبارت میں بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں رسالہ ”وحدت الوجود“ جو دقیق علمی مسئلہ پر مشتمل ہے وہ بھی فارسی زبان میں ہے۔

اس وقت میرے سامنے جو فارسی تحریروں کا مجموعہ ہے وہ اسی قدر ہے۔ ان دونوں رسالوں کے سوا ”امداد المشتاق“ کے آخر میں جو ان کے خطوط ”مرقومات امدادیہ“ کے نام سے چھپے ہوئے ہیں ایک خط کے سوا کہ اردو میں ہے باقی ساٹھ خط فارسی زبان میں ہیں۔ یہ خط اردو خطوط سے کہیں زیادہ معیاری ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو جو آپ نے خطوط تحریر فرمائے تھے کچھ تو مرقومات امدادیہ میں ہیں اور ایک فارسی خط مکتوبات رشیدیہ میں درج ہے۔ ان خطوط کے علاوہ ایک اور خطوط کا مجموعہ ہے جو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہیں اور جو طبع ہو چکا تھا۔ بہر حال حاجی صاحب کے فارسی مکاتیب زبان اور معنی دونوں حیثیت سے معیاری خطوط ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل خط ذوق خاطر کے لئے پیش خدمت ہے۔



## بنام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب و حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب

از کترین خلائق مسکلی بہ امداد اللہ عفا اللہ عنہ

بخدمت بابرکت عالم عامل عزیزم مولوی محمد قاسم و مولوی محمد یعقوب صاحب  
دام شغلكم باللہ۔ بعد سلام مسنون و اشتیاق مشحون مشہود رائے عزیز باد۔ مکتوب  
مع پارچہ کھیس یکے مورخہ ۲۶ جمادی الثانی و دیگر مورخہ ۲۲ رثوال رسیدند۔ از  
مندرجہ آنها آگاہی یافتم از انتقال عزیز شیخ احمد دیوبندی مرحوم رنج گردید  
خداوند تعالیٰ مغفرتش کند برائے او طواف و دعائے مغفرت کردہ شد قبول باد و نیز  
از دریافت نکاح<sup>(۱)</sup> ثانی عزیزہ ام ہمشیرہ مولوی محمد قاسم محسن تدبیر دسعی مولوی  
صاحب موصوف و آن عزیز خیلے فرحت ہا اندوختم کہ بقلم نمی گنجد و بے اختیار  
دعائے خیر بحق آل عزیزاں و غیرہ و نہال احمد درخور دار ضیا احمد از تہ دل بری

(۱) ہندوستان میں مسلمان شرفا کے خاندانوں میں بھی نکاح بیوگان کو نہایت ہی معیوب سمجھا جاتا تھا۔  
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس خلاف سنت اور کفار کی رسم کو توڑنے کے لئے سخت  
جہاد کیا۔ آپ نے اپنی کسی تقریر میں حسب عادت نکاح بیوگان کی نصیحت فرمائی تو کسی نے طعنے کے طور پر  
کہا کہ پہلے اپنی بیوہ بہن کا تو نکاح کر دو۔ یہ سن کر آپ بہن کی خدمت میں تشریف لے گئے حالانکہ وہ  
بوزحیٰ اور جوان اولاد والی تھیں، لیکن آپ نے عرض کیا کہ آپ کی وجہ سے ایک سنت رسول اللہ زندہ ہوتی  
ہے انہوں نے قبول کر لیا اور شیخ نہال احمد دیوبندی سے نکاح پڑھایا گیا۔ حاجی صاحب اسی نکاح کے  
متعلق اس خط میں خوشی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ (منصف)

آید۔ خدا تعالیٰ آلِ عزیزاں را دامِ بر طریقِ شریعت و رضا مندی خود مستقیم و مستقیم دارد و از نورِ ہدایت شما عالم را منور گرداند۔ و از تمامی نعمائے عرفانی و کمالاتِ قربتِ خود شرف سازد آمین۔

و از اجرائے مدرسہ علمِ دینِ بسعی آلِ عزیزاں و عزیزم حافظ عابد حسین صاحبِ چہ خوشبہارِ دہ نمود کہ بہ بیانِ نمی آید۔ خدائے تعالیٰ ایں امرِ خیر را جزائے خیر دہاد و آلِ عزیزاں را باید کہ نفعِ رسانی را در امورِ دینِ مثلِ وعظ و پند و ارشاد و تلقینِ برہمہ امورِ مقدم دارند و اوقاتِ خود را دریں صرف سازند زیرا کہ دینِ اسلام بسیار ضعیف گردیدہ و مددگارِ انہماں کیاب شدہ و اگر طالبِ صادق باشد یا کاذب اگر پیشِ آید کسرِ نفسی را بر طاقِ نہادہ باد مشغول شوند۔ خدائے تعالیٰ ہادی مطلق است ہدایتِ خواہد نمود و نیز بحکم

”دلِ بیار و دستِ بکار“

مشغولیِ باطن را از دستِ نہ ہند و اگر مناسب دانند و در رائے آلِ عزیزاں آید نسخہ ”ضیاء القلوب“ را نزد مولوی عبدالحکیم صاحبِ برادر شیخ الہی بخش ٹھیکہ دار میرٹھ بفریستند کہ اوشاں طبعِ خواہند کنانید چہ کہ خطِ اوشاں نزدِ احقر آمدہ بود بایں مضمون کہ:

”نسخہ مذکور نزدِ م بفریستند حسبِ مرضی تو یعنی احقر طبعِ کنانید نزدِ

مولوی محمد قاسم و مولوی رشید احمد صاحبِ وغیرہ خواہم فرستاد

اوشاں را اختیار است ہر کہ را اہلِ خواہند دانست خواہند داد۔“

اگر ایں صورتِ ظہور کرد مولوی محمد قاسم صاحبِ بشرطیکہ بیچِ حرج و تکلیف نہ شود خود میرٹھ رفتہ در پیشِ نظر خویش بصحتِ تمام معِ تشیہ و غیرہ در مطبعِ مثنیٰ ممتاز علی صاحبِ طبعِ کنانند۔ و در رسالہ مذکور ہر جا کہ الفاظِ غیر مربوط باشند و عبارتِ خراب باشد اصلاح دہند و ادب را یکسو نہند و الامرفوق الادب را پیشِ گیرند و نیز

یقین است کہ پرچہ شجرہ ہارنشی صاحب در ذیل رسالہ طبع خواہند نمود و ہم باید دانست کہ حضرت مرشد میناجیو (نور محمد) صاحب قدس سرہ را انتساب است از سید صاحب بلا واسطہ حاجی صاحب قدس سرہ پس نام حضرت میانجی صاحب بعد نام سید صاحب بنویند و حاجی صاحب را انتساب از شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ بواسطہ سید صاحب نیز در شجرہ سہروردیہ از خاندان شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ ہمیں قدر رسید کہ شیخ عظیم اللہ اکبر آبادی عن ابیہ عن جد و نام پدر و جدشان معلوم نیست۔ شاہ ہم بایں طور بنو سید و شجرہ مداریہ و قلندر یہ شاید کہ بسو نہ نوشتہ ام شاہ بنو سید و اگر فراغ باشد بعد نماز صبح و یا مغرب و یا عشاء علیحدہ در حجرہ وغیرہ بہ نشینند و دل را از جمیع خیالات خالی کردہ متوجہ بایں جانب شوند و تصور کنند کہ گویا پیش شیخ خود نشستہ ام و فیضان الہی از سینہ او بسینہ ام می آید بایں حیثیت اگر دل بچسپد ذوق و شوق دست دہد فیہا والا ذکر نفی و اثبات بجز متوسط مشغول باشند۔ یک دو ساعت کم و زیادہ مشغول دارند۔

و مولوی عبدالرحمن خلف الرشید مولوی احمد علی صاحب را حسب درخواست شان غائبانہ بیعت گرفتہ داخل سلسلہ بزرگان خود کردہ شد خدا تعالی قبول کند و از فیضان بزرگان سلسلہ مشرف سازد آمین۔ و او شان را بعد سلام، دعائے خیر فرمودہ گویند کہ مولوی محمد قاسم صاحب و مولوی محمد یعقوب صاحب را بجائے فقیر دانستہ از خدمت شان فیضیاب بودہ باشند۔ اگر در مقدراست از فقیر نیز ملاقات خواہد شد۔ و بخت برادر شان نیز دعا کردہ شد انشاء اللہ تعالی او شان بصلاحیت خواہند آمد۔ و فکر ارسال مظاہر حق نہ کنند درینو لا چنداں حاجت نیست مگر پنج شش جلد قرآن شریف مترجم کہ بر حاشیہ اش تفسیر عبد اللہ بن عباس مطبوع گردیدہ از ہنشی صاحب گفتہ ضرور ارسال فرمایند۔ قیمت آنها کہ از مطبع

برآمدہ بزرگarend کہ درایں جا چند اشخاص بسیار شائق اند و قیمت آنہا می دادند مگر من نہ گرفتم و گفتم کہ بروقت آمدن جلد ہائے قرآن شریف گرفتہ فرستادہ خواہد شد۔

وآنکہ در مقدمہ تالیف رسالہ دیگر بطور نصائح بیان عقائد و طرق مسلم بزرگاں ایماء رفتہ بود عزیز من دریں مقدمہ کتب بسیار اند مثل آداب المریدین وغیرہ۔ دیگر آنکہ فقیر بے علم است درین امر جرأت نمی شود مگر چون مولوی محمد قاسم دریں امر تحریر نماید یا آں عزیز انشاء اللہ خواہد شد۔ موافق مرضی فقیر و مولوی رشید احمد صاحب نیز شریک خواہند شد و حال انتقال مولوی محبت اللہ پانی پتی از تحریر سابق معلوم بودہ باشد کہ وقت مراجعت از مدینہ منورہ از دست بدواں شہید شدند انا للہ وانا الیہ راجعون بخمدت عزیز جانم مولوی قاسم صاحب مکرر آنکہ بہ ہمیشہ خود بر خوردار ضیاء احمد را بعد سلام و دعائے خیر گفتہ دہند کہ ایں احقر را از ین عمل خیر شما بسیار فرحت و نمود خداے تعالی جزائے خیر دہد و از تمامی نعمائے دینی و دنیوی مشرف کناد و بخمدت بھائی صاحب مکرم و معظم جناب شیخ اسد علی صاحب سلمہ بعد سلام نیاز مبارک باد، اللہ تعالی آں جناب را توفیق اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم دہاد امید قوی ست کہ ہمیں عمل خیر و وسیلہ نجات جناب شود عجب نیست۔ و شکر کنند کہ خدا تعالی شمارا یک ولی کامل عطا فرمودہ کہ ببرکت اناس و ایں چنین اعمال نیک و رضامندی اللہ و رسول بظہور آمد والا ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند۔

عزیز جانم چار خط شاد و مورخہ جمادی الثانی ۱۲۸۳ھ بروقت آمدن از مدینہ منورہ وصول یافتم و یک مورخہ ۲۱ ر شوال و دیگر مرقومہ ۴ رذیقعدہ رسید از مطالعہ آنہا مسرتہا اند و ختم و از جواب ہر یک علیحدہ علیحدہ بسبب بے قابو بودن دست معذورم معاف دارند۔ و رسید مبلغان از حاجی بوعلی بخش صاحب رسید خاطر جمع



دارند۔

مولوی ذوالفقار علی صاحب داخل سلسلہ بزرگان شدند مگر بسبب عدم فرصت و کم قیام و سفر مدینہ منورہ وغیرہ ہیچ کردن نتوانستند۔ لہذا بآئینہ حوالہ کردہ می آیند۔ بر حال شاں توجہ مرعی دارند و از تعلیم و تلقین دریغ ندارند و ہر کس کہ طالب حق اند کاذب باشند یا صادق از و انکار نکنند بادمشغول شوند بعونہ تعالیٰ صدق شاں بر کذب شاں غالب خواهد شد۔ اگر در مقدر است ہدایت خواهند یافت۔ فقط از حال عزیز از جان حافظ احمد حسین برنگارند کہ او دریں سال ہیچ حال نہ نوشتہ است معلوم شد کہ بر تحریر میں کہ او را بطور نصائح نوشتہ بود خفا شد و ہیچ از حال خود و اہل و عیال نہ نوشتہ است خیر او داند مراصلہ رحمی ضرور است، عزیزاں و اقربایاں را سلام فقط۔ (مرقومات امدادیہ ص: ۲۳۷ تا ۲۵۳)

ترجمہ :

کمترین خلائق امداد اللہ عفا اللہ عنہ سے بخدمت بابرکت عالم عامل عزیزم مولوی محمد قاسم و مولوی محمد یعقوب صاحب دام شغلکم باللہ۔ بعد سلام مسنون و اشتیاق مشغون مشہود رائے عزیز ہو۔ ایک مکتوب مع پارچہ کھیس مورخہ ۲۶ جمادی الثانی اور دوسرا مورخہ ۲۲ شوال پہنچا۔ مندرجہ احوال سے آگاہی ہوئی، عزیز شیخ احمد دیوبندی مرحوم کے انتقال سے رنج ہوا۔ خداوند تعالیٰ اس کی مغفرت کرے اس کے لئے طواف کیا گیا اور مغفرت کی دعا بھی قبول ہو۔ اور مولوی محمد قاسم کی ہمشیرہ کا دوسرا نکاح ان کے حسن تدبیر اور تمہاری اور ان کی کوشش سے مجھے بہت خوشیاں حاصل ہوئیں کہ احاطہ قلم سے باہر ہیں اور تم عزیزوں کے حق میں بے اختیار دعائے خیر اور نہال احمد اور برخوردار ضیا احمد کے لئے بھی دل کی گہرائی سے نکلتی ہے۔ خداوند تعالیٰ تم عزیزوں کو ہمیشہ اپنی

رضامندی اور شریعت پر قائم اور دائم رکھے اور تمہارے نور ہدایت سے عالم کو روشن کرے۔ اور اپنی قربت کے کمالات اور عرفانی نعمتوں سے عزت بخشے آمین۔

اور تم عزیزوں اور عزیزم حافظ عابد حسین صاحب کی کوششوں سے دینی مدرسے کے اجراء سے استعداد خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کار خیر کو ہمیشہ جاری رکھے اور اس کے کوشش کرنے والوں اور شوق دلانے والوں کو جزائے خیر دے۔ اور آپ عزیزوں کو چاہئے کہ امور دین کے ذریعہ نفع رسانی مثلاً وعظ، نصیحت اور ارشاد و تلقین کو تمام کاموں پر مقدم سمجھیں اور اپنے اوقات کو ان کاموں میں صرف کریں۔ کیوں کہ دین اسلام بہت کمزور ہو گیا ہے اور اس کے مددگار نایاب ہو گئے ہیں۔ اور اگر کوئی طالب صادق یا کاذب ہی کیوں نہ ہو پاس آئے تو انکساری کو بالائے طاق رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوں۔ ہادی مطلق تو اللہ تعالیٰ ہے وہ ہدایت کرے گا اور

”دل بیار و دست بکار“

کے مطابق باطنی مصروفیت کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اگر مناسب سمجھیں اور تم عزیزوں کی رائے ہو ”ضیاء القلوب“ کا نسخہ مولوی عبدالحکیم صاحب کے پاس جو کہ شیخ الہی بخش ٹھیکیدار کے بھائی ہیں میرٹھ بھیج دیں کہ وہ طبع کرائیں گے کیوں کہ ان کا خط احقر کے پاس آیا تھا جس کا مضمون یہ تھا:

”مذکورہ نسخہ میرے پاس بھیج دیجئے آپ کی حسب مرضی طبع

کرا کے مولوی محمد قاسم اور مولوی رشید احمد صاحب وغیرہ کے پاس بھیج دوں گا۔ انہیں اختیار ہے کہ جس کسی کو قابل سمجھیں گے

عنایت فرمادیں گے۔“

اگر یہ صورت ہوگئی تو مولوی محمد قاسم صاحب بشرطیکہ کوئی حرج اور تکلیف نہ ہو خود میرٹھ جا کر اپنے سامنے پوری صحت مع حاشئے وغیرہ کے منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں چھپوائیں۔ اور مذکورہ رسالہ میں جہاں کہیں غیر مربوط الفاظ ہوں، یا عبارت درست نہ ہو تو اصلاح کر دیں اور ادب کو علیحدہ رکھیں اور ”حکم ادب پر فوقیت رکھتا ہے“ کو پیش نظر رکھیں اور یہ بھی یقین ہے کہ شجروں کے پرچے کو منشی صاحب رسالے کے ذیل میں طبع کریں گے۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ حضرت مرشد ميانجی (نور محمد) صاحب قدس سرہ کو سید صاحب سے بلا واسطہ حاجی صاحب قدس سرہ نسبت ہے۔ اس لئے حضرت ميانجی صاحب کا نام سید صاحب کو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سید صاحب کے واسطہ سے نسبت حاصل ہے اور بلا واسطہ بھی۔ اور شجرہ سہروردیہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان سے اسی قدر اطلاع پہنچی ہے کہ عظیم اللہ اکبر آبادی عن ابیہ عن جدہ اور ان کے باپ اور دادا کا نام معلوم نہیں ہے۔ آپ بھی اسی طرح سے لکھیں اور شجرہ مدار یہ و قلندر یہ شاید میں نے بھول کر نہیں لکھا اس لئے آپ لکھ لیں۔ اور اگر فرصت ہو تو صبح یا مغرب اور یا عشا کی نماز کے بعد علیحدہ حجرہ وغیرہ میں بیٹھیں اور دل کو تمام خیالات سے خالی کر کے اس طرف متوجہ ہوں اور تصور کریں کہ گویا اپنے شیخ کے پاس بیٹھا ہوں اور خدائی فیض ان کے سینے سے میرے سینے میں آرہا ہے۔ اس معاملہ میں اگر دلچسپی ہو اور ذوق و شوق ملے تو اچھا ہے ورنہ نفی و اثبات کا متوسط آواز میں کریں۔ ایک دو ساعت کم و بیش مصروف رہیں۔

اور مولوی عبدالرحمن خلف الرشید مولوی احمد علی صاحب کو ان کی درخواست کے بموجب غائبانہ بیعت لے کر اپنے خاندان کے بزرگوں کے سلسلے میں داخل



کر لیا گیا ہے۔ خداوند تعالیٰ قبول فرمائیں۔ اور سلسلہ کے بزرگوں کے فیض سے عزت بخشے۔ آمین اور ان کو بعد سلام، دعائے خیر سے یاد کر کے کہیں کہ مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی محمد یعقوب کو فقیر کی جگہ جان کر ان کی خدمت سے فیضیاب ہوتے رہیں۔ اگر تقدیر میں ہے تو فقیر سے بھی ملاقات ہوگی۔ اور ان کے بھائی کے حق میں بھی دُعا کی گئی۔ انشاء اللہ وہ راستی پر آجائیں گے۔ اور مظاہر حق بیچنے کی فکر نہ کریں۔ سردست کوئی خاص ضرورت نہیں ہے البتہ پانچ چھ قرآن شریف کی جلدیں کہ اس کے حاشیہ پر عبد اللہ بن عباس کی تفسیر چھپی ہوئی ہے منشی صاحب سے کہہ کر ضرور بھیجیں۔ ان کی قیمت جو مطبع کی تجویز کردہ ہے لکھیں کیوں کہ یہاں چند صاحبان بہت مشتاق ہیں اور یہ لوگ ان کی قیمت دے رہے تھے، مگر میں نے نہیں لی اور کہہ دیا کہ قرآن شریف آنے پر بھیج دی جائے گی۔

اور دوسرے رسالے کی تصنیف کے مقدمہ میں نصیحت کے طور پر جو عقائد کا بیان اور مسلم بزرگوں کے طریقے کی طرف اشارہ کیا گیا تو میرے عزیز اس مقدمہ میں بہت ہی کتابیں ہیں۔ مثلاً آداب المریدین وغیرہ۔ پھر بات یہ ہے کہ فقیر بے علم ہے اس معاملہ میں جرأت نہیں ہوتی۔ البتہ اگر مولوی محمد قاسم اس معاملہ میں لکھیں یا آں عزیز تو خوب ہوگا۔ فقیر کی مرضی کے مطابق مولوی رشید احمد بھی شریک ہوں گے اور مولوی محبت اللہ پانی پتی کے انتقال کا حال پہلی تحریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مدینہ منورہ سے لوٹنے کے وقت بدوؤں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون عزیز از جان مولوی محمد قاسم صاحب کی خدمت میں مکرریہ کہ اپنی ہمشیرہ اور برخوردار ضیا احمد کو دُعا خیر اور سلام کے بعد کہیں کہ اس احقر کو تمہارے اس عمل خیر سے بہت خوشی ہوئی۔ خدائے

تعالیٰ جزائے خیر دے اور تمام دینی اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال کرے اور بھائی صاحب مکرم و معظم شیخ اسد علی صاحب سلمہ کو بعد سلام نیاز مندانه مبارک باد دیں اللہ تعالیٰ آں جناب کو اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی توفیق دے۔ قوی امید ہے کہ یہی کارِ خیر جناب کی مغفرت کا ذریعہ بن جائے تو تعجب نہیں ہے۔ اور شکر کریں کہ خداوند تعالیٰ نے تمہیں ایک کامل ولی عطا فرمایا کہ ان کے انفاس کی برکت سے ان جیسے نیک عمل اور اللہ اور رسول کی رضامندی ظہور میں آئی ورنہ ”ایں دولت سرمد ہمہ کس راند ہند“۔

عزیز جانم تمہارے چار خطوط پہنچے۔ دو مورخہ جمادی الثانی ۱۲۸۳ھ مدینہ منورہ سے واپس آنے پر وصول پائے اور ایک مورخہ ۲۱ شوال ۱۲۸۳ھ کو اور دوسرا ۴ ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ کا لکھا ہوا پہنچا۔ اس کے مطالعہ سے سرسری نصیب ہوئیں۔ ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ جواب دینے سے ہاتھوں کے بے قابو ہونے کے باعث معذور ہوں معاف فرمائیں۔ اور حاجی بوعلی بخش صاحب کے روپیوں کی رسید پہنچی مطمئن رہیں۔

مولوی ذوالفقار علی صاحب بزرگوں کے سلسلے میں داخل ہو گئے لیکن عدیم الفرستی، قیام قلیل اور مدینہ منورہ کے سفر کے باعث کچھ نہیں کر سکے۔ اس لئے آں عزیز کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ ان کے حال پر توجہ کریں اور تعلیم و تلقین سے دریغ نہ فرمائیں اور جو لوگ کہ حق کے طالب ہیں، کاذب ہوں یا صادق ان سے انکار نہ کریں۔ ان کی طرف متوجہ ہوں۔ اللہ کی مدد سے تمہاری صداقت ان کے جھوٹ پر غالب ہوگی۔ اگر تقدیر میں ہے تو ہدایت پائیں گے۔ فقط عزیز از جان حافظ احمد حسین کا حال لکھیں، کیوں کہ اس سال میں انہوں نے کوئی اطلاع نہیں دی، معلوم ہوا کہ میری تحریر سے جو نصیحت کے طور

پر میں نے لکھی تھی تھا ہو گیا۔ اور اپنا اور اہل و عیال کا کوئی حال نہیں لکھا۔ اچھا وہ جانے مجھے تو صلہ رحمی ضروری ہے۔ عزیزوں اور قریبوں کو سلام فقط

حاجی صاحب کا مذکورہ بالا خط شاید ان کی زندگی کے تمام خطوط میں زیادہ طویل ہے چونکہ آپ مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے اس لئے مہینوں میں ہندوستان کے دوستوں، عزیزوں، مریدوں کے جو خطوط جاتے تھے ان کے جواب میں بہت کچھ لکھنے کی تمنا ہوتی تھی اس خواہش کے ماتحت خط بہت ہی طویل ہو گیا ہے۔

میں نے اس خط کو چند وجوہ منتخب کیا۔ سب سے بڑی بات تو یہ سمجھی کہ اس خط میں بعض تاریخی واقعات ہیں جو تحقیق کے طالب علم کے لئے تاریخ کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اور بہت سی وہ گتھیاں سلجھا دیتے ہیں جو تحقیقات اور ریسرچ کے طالب علم کو پریشان کرتی ہیں۔ مثلاً:

۱..... دارالعلوم دیوبند کے اجرا اور ترقی کا ذکر۔

۲..... نکاح بیوگان کے جہاد میں مولانا محمد قاسم صاحب کی سرگرمی اور اپنی ہمشیرہ کا نکاح۔

۳..... مولانا ذوالفقار علی صاحب والد محترم شیخ الہند مولانا شیخ الہند محمود حسن صاحب کا حج کے لئے جانا اور حاجی صاحب سے ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ کے حج میں بیعت ہونا۔ جہاں تک فارسی زبان کا تعلق ہے خط کی عبارت نہایت ہی سادہ اور سہل ہے۔ اردو سے آپ کے فارسی خطوط میں روانی معلوم ہوتی ہے۔

افسوس کہ ہم نے اس خط کو تاریخی اہمیت دیتے ہوئے منتخب کیا ورنہ ان کے دوسرے خطوط بھی ہماری نظروں کے سامنے ہیں جو عبارت اور زبان کے اعتبار سے دلچسپ، برجستہ اور چست ہیں میں اس خط کو لکھتا جاتا تھا اور طوالت سے گھبرا کر کئی دفعہ اس کو چھوڑ کر دوسرے خطوط لکھنے کا ارادہ کرتا تھا لیکن اسی کو لکھتے چلے جانے پر طبیعت کو مجبور اور قلم کو رواں

پاتا تھا تا آنکہ یہ خط اختتام کو پہنچ گیا۔ اب کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ اور خط پیش کیا جائے۔ البتہ بعض دوسری فارسی عبارتیں ضیاء القلوب اور رسالہ وحدۃ الوجود سے پیش کی جاتی ہیں۔

حسب ذیل فارسی عبارتیں حاجی صاحب کے رسالے سے جو ”وحدۃ الوجود“ کے نام سے موسوم ہے پیش کی جاتی ہیں۔ یہ مضمون دراصل مولوی محمد عبدالعزیز صاحب کے خط کا جواب ہے۔ انہوں نے حاجی صاحب کو لکھا تھا کہ:

”مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم معتقدان وحدۃ الوجود وحدۃ الوجود را ملحد و زندیق می گفتند۔ مرید و شاگرد شاں مولوی احمد حسن صاحب نیز ہمچنان می گویند و اقوال ضیاء القلوب را تاویل می دانند تاویل دان آں جز خود دیگرے را نمی شناسند و مولوی رشید احمد صاحب و مولوی محمد یعقوب صاحب نیز ہم بریں مسلک بوده اند باوجود آں کہ اجازت از تو گرفته اند و مشرب اہل چشت می دارند خلاف مشرب چشت خنای می گویند۔“ (وحدۃ الوجود ص: ۹)

ترجمہ :

مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم وحدۃ الوجود اور وحدۃ الوجود کے معتقدین کو ملحد اور زندیق کہتے تھے۔ ان کے مرید اور شاگرد مولوی احمد حسن صاحب (امروہوی) بھی یہی کہتے ہیں اور ضیاء القلوب کے اقوال کی تاویل کرتے ہیں اور ان کی تاویلوں کو اپنے سوائے اور کسی کو جاننے والا نہیں سمجھتے اور مولوی رشید احمد اور مولوی محمد یعقوب صاحب کا بھی یہی مسلک ہے حالانکہ آپ سے ہی ان کو اجازت خلافت حاصل ہے اور اہل چشت کا یہ لوگ مذہب رکھتے ہیں اور چشتیوں کے مشرب کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔

## وحدة الوجود کی حقیقت

”در اصل مسئلہ مذکور حق و بالیقین است صدق آں نگاہ را (آں وقت) معلوم گردو کہ طالب از محنت و ورز شہاد و ممارست استغراق در اں و ترک خطرات ماسوا از خودی خود شود۔ چوں از خیال خود گذشت گویا از ہمہ گذشت ہیچ شے در نظر او و خیال او نماند۔ ہمہ ہستی حق معائنہ کند۔ وقتیکہ از نظر سالک تقیدات و ہستی ما مرتفع گردید جز خدا ہیچ نہ بیند بے خبر گردد و بلکہ شعور ایں معنی ہم مرتفع شود۔ ہر چہ بیند۔ ہو ہو گفتن چہ معنی انا گوید۔ ایں مرتبہ را فنا در فنا گویند ایں گفتار از فی نباید فہمید بلکہ نائی میگوید مولا نا قدس سرہ راست۔

نے کہ ہر دم نغمہ آرائی کند فی الحقیقت از دم نائی کند بے فنائے خویش دے جذب قوی کے حریم وصل را محرم شوی در اصل مسئلہ مذکورہ یقینی اور حق ہے۔ اس کی صداقت اس وقت معلوم ہو سکتی ہے کہ طالب (حق) درزشوں، محنتوں اور اس میں استغراق کی مہارت اور ماسوائے خدا کے اپنی خودی کے خیالات دور ہو جائیں جب اپنے سے گذر جائے تو گویا سب سے گذر گیا۔ اس کی نظر اور خیال میں کوئی چیز نہ رہے گی۔ صرف حق ہی حق دیکھے گا اور جس وقت سالک کی نظر سے ماسوائے خدا کی ہستی اور تعلقات ماسوا اللہ اٹھ جائیں گے تو خدا کے سوائے کچھ نظر نہ آئے گا (اور) بے خبر ہو جائے گا بلکہ اس کا شعور بھی نہ رہے گا۔ جو کچھ دیکھے گا اس میں خدا ہی دیکھے گا۔ ہو ہو کہنا کیا معنی انا (میں) کہے گا۔ اس مرتبہ کو فنا در فنا کہتے ہیں ان باتوں کو بانسری سے نہ سمجھنا چاہئے بلکہ بانسری بجانے والا کہتا ہے مولا ناروم نے کہا ہے۔

بانسری جو ہر دم نغمے نکالتی رہتی ہے۔ یہ درحقیقت بانسری بجانے والے کی

پھونک سے نکلتے ہیں۔ اپنے آپ کو فنا کئے بغیر اور جذب قوی کے بغیر تو وصال کی بارگاہ سے واقف نہیں ہو سکتا۔

## مثال

مثال آل آہن پارہ کہ در آتش سرخ شدہ نعرہ زد کہ من آتشم انکارا میں قول دے کر وہ نمی شود اما واقعی آتش نشدہ است میں حالتے است بر پارہ آہن عارض شدہ و گر نہ آہن آہن است و آتش آتش۔ این است شمع از حقیقت وحدۃ الوجود۔ (رسالہ وحدۃ الوجود)

وحدۃ الوجود کی مثال اس لوہے کے ٹکڑے کی سی ہے جو آگ میں سرخ ہو کر نعرہ لگائے کہ میں آگ ہوں۔ اس کے اس قول کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں وہ لوہا واقعی آگ نہیں بن جاتا بلکہ لوہے کے ٹکڑے پر یہ حالت عارضی طاری ہوتی ہے ورنہ لوہا، لوہا ہے اور آگ آگ ہے۔ یہ ہے کچھ وحدت الوجود کی حقیقت کا حال۔ (رسالہ وحدۃ الوجود)

وحدۃ الوجود کے مضمون کے متعلق حاجی صاحب کی ایک اور فارسی عبارت ملاحظہ ہو لکھتے ہیں:

”اَوَّلُ بِمَصْقَلَهُ ذِكْرُ نَفْسٍ مُطِيعٍ وَقَلْبٍ صَافِي شَدِيدٍ ذَوْقٍ وَشَوْقٍ رَافِعٍ تَرْتِي آرِدٍ۔ اَوَّلُ مِنْ خَطَرَاتٍ بَاسِنَةٍ۔ وَقْتُ مَرَاقِبَةٍ لَا مَوْجُودَ إِلَّا اللّٰهُ دَرَّآئِدٍ۔ چوں دریں مراقبہ ”از ہمہ اوست“ اغماض نظر کردہ ”ہمہ اوست“ را پیش دارد۔ دریں استغراق فیض باطنی و جذبہ یقینی مددی فرماید۔ از ہر چہ بجز اوست بی خیر گردد و شعور میں بے خبری ہم نمی ماند۔ بیند ہر چہ اند ہر چہ داند، گوید ہر چہ گوید معذور است۔“

اِس است وحدۃ الوجود وحدۃ الوجود مثل آہن پارہ کہ در آتش رنگ آتش گرفتہ نعرہ اَنَا النَّارُ زد نہ کہ آن کہ بانقلاب حقیقت آتش شدہ از خیال آہن یارگی خود

گذشتہ منتظر آنت کہ آتش بر خود مستدلی گردد، درنگ خود بخشید۔ در اس تصور اگر خیال دیگر گذر در حق ولے شرک است کہ مانع مقصود و قاطع طریق اوست۔  
**توجہ:** ”اول ذکر کی صیقل سے نفس مطیع اور دل صاف ہو جاتا ہے۔ ذوق و شوق ترقی کی طرف آتا ہے۔ دل میں خطرات نہیں آتے۔ مراقبہ کے وقت لا موجود الا اللہ اندر پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ اس مراقبہ ”از ہمہ اوست“ سے نگاہیں بند کر کے ”ہمہ اوست“ کو سامنے رکھتا ہے تو اس استغراق میں باطنی فیض اور یقینی جذبہ مدد فرماتا ہے۔ ماسوا اللہ کے جو کچھ بھی ہے (مراقبہ کرنے والا) بے خبر ہو جاتا ہے۔ خبر اس بے خبری کی خبر بھی نہیں رہتی ہے۔ جو کچھ دیکھتا ہے، دیکھتا ہے اور جو کچھ جانتا ہے، جانتا ہے، جو کچھ کہتا ہے، کہتا ہے، (سب باتوں سے) معذور ہے۔ یہی ہے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الوجود جیسے لوہے کا ٹکڑا کہ آگ میں، آگ کا رنگ پکڑ لیتا ہے۔ ”میں آگ ہوں“ کا نعرہ لگاتا ہے حالانکہ وہ واقعی آگ نہیں بن جاتا۔ بلکہ اپنے لوہے کا ٹکڑا ہونے کے خیال سے بھی گذر کر اس بات کا منتظر ہوتا ہے کہ اس پر آگ غالب ہو جائے اور اپنے رنگ میں رنگ دے۔ اس تصور میں اگر دوسرا خیال بھی گذرے تو اس کے حق میں شرک ہے کہ وہ مقصود کے خلاف اور اس کے لئے قاطع راہ ہے۔

اس عبارت میں مسئلہ ”ہمہ اوست“ کی اور وضاحت کے ساتھ تفصیل ہے۔ جو اہل علم و صاحبِ دل کے سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ تاہم حاجی صاحب کا منشا یہ ہے کہ وحدۃ الوجود ایسے مسائل میں ہے جس کو عوام کے سامنے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ عوام کے مسائل اور ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

”اس مسئلہ بسیار نازک و نہایت دقیق است، فہم عوام بلکہ فہم علمائے ظاہر کہ از اصطلاح عرفا عاری اند، قوتِ درکِ آن نمی دارد۔ چہ علما بلکہ صوفیائے کہ ہنوز در سلوک مقامِ ناکردہ باشند از مقامِ نفسِ گذشتہ بمرتبہ قلبِ نارسیدہ، از یں مسئلہ



ضرر یا بند۔“

یہ مسئلہ نہایت نازک اور نہایت باریک ہے عام لوگوں بلکہ ظاہری علما کی سمجھ جو کہ صوفیا کی اصطلاح نہیں جانتے اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ کیوں کہ علما بلکہ وہ صوفیا جو کہ ابھی سلوک کے مقام پر نہیں پہنچے اور نفس کے مقام سے گذر کر قلب کے مرتبہ پر نہیں پہنچتے اس مسئلہ سے نقصان اٹھاتے ہیں۔

پھر تحریر فرماتے ہیں:

پس ایں جانور باید فرمود کہ مردماں را چہ رسد کہ باکس و نا کس بازار مسئلہ وحدۃ الوجود گرم داریم، عوام را کہ جزوے از ایمان تقلیدی می دارند ازاں ہم بے نصیب سازیم، معارف آگاہ! برائے ہمیں احتیاط، احباب فقیر زباں ازیں قیل و قال بستہ می دارند۔

پس یہاں غور کرنا چاہئے کہ آدمیوں کو اس میں کیا ملتا ہے کہ ہر اہل و نا اہل کے ساتھ وحدۃ الوجود کے مسائل پر بازار گرم رکھتے ہیں اور عام لوگ کہ تقلیدی ایمان کے سوائے کچھ نہیں جانتے اس سے بھی ہم ان کو محروم کر دیں۔ اے معارف آگاہ اسی احتیاط کے باعث فقیر کے احباب اس قیل و قال سے (زبان) بند رکھتے ہیں۔

اس عبارت میں حاجی صاحب نے اپنے مریدین مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے متعلق وہی جواب دیا ہے جو شیخ محی الدین ابن عربی کے متعلق مشہور ہے کہ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ جو ابن عربی کے ہم عصر تھے ان سے لوگوں نے ابن عربی کے متعلق دریافت کیا تو شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”فہو زندق“ (وہ بے دین ہے) جب ابن عربی کا انتقال ہوا تو حضرت سہروردی نے ان کے متعلق فرمایا: ”مات قطب الوقت من کان ولی اللہ“ (وقت کا قطب چل بسا جو اللہ کا ولی تھا) مولانا محمد قاسم وغیرہ بھی اسی لئے اس مسئلہ میں پڑنے سے منع فرماتے ہیں۔





## وحدة الوجود کی فارسی زبان

چونکہ یہ رسالہ وحدة الوجود کے جیسے نازک مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کی زبان بھی نہایت ٹھوس، علمی اور متین ہے۔ اور گزشتہ خط کے مقابلے میں علمی ہونے کے باعث بلند ہے۔

یہاں تک پہنچ کر اب ہم ”ضیاء القلوب“ سے کچھ فارسی عبارتیں منتخب کر کے اور پیش کرتے ہیں، حاجی صاحب کی فارسی عبارتوں میں بھی ہم نے اس امر کا خاص لحاظ رکھا ہے کہ زبان کے علاوہ ایسی عبارتیں منتخب کی ہیں جس میں قاری کو اسلامی ادب کے علاوہ اپنے ان معتقدات کا علم ہو جو کسی قوم کے لئے ضروری ہو سکتی ہیں۔ نیچے کی عبارت میں زیارت جمال مبارک صلی اللہ علیہ وسلم کے حصول کا طریقہ درج ہے۔ حاجی صاحب ”ضیاء القلوب“ میں تحریر فرماتے ہیں:

### طریقہ حصول جمالِ زیارت سرکارِ مدینہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

بعد نمازِ عشا با طہارتِ کامل و جلہ نو و استعمالِ خوشبو باد تمام رو بسوئے مدینہ منورہ بنشیند و بتجی از جناب قدس حقیقت محمدی برای حصولِ زیارتِ جمالِ مبارک صلی اللہ علیہ وسلم بشود و دل را از جمیع خطرات خالی کردہ صورت آں حضرت بلباسِ بسیار سفید و عمامہ سبز و چہرہ منور مثل بدر بر کرسی تصور کند وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا رَسُولَ اللّٰہِ (راست) وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا نَبِیَّ اللّٰہِ (چپ) وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا حَبِیْبَ اللّٰہِ در دل خود ضرب کند۔ ایں درود شریف را ہر قدر کہ تواند پی در پی تکرار کند بعد ازاں ایں ہر سہ درود را اللّٰہُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا اَمَرْتَنَا اَنْ نُّصَلِّیَ عَلَیْہِ، اللّٰہُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا نُحِبُّ وَتَرْضَاهُ ہر قدر کہ تواند بعد و طاق بخواند و بوقتِ خفتن بست و یک بار سورہ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰہِ خواند بتصور جمال

مبارک درود گویاں سربسوی قطب درود قبلہ و بردست راست بخشد وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا رَسُولَ اللّٰہِ خواند برکف راست و میدہ وزیر سر نہادہ بخشد۔ ایں عمل بہ شب جمعہ یا شب دوشنبہ بہ بکند۔ چند بار بعمل آرد ان شاء اللہ تعالیٰ بمطلوب خواہد رسید۔

عشا کی نماز کے بعد مکمل طہارت، نئے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر مدینہ منورہ کی طرف منہ کر کے پورے ادب سے بیٹھے اور اللہ تعالیٰ سے آنحضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے جمال مبارک کے حصول کے حقیقت محمدی کا طلبگار ہو اور دل کو تمام وسوسوں سے خالی کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت کا بہت سفید لباس، سبز عمامہ اور چودھویں کے چاند کی مانند روشن چہرے کے ساتھ کہ آپ کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں تصور کرے اور وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا رَسُولَ اللّٰہِ داہنی جانب اور وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا نَبِیَّ اللّٰہِ (بائیں جانب) وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا حَبِیْبَ اللّٰہِ اپنے دل میں ضرب کرے اور اس درود شریف کو جس قدر بھی کہ کر سکے پے در پے بار بار پڑھے۔ اس کے بعد ان تینوں درودوں (یعنی) اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا اَمَرْتَنَا اَنْ نُّصَلِّیَ عَلَیْہِ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰہُ جس قدر بھی کر سکے طاق عدد پڑھے اور سوتے وقت اکیس مرتبہ سورت اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰہِ پڑھ کر جمال مبارک کے خیال میں درود پڑھتا ہوا قطب کی طرف سر کر کے اور منہ قبلہ کی طرف داہنے ہاتھ پر سوتے اور وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا رَسُولَ اللّٰہِ پڑھ کر داہنے ہاتھ پر دم کرے اور سر کے نیچے رکھ کر سو جائے۔ یہ عمل جمعہ کی رات یا پیر کی رات کرے۔ (ضیاء القلوب ص: ۴۹) چند مرتبہ عمل کرے انشاء اللہ تعالیٰ مطلب کو پہنچے گا۔



مذکورہ بالا عبارت سے آپ حاجی صاحب کی فارسی نثر نگاری کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ علم تصوف پر جہاں کچھ لکھتے ہیں اور وہ مسئلہ بھی سادہ اور آسان ہو تو اس وقت ان کی طبیعت کا رنگ اور زبان کا ڈھنگ کیا ہوتا ہے۔ حسب ذیل عبارت میں ناثر نے قرآن کریم کی تلاوت کے طریقے کو کس انداز اور زبان میں بیان فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

### طریق تلاوت قرآن کریم

بدانکہ تلاوت قرآن افضل عبادت است و کد ام طریق برائے تقرب الی اللہ سوائے فرائض بہتر از تلاوت قرآن نیست پس آداب و استحباب او آں ست کہ با اخلاص تمام با طہارت کامل رو بقبلہ با ترتیل و خشوع و تحزن بعد از اعوذ باللہ و بسم اللہ بملاحظہ آں کہ کلام با خدای کند و گویا اور امی بیند و اگر نتواند بداند کہ او مر امی بیند و با و امر نو ای مرا حکم می فرماید و بر آیت بشارت فرحاں و بر آیت وعید ترساں و گریاں باشد و بحجر و الحان خوش کہ موجب جمعیت خاطر و وضع غفلت است بخواند و ایں عام است۔ و طریق خاص آں کہ طالب با شرائط مذکور در خلوت کہ کد ام خل خلوت نباشد بعد ادا ئے دو رکعت نفل یا دہ حضور تمام بنشیند و قرآن شریف را رو برو نہند و عظمت کلام کبریائی و تذلل خود ملاحظہ نماید و دل را از جمیع خطرات خالی کردہ متوجہ بحقیقت قرآنی کہ صفت کلام نفسی حق است گرد و دریں مراقبہ اندک توقف کند۔ چوں خاطر جمع شود و حضوریت بحق تعالیٰ چوں شاگرد پیش استاذ یقین حاصل آید۔ بعد اعوذ باللہ و بسم اللہ بخشوع و خضوع تمام با ترتیل و تجوید چنانکہ پیش استاذ می خوانند بیچ دقیقہ قرأت فرو نگذارند، تلاوت نماید و در صحن قرأت خیال کند کہ زبان دہن و لسان دل صنوبری ہر دو برابر تلفظ می کند۔ ازیں ملاحظہ غافل نشود و گر غفلت آید زود اعوذ بخواند و دل را حاضر کند۔ چوں ازیں مشق جمعیت خاطر و حضوریت بحق تعالیٰ حاصل آید

بعد ازاں تصور کند کہ ہر بن موسیٰ جسد قاری برائے قرأت قرآن زبان گردیدہ  
وہر بن موافاظمی آئندہ تمام قالب قاری حکم شجرہ موسوی پیدا کردہ است دریں  
ملاحظہ و در عین قرأت مستغرق گردد۔ چون در ایں ملکہ حاصل آید بعد ازاں در  
وقت تصور کند کہ حق تعالیٰ بزبان قاری میخواند و اوی شنود و بعد ازاں تصور کند کہ  
سالک میخواند و حق بگوش سالک می شنود۔ چون دریں ملکہ شود بعد ازاں در  
قرأت خود تصور کند کہ او تعالیٰ خود میخواند و خودی شنود و ایں بیچ نیست نہ وجود  
سالک نہ وجود موجودات بجز آنکہ آوازیست کہ از ہر جہت می آید و سالک  
دریں محو است۔ چون ایں مرتبہ بکمال رسد بفضلہ تعالیٰ امیدست کہ معنی حقیقی  
و اسرارِ قرآنی منکشف گردد و سالک بمطلوب خود برسد۔ (نیاء الغلوب ص: ۴۷-۴۸)

سمجھو کہ قرآن کریم کی تلاوت عبادتوں میں افضل ہے۔ اور اللہ کی نزدیکی  
حاصل کرنے کے لئے فرائض کے سوائے قرآن کی تلاوت سے بہتر اور کوئی  
نہیں ہے اس لئے نماز کے آداب اور استحباب یہ ہیں کہ پورے اخلاص اور  
پوری طہارت کے ساتھ قبلہ کی طرف منہ کر کے ٹھہر ٹھہر کر عاجزی کے ساتھ اعوذ  
باللہ اور بسم اللہ کے بعد اس خیال سے پڑھے کہ خدا کے ساتھ باتیں کر رہا ہے  
اور گویا اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو یہ سمجھے کہ وہ مجھے دیکھتا ہے اور  
ادامہ دینا ہی کا حکم دے رہا ہے اور خوشخبری کی آیت پر خوش اور سزا کی آیت پر  
خوف زدہ اور روتا ہوا ہونا چاہئے اور خوش الحانی سے جس سے دل کو اطمینان اور  
غفلت دور ہو پڑھے اور یہ عام طریقہ ہے۔ لیکن خاص طریقہ یہ ہے کہ پڑھنے  
والا مذکورہ شرطوں کے ساتھ تنہائی میں کہ جہاں کوئی خلل نہ ڈال سکے دو رکعت  
نفل پڑھ کر پورے ادب اور یکسوئی کے ساتھ بیٹھے اور قرآن کریم کو سامنے  
رکھے اور اس کی عظمت اور اپنی ذات کو دیکھے اور دل کو تمام خیالات سے خالی

کر کے قرآن کی حقیقت کی طرف کہ خدا کے کلامِ نفسی کی صفت ہے متوجہ ہو اور اس مراقبے میں تھوڑا سا توقف کرے۔ جب دل مطمئن ہو جائے اور خدا کی طرف دھیان ہو جائے جیسا کہ شاگرد کا استاد کے سامنے ہوتا ہے تو اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر پوری عاجزی کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر تجوید کے ساتھ جیسا کہ استاد کے سامنے پڑھتے ہیں کوئی دقیقہ قرأت کا نہ چھوڑیں تلاوت کریں اور پڑھتے وقت خیال کرے کہ منہ کی زبان اور صنوبر نما دل کی زبان دونوں پڑھ رہی ہیں۔ اس ملاحظہ سے غافل نہ ہو۔ اور اگر غفلت ہو جائے تو جلد اعوذ پڑھ کر دل کو حاضر کرے جب اس مشق سے دل کو اطمینان اور خدا کی بارگاہ میں حاضری حاصل ہو جائے تو اس کے بعد تصور کرے کہ تلاوت کرنے والے کے جسم کے بال کی ہر جڑ قرأتِ قرآن کے لئے زبان بن گئی ہے اور رویں رویں سے الفاظ نکل رہے ہیں اور قاری کا تمام دل شجرہ طور کا سانچہ پیش کر رہا ہے۔ اس ملاحظہ میں بالکل قرأت میں محو ہو جائے، جب اس میں ملکہ حاصل ہو جائے تو اس وقت کے بعد تصور کرے کہ حق تعالیٰ قاری کی زبان سے پڑھتا ہے اور وہ سنتا ہے اور اس کے بعد تصور کرے کہ سالک پڑھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ سالک کے کان سے سنتا ہے۔ جب اس میں بھی مشق ہو جائے تو اس کے بعد اپنی تلاوت کے متعلق خیال کرے کہ وہ بلند ذات خود پڑھ رہی ہے اور خود سن رہی ہے۔ اور یہ کچھ نہیں ہے نہ تو سالک کا ہی وجود ہے اور نہ موجودات کا سوائے اس کے کہ ایک آواز ہے کہ ہر طرف سے آرہی ہے اور سالک میں محو ہے۔ جب یہ مرتبہ کمال کو پہنچ جائے تو اللہ کے فضل سے اُمید ہے کہ حقیقی معنی اور اسرارِ قرآنی واضح ہو جائیں گے۔ اور سالک اپنے مقصد کو پہنچ جائے گا۔

مذکورہ بالا فارسی عبارت قرآن کریم کی تلاوت کے طریقے کے بارے میں ضیاء القلوب



سے لہ گئی ہے۔ اب ہم ایک اور دوسری عبارت اسی کتاب سے پیش کرتے ہیں۔ حاجی صاحب نماز پڑھنے کے مختلف طریقے لکھ رہے ہیں، ان میں سے ایک طریقہ حسب ذیل عبارت میں پیش فرماتے ہیں۔ ہم اس عبارت کا ترجمہ بھی اردو میں لکھتے ہیں:

بدانکہ وقت ادای نماز رودی قلب را متوجہ بسوی حقیقت کعبہ کہ صفت موجودیت حق است سازد و نور حقیقت نماز را کہ صفت الوہیت اوتعالیٰ است ملاحظہ نماید و تصور حقیقت خود کہ مرتبہ عبدیت است بعجز تمام پیش آرد و خالص نیت ادای خدمت عبدیت کند و برای تکبیر دست بردارد و خیال نماید کہ از ہر دو جہان دست برداشتہ رجوع الی اللہ گشتہ و گوید اَللّٰهُ اَکْبَرُ و تصور کند گویا کہ نفس خود را بہ تکبیر ذبح و تصور کند گویا کہ نفس خود را بہ تکبیر ذبح کردہ فنا ساخت و بعد تسبیح و تہمید، قرأت شروع کند و در قرأت ملاحظہ قبولیت حق تعالیٰ کند چنانچہ در حدیث شریف آمدہ است کہ وقتیکہ گفت بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ فرمود حق تعالیٰ ستائش من کردہ بندہ من۔ چوں گفت الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فرمود حق تعالیٰ بر من ثنا کرد بندہ من۔ چوں گفت مَلِکِ یَوْمَ الدِّیْنِ فرمود حق تعالیٰ بندہ من عظمت و بزرگی من کرد چوں گفت اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ فرمود حق تعالیٰ کہ در میان من و در میان بندہ من است و مر بندہ مراست آنچہ خواست۔ وقتیکہ گفت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ فرمود حق تعالیٰ ایں برای بندہ من است و مر بندہ مراست آنچہ خواست پس در ملاحظہ مجاہدہ مستغرق گردد۔ و در رکوع نظر بر پشت پا دارد و ملاحظہ عظمت و کبریائی اوتعالیٰ و تذلل خود کند و در سجود نظر بر پرہ بنی دارد و ملاحظہ علو اوتعالیٰ و تحقیر و خاکساری خویش نماید و در قاعدہ نظر بر سینہ دارد و ملاحظہ معنی التّیّات کند و در ایں حالت یقین داند کہ در حضوری تعالیٰ در مجلس

انبیاء اولیاء داخل است و نیز در ہر نماز ملاحظہ اَن تَعْبُدَ اللّٰہَ کَمَا نَتَرَاہُ لِحُوْظِ  
دارد و اگر خطرہ آید بملاحظہ لَا صَلَوةَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ رُفِعَ سَاوَد۔ و در  
قرأت آواز تلفظ چنان باید کہ گوش خود بشنود بلکہ ہر کہ برابر او باشد او ہم استماع  
نماید۔ اما چنداں جہر نکند کہ آواز از حلق بر آید الا در نماز جہریہ۔

واضح ہو کہ نماز پڑھنے کے وقت دلی توجہ حقیقت کعبہ کی طرف کہ خدائے تعالیٰ  
کی صفت موجودیت ہے، کرے۔ اور نماز کی حقیقت کے نور کو کہ اس رب  
العرز کی صفت الوہیت ہے ملاحظہ کرے اور اپنی حقیقت کا تصور جو کہ بندگی  
کا مقام ہے پوری عاجزی سے کرے اور عبدیت کی خدمت کے ادا کرنے کی  
خالص نیت کرے۔ اور تکبیر کے لئے ہاتھ اٹھائے اور خیال کرے کہ دونوں  
جہانوں سے قطع تعلق کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اللہ اکبر کہے کہ گویا اپنے  
نفس کو تکبیر کے ساتھ ذبح کر کے فدا کر دیا ہے۔ اور سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ اور الحمد  
شریف کے بعد قرأت شروع کرے اور قرأت میں حق تعالیٰ کی قبولیت کا تصور  
کرے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ  
الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے میری تعریف  
کی۔ جب الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے  
بندے نے میری ثناء کی۔ جب مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہتا ہے تو باری تعالیٰ  
فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی اور جب بندہ  
اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے  
درمیان اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لئے ہے جو  
کچھ اس نے چاہا۔ جب نمازی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ  
الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ پڑھتا ہے تو

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے ہے جو کچھ اس نے چاہا پس جواب ملنے کے تصور میں محو ہو جائے۔ اور رکوع میں پاؤں کی پشت پر نظر رکھے اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور بلندی اور اپنی عاجزی کو دیکھے۔ اور سجده میں ناک کے نتھنے پر نظر رکھے اور اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور اپنی حقارت اور خاکساری پر غور کرے اور بیٹھنے کی حالت میں سینے پر نظر رکھے اور التیحات کے معنی سمجھے اور اس حالت میں یقین کی کیفیت پیدا کرے کہ خدا تعالیٰ کی حضوری اور انبیاء و اولیاء کی مجلس میں داخل ہے اور ہر نماز میں یہ حالت پیدا کرے کہ وہ اس طرح اللہ کی عبادت کر رہا ہے کہ گویا وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر کوئی دوسرہ پیدا ہو تو اس حدیث سے کہ حضور قلب کے بغیر نماز نہیں ہوتی اس کو دور کرے۔ اور قرأت کے وقت اس طرح پڑھے کہ اپنے کان بھی سنیں اور برابر والا بھی سن لے۔ لیکن اتنی زور سے نہ پڑھے کہ آواز حلق سے باہر نکلے ہاں جہری نماز میں درست ہے۔

### طریق دیگر نماز

بشرائط معہودہ در حالت نماز نور حقیقت صلوٰۃ را مثل ستارہ در خشاں در حیں قیام بر سجده گاہ و در رکوع بر پیشانی و در حالت سجده بر پرہ بنی و قعود برابر سینہ مشاہدہ کند و مستغرق گردد۔ پس چوں بایں طور مذکور در ادائے نماز مزاولت و مشق نماید بعونہ تعالیٰ نماید حقیقی رود ہد و حقائق و معارف گوناگون مکشوف گردد و مرتبہ الصلوٰۃ میغراج المؤمنین ہمیں است کہ مقصود دنیا و مافیہا را گذشتن و با حق پیوستن است وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ خداوند امارا و جمع دوستان مارا و ہمہ طالبان حق را ازیں دولت مشرف گرداں و دریں بمر اں و بر انگیزاں بمنہ و کرمہ و بحرمت النبی وآلہ و اصحابہ اجمعین آمین۔ آمین۔ آمین





مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ نماز کی حالت میں نماز کی حقیقت کا نور چمکدار ستارے کی طرح، قیام کی حالت میں سجدے کی جگہ اور رکوع میں پیشانی پر اور سجدے میں ناک کے پردوں پر اور بیٹھنے کی حالت میں سینے پر دیکھے اور محو ہو جائے، جب اس طرح مذکورہ طریقہ پر نماز ادا کرنے کی مشق اور مہارت کرے گا تو اللہ کی توفیق سے حقیقی نماز نصیب ہوگی، اور طرح طرح کے حقائق اور معارف ظاہر ہوں گے اور نماز مومن کی معراج ہے کا یہی مقام ہے کہ دنیا و مافیہا کو چھوڑنا اور خدا سے مل جانا ہے اور خدا یہ توفیق جس کو دے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب دوستوں کو اور سب حق کے طالبوں کو اس دولت سے مشرف کرے اور اسی پر خاتمہ اور اسی پر حشر کرے اپنے فضل و کرم اور حرمت نبی و آل و اصحاب کے ذریعہ۔ آمین۔ آمین۔ آمین۔

### فارسی زبان پر تنقید

ان تمام فارسی نثریوں کی زبان اور بیان کے متعلق نہایت اختصار کے ساتھ یہ تبصرہ مناسب ہوگا کہ حاجی صاحب کی فارسی تعلیم کی تمام مبلغ پرواز گلستان تک ہے لیکن اس کے باوجود ان کو فارسی زبان پر اتنی دسترس حاصل ہے کہ وہ مافی الضمیر اور مطالب کو فارسی زبان میں ادا کرنے پر نہ صرف قادر ہیں بلکہ ان کا ادبی ذوق اس زبان میں قابل آفریں ہے۔

ایک خاص اہم بات جو ہمارے خیال میں ان کی فارسی نثر نگاری کے تمام اطراف و جوانب کو دیکھ کر پیدا ہوتی وہ یہ ہے کہ ان کے فارسی خطوط کی فارسی زبان اور علمی مضامین کی زبان میں تنوع ہے۔ اور جب وہ کسی آسان اور سہل مسئلہ پر کلام کرتے ہیں تو ان کی زبان میں گھلاوٹ یا پاکیزگی اور سلاست بے حد ہوتی ہے۔ لیکن وحدۃ الوجود جیسے علمی اور معرکہ آراء مسئلے میں ان کی زبان کی متانت اور علمیت کا کچھ اور ہی رنگ ہے جو قاری پر غور کرنے سے واضح ہوگا، اور سلیم الطبع علم پر منکشف ہوگا۔

ہم خیال کرتے ہیں کہ ان کی فارسی زبان میں مہارت اور ادبی قوت جواب تک بقدر طرف واستقامت ہم نے بیان کی ہے کافی سمجھتے ہوئے ان کی فارسی شاعری کا جائزہ لینے کی طرف توجہ دیں اور قارئین کو انکی فارسی شاعری سے روشناس کرانے کے لئے اپنی تحقیق اور معلومات کے نتائج پیش کرنے کی کوشش کریں۔

## فارسی شاعری

حاجی صاحب کی فارسی شاعری بھی کسی استاذ شعر و سخن کی ممنون احسان نہیں۔ وہ اپنے خداداد فطری تقاضوں کو شمعِ راہ بنا کر چلتے ہیں۔ دل پر عشقِ حقیقی کی چوٹ لگی ہوتی ہے اس لئے دل کی بیتابیوں سے مجبور ہو کر لکھتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ان کی فارسی شاعری میں قال ہی نہیں بلکہ حال ہے۔ چونکہ ان کی شاعری کی زمین ”عشق حسن ازلی“ سے گلِ بداماں ہے اس لئے جو کچھ کہتے ہیں وہ حقیقت کے سازی کی آواز ہے۔ وہ خود چلتے ہیں اور دوسروں کو جلانا چاہتے ہیں، وہ ایک شمع ہیں جو خود پکھلتی ہے اور انجمن کو روشن کرتی ہے۔ ان کے سوز میں وہ زندگی ہے جس کو من کی دنیا کہتے ہیں یا علامہ اقبال کی اُسے خودی کہ لیجئے یا حاجی صاحب کی بے خودی۔ لیکن اس بے خودی اور ہستی میں وہ ہوشیار بھی ہیں اور خبردار بھی۔ ان کی مستی اور ہوشیاری کا اندازہ ان کی اس فارسی غزل سے کیجئے۔ لکھتے ہیں:

اگرچہ بے خود و مستم ولی ہوشیاری گُردم      باطن شاہ کو غنم بظاہر خوار می گُردم  
ز چہشت می بخیزاں رسد از لبِ بستاں قد      چو من با این نہ با آنم ز حراماں خوار می گُردم  
چو شد منظور قتل من تغافل چیست اے قاتل      کہ سر بر کف، کفن بردوش، گردِ داری گُردم  
شراب شوق عالم را تو می طلبی دے بخشی      مگر محروم رُرد خانہ حمار می گُردم

یا نور محمد کن دل امداد را روشن

کہ عکس نور بے کیفم پئے انوار می گُردم

ان اشعار سے آپ کو ان کی مستی اور ہوشیاری کا پتہ چل سکتا ہے لیکن بات تو یہ ہے کہ ولی راوی می شناسد۔ ایک اور غزل میں جو ارکان حج، طواف کعبہ اور صاحب کعبہ کے متعلق لکھی ہے اور جو در و تمنا والوں کے گنگنانے کے لئے خوب ہے۔ لکھتے ہیں۔

رتم چو بمکہ ہوں کوئے تو کردم      دیدم رخ کعبہ ہوں روئے تو کردم  
محراب حرم گرچہ بہ پیش نظرم شد      من سجدہ ولی در خم ابروئے تو کردم  
در سعی و طواف و خطیم و بمقامے      ہر سمت تمنا رخ نیکوئے تو کردم  
لیک دُعا خواں ہمہ مخلوق بعرفات      چوں قبلہ نما من دل خود سوئے تو کردم  
در عرصہ عرفات بپا حشر نمودم      چوں یاد من آں قامت دلجوئے تو کردم  
قربانی حیواں بُمئے می کند عالم ۔

قرباں سر خود من بسر کوئے تو کردم

مذکورہ اشعار کو پڑھئے اور ان کی فارسی شاعری کا اندازہ لگائے حقیقت تو یہ ہے کہ وہ حال اور وجد میں ایسے بے خود ہیں کہ انہیں عام خواہشمندوں کی طرح کی تمنا نہیں ہے بلکہ اس تمنا میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، یہی مراد ہے اس درد سے جو شاعری کی روح ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر ہم ان کی فارسی اور اردو دونوں شاعریوں کے متعلق اس فیصلے پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں کہ حاجی صاحب کی تمام شاعری میں درد ہے، سادگی ہے، سلاست ہے۔ اس درد کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے بھی لگائے جو انہوں نے انیٹھ ضلع سہارنپور کے ایک دوست شاہ سید علی احمد کے خط آنے پر لکھے ہیں۔ سید علی احمد صاحب شاعر معلوم ہوتے ہیں اور ان کا تخلص قابل داد بھی ہے اور قابل احترام بھی۔ حاجی صاحب کی اس غزل کا عنوان ہے:

”جواب خط شاہ سید علی احمد صاحب تخلص صلی علی احمد انیٹھوی“

اس عنوان سے دو باتوں کا اظہار ہو رہا ہے، اول تو یہ کہ حاجی صاحب کے پاس ان کا

کوئی خط آیا ہے جس کے جواب میں انہوں نے حسب ذیل اشعار لکھے ہیں۔ دوم یہ کہ نام کے ساتھ ان کا تخلص صلی علی احمد ہے گویا نام سید علی احمد اور تخلص صلی علی احمد کا خوب تقابل پیدا کیا ہے۔ حاجی صاحب کو اپنے دوست کے خط آنے پر بہت ہی مسرت ہوئی ہے تحریر فرماتے ہیں۔

صبا آورد چوں بوئے گل وصل نگار من	برآمد بر هوئے شوق ایں مشت غبار من
بجہ اللہ چہ راحت یافت جان بیقرار من	کہ آمد ناگہاں نامہ ز کوئے شہر یار من
خبر آمد، خط آمد، قاصد آمد ہم پیام آمد	دل حیراں کہ باشد بر کدای جاں شار من
بایں شکرانہ بردیدہ نہادم پائے قاصد را	کہ از نامہ منور کرد چشم انتظار من
بدیدہ گریہ لب نالوں، بجانم سوز تن یزداں	ہمیں تسکین دل بودی ہمیں صبر قرار من
بعین گریہ من خنداں، دہم در خندہ من گریاں	بہار اندر خزاں بود و خزاں اندر بہار من
گہی گریاں و گہ خنداں، گہی حیراں، گہی نالوں	بجز ایں شغل یک لحظہ نبود روزگار من
نمی گردو بیان شوق وصل و شکوہ ہجر اں	غرض جز ذکر و فکر تو نبود بیچ کار من
کہ آمد نامہ خوش ناگہاں صل علی احمد	یہاں یک رفت غمہائے دل اندوہ گار من
ز لطفش چشم آں دارم کہ دائم بچشمیں جاری	بماند در دلت یاد دل امیدوار من

کنم تحریر اے امداد تا کی شوق وصل او

رسد اے کاش جائے نامہ آں نامی نگار من

اس غزل کی طرز میں منظوم خط کے کل سترہ اشعار ہیں جن میں سے ہم نے صرف گیارہ اشعار انتخاب کر کے آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ ایک ایک شعر سے دوست کی محبت نیکی ہے اور اشعار میں درد ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ زبان فارسی اور شگفتگی کے علاوہ حاجی صاحب نے صلی علی احمد سے فائدہ اٹھا کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درد بھیجا ہے۔

غرض آپ کا فارسی کلام اساتذہ کی طرح بلند درجہ رکھتا ہے۔ البتہ لغزشوں سے کون خالی

ہے۔ غالب اور اقبال کے کلام میں بھی مختلف قسم کی لغزشیں موجود ہیں۔ اور یہ تو خود حاجی صاحب نے اپنی مثنوی (غذائے روح) کے خاتمے پر فرمایا ہے۔

شاعری سے مجھ کو کچھ بہرہ نہیں علم نظم و نثر بھی رکھتا نہیں  
چاہئے مقصود دل اس یار سے ہے نہ مطلب خوبی اشعار سے  
شاعری سے کچھ نہیں ہے مجھ کو کام چاہتا ہوں یہ کہ ہووے فیض عام  
سن کے یہ زیادہ ہو عشق عاشقان اور ہووے دور فسخ فاسقان  
شاعروں سے کچھ نہیں ہے التجا عرض ہے اہل صفا سے یہ ذرا  
جو کہ دیکھیں اس میں کچھ سہو و خطا دیں بنا اپنے کرم سے برملا  
کر کے اپنے لطف واحساں پر نظر اس میں دیں اصلاح بے خوف و خطر  
دیکھئے آپ نے کس سادگی سے اپنے آپ کو شاعری اور شعرا سے خارج کیا ہے اور خود  
فرما دیا ہے کہ میرا مقصد اگر کچھ میں نے اشعار میں لکھا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اہل دل  
لوگوں کے قصے لکھ کر فیض عام پہنچایا جائے اور نثر کی بہ نسبت شعروں سے انسان بالطبع لطف  
لیتے ہیں اس لئے میں نے شاعری کو فیض کا ذریعہ بنایا ہے۔ ہم اپنے مرکز سے ہٹ کر کسی  
اور طرف متوجہ ہو گئے۔ حالانکہ سلسلہ کلام حاجی صاحب کی فارسی شاعری تھا۔

ہاں تو ہم یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ موصوف نہ صرف اردو کے کامیاب  
شاعر تھے بلکہ فارسی میں شعر و سخن کا خوب سلیقہ رکھتے تھے۔ جیسا کہ ان کے گذشتہ فارسی  
اشعار سے آپ نے اندازہ لگایا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں بعض جگہ صنعتوں کا بھی خاص خیال  
رکھتے ہیں، ذرا حسب ذیل اشعار کو دیکھئے جو شریف مکہ عبداللہ بن عون کی تعریف میں  
بصنعت توشیح لکھے ہیں۔ صنعت توشیح کا یہ مطلب ہے کہ شاعر کے اشعار کے ہر مصرع یا ہر  
شعر کے تمام پہلے حرف لے کر ترتیب وار جمع کر دئے جائیں تو ممدوح کا پورا نام بن جاتا  
ہے۔ اب نیچے کے اشعار ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں:

شاد باش اے شاہِ اقلیمِ عرب      رحمتِ حق بر تو بادا روزِ دشب  
یا الہی سایہ اش را کن دراز      فیضِ بخش بر سرِ اہلِ حجاز  
عونِ حق بر تو بود اے ابنِ عون      بادِ خوش از تو خدائے ہر دو کون  
دوستِ خوش دشمنِ برباد باد      اہلِ حریم از تو بس دلِ شاد باد  
لنگرِ انعامت اے شاہِ کرم      ہست دائم بر سرِ اہلِ ام  
نامِ ممدوحت چو خواہی اے امیر

حرفِ اوّل از سر ہر مصرع گیر

شاعر نے اس صنعت کی طرف آخری شعر میں خود توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ اگر ممدوح آپ اپنا نام ان اشعار سے نکالنا چاہیں تو ہر مصرع کا پہلا حرف لے کر نام نکال لیجئے شریف عبد اللہ نکل آئے گا۔

حاجی صاحب کے فارسی کلام پر بسط و تفصیل سے تبصرہ کرنے کی اب چنداں ضرورت نہیں۔ مختصر مختصر طور پر ہم نے اس خصوص میں سب کہہ دیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمیں گلزارِ معرفت میں ہی ان کے فارسی اشعار کا کچھ حصہ دستیاب ہو سکا ہے جو ترانوں کے اشعار پر مشتمل ہے جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

خواہ کچھ بھی ہو حاجی صاحبِ دل، ولی کامل، صاحبِ کشف و کرامات اور اردو و فارسی کے شاعر تھے جن کے تذکرے سے ہم نے سب سے پہلے اپنی اس تصنیف کا آغاز کیا ہے اور حتی الامکان تحقیق میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور جس قدر حالات کو بیان کرنا مناسب سمجھا حسب ضرورت پیش کر دیا ہے، لہذا ہم ان کے ذکر خیر کو ختم کرنے سے پہلے اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ان کو شاعر ہی سمجھنا غلطی ہوگا، بلکہ جیسا کہ ان کے حالات سے معلوم ہوا وہ اولیائے کاملین میں سے ایک تھے، جنہوں نے اپنے فیض سے لاکھوں بندگانِ خدا کو روحانیت و ہدایت کا راستہ دکھایا اور اپنی تحریر و تقریر، نثر و نظم میں جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ

صرف خدائے کریم جل ذکرہ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا سامان فراہم کر کے **الْاِنَّ اَوَّلِيَّاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** کے زمرے میں اپنا نام لکھوایا۔

حاجی صاحب کی زندگی کا آغاز ہی بتا رہا تھا کہ وہ کچھ بن کر رہیں گے، چنانچہ شاہ نصیر الدین صاحب دہلوی سے جب بیعت کی تو اسی زمانے میں آپ کی روحانی حالت بلند یوں کی طرف جارہی تھی۔ روحانی مقامات میں بعض کا ملین کو دربار خداوندی سے براہ راست علم لدنی کی طرح روحانیت کا کمال حاصل ہو جاتا ہے، جس طرح حضرت خضر علیہ السلام کو تکوینیات اور احوال عالم باطنی کا علم موسیٰ علیہ السلام سے بھی زیادہ تھا، اگرچہ شریعت کے علوم میں موسیٰ علیہ السلام کی برابر کسی کا علم بھی نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی باہمی ملاقات، کشتی کا تختہ توڑ ڈالنا، ایک بچے کو ہلاک کر دینا، ٹیڑھی دیوار کو درست کر دینا ان سب واقعات میں موسیٰ علیہ السلام کا حیران ہونا اور تعجب سے بے صبر ہو کر خضر علیہ السلام سے حقیقت کا معلوم کرنا یہ وہ سب صاف صاف باتیں ہیں جو براہ راست اولیاء کے قلوب پر بارگاہ خداوندی سے ضوِ قلن ہوتی ہیں اور کبھی کسی کو کسی روحانی انسان کے ذریعہ روحانیت کی معراج پر پہنچایا جاتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب فرماتے ہیں:

”ظاہر میں اوّل میری بیعت طریقہ نقشبندیہ میں حضرت نصیر الدین صاحب دہلوی خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق صاحب سے ہوئی اور باطن میں بلا واسطہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بلند جگہ پر رونق افروز ہیں اور حضرت سید احمد صاحب شہید کا ہاتھ آپ کے دست مبارک میں ہے اور میں بھی اسی مکان میں بوجہ ادب دور کھڑا ہوں، حضرت سید صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دیدیا۔“ (کراماتِ امدادیہ ص: ۳۹)

بہر حال یہ خود حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ ان کو آنحضور صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے براہِ راست بھی بیعت تھی۔ اب یہ باتیں ہر کسی کے سمجھنے کی ہیں بھی اور نہیں بھی۔ جن پر کیفیات طاری ہوئی ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اولیاء اللہ کو سینہ بسینہ فیوض کا حاصل ہونا ایک صاف اور واضح سی بات ہے لیکن اس کا انکشاف عوام کو ہونا مشکل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق شیخ سعدی نے ایک کام کی بات کہہ کر بہت سی بحثوں کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ انہوں نے بوستان میں خوب فیصلہ فرمایا کہ۔

نہ ہر جائے مرکب تو اس تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن

حاجی صاحب کے معاملے میں بھی کہ ان پر ظاہری علوم کے خزانے کھول دیئے گئے تھے اعتقاد کر کے عقلی ہتھیاروں کو ڈال دینا چاہئے۔

جب حاجی صاحب شاہ نصیر الدین صاحب کی وفات کے بعد میانچی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے بیعت ہوئے جو لوہاری تھانہ بھون کے قریب ایک آبادی میں بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، تو میانچی صاحب کے کمال باطنی کے باعث حاجی صاحب کہیں سے کہیں جا پہنچے اور میانچی صاحب نے آپ کی اعلیٰ استعداد دیکھ کر آپ کو بندگانِ خدا کی رہنمائی اور بیعت لینے کی اجازت عطا فرمائی۔ چنانچہ ہزاروں تشنگانِ روحانیت نے آپ سے روحانی فیض حاصل کیا۔ ان کے روحانی کمال کو دیکھ کر میانچی صاحب نے کیا خوب بات فرمائی تھی کہ:

”ہم نے ایک ایسی ہندیا پکائی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہ پکی تھی۔“

اس جملے میں میانچی صاحب نے حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی پختگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس پکی ہوئی لذیذ ہانڈی میں سے بڑے بڑے علماء اور صوفیاء نے کھایا اور ہمیشہ کے لئے محو لذت ہو گئے۔



حاجی صاحب کی شاعری بھی ایک لذیذ کھانا ہے جو اس سے لذت لیتا ہے شاد کام ہوتا ہے۔ میرے استاد مولانا عبدالقیوم صاحب ارشق شیر کوٹی نے مجھ سے فرمایا کہ کسی نے حضرت حاجی صاحب کے اشعار اصلاح کے لئے دہلی کے مشہور شاعر مومن کو دکھائے تو بہت کچھ غور کرنے کے بعد کہا کہ اس کلام میں اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ جہاں کہیں زبان میں سقم ہے اس کی جگہ کوئی اور لفظ فصیح بھی اچھا نہیں لگتا۔

کاش حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذرہ درِ دل مجھے بھی نصیب ہو، اور کاش ان کے حالات کے اس سلسلے کے صدقے سے راقم الحروف کی بخشش کا بھی سامان ہو جائے۔

اب حاجی صاحب کے ذکر خیر سے حسب استطاعت عہدہ برآ ہو کر دورِ اوّل کے دوسرے بزرگ حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی طرف اپنے قلم کی باگ موڑتے ہیں اور ہر ایک بزرگ کے حالات اس طرح سے کتابت میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اگرچہ کتاب تو مشاہیر دیوبند کے نام سے ایک ہی ہے لیکن اس کے حصے مختلف ہیں، اور اگر کوئی صاحب چاہیں تو ہر ایک حصہ ایک مستقل تصنیف ہو سکتی ہے۔

والحمد لله والصلوة والسلام علی رسول الله۔



